این میری شمل: بحیثیت مستشرق

(انگریزی میں دستیاب تحریروں کی روشنی میں)

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی اردو (ریگولر)

سیشن (۲۰۱۱ء۔۲۰۱۶ء)

مقالہ نگار

سہیل ممتاز

محمد کامران

ریسرچ اسکالر پی ایچ۔ڈی (اردو)

نگران

پروفیسر ڈاکٹر

صدر شعبۂ

اردو

اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

اقرأ باسم ربك

انتساب

بے مثل استاد

ڈاکٹر سہیل احمد خان کے نام

تصدیق نامہ

میں تصدیق کرتا ہوں کہ سہیل ممتاز ولد ممتاز علی خان نے پی ایچ - ڈی (اردو) کی ڈگری کے لیے تحقیقی مقالہ بعنوان: ''این میری شمل: بحیثیت مستشرق (انگریزی میں دستیاب تحریروں کی روشنی میں)'' میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں مزید تصدیق کرتا ہوں کہ:

(الف) مذکورہ مقالے میں پیش کردہ حقائق و نتائج انفرادیت اور امتیاز کے حامل ہیں اور براہِ راست میری نگرانی میں اخذ کیے گئے ہیں۔

(ب) میں نے مقالہ نگار کی تحریر کا مطالعہ کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں بیان کیے گئے نکات تحقیقی صحت و معیار کے لحاظ سے لائق اعتنا ہیں۔

(ج) اس مقالے میں بروئے کار آنے والا تحقیقی مواد اور اس کے مصادر و منابع بہت اہم ہیں اور کسی ادارے میں ان کے حوالے سے کسی بھی ڈگری کے لیے تحقیقی کام نہیں ہو رہا ہے۔

(د) اس مقالے میں حقائق کی جمع آوری کے ساتھ ساتھ تحلیل و تجزیہ کا کام بھی عمدگی سے کیا گیا ہے۔ امیدوار کا اسلوب تحریر منجھا ہوا ہے اور اس میں کوئی قابلِ اعتراض مواد بھی نہیں ہے۔

(ہ) امیدوار نے یہ مقالہ میری نگرانی میں یونیورسٹی کے وضع کردہ طریق کار کے مطابق تیار کیا ہے۔

(و) مقالہ نگار نے زبان و ادب کے لحاظ سے مقالے کے معیار کو برقرار رکھا ہے۔

لہٰذا یہ مقالہ ہر اعتبار سے اس قابل ہے کہ اسے پنجاب یونیورسٹی میں مروّج طریق کار کے مطابق پی ایچ۔ڈی کی ڈگری کے حوالے سے جانچنے کے لیے پیش کیا جا سکے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران

نگرانِ مقالہ

تصدیق نامہ

میں نے پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران کی نگرانی میں ''این میری شمل: بحیثیت مستشرق (انگریزی میں دستیاب تحریروں کی روشنی میں)'' کے موضوع پر پی ایچ-ڈی کا مقالہ مکمل کرلیا ہے۔ میں نے اپنی اس تحقیقی کاوش کو نقل اور سرقے سے مکمل طور پر محفوظ رکھا ہے۔

العارض

سہیل ممتاز ولد ممتاز علی خان
ریسرچ اسکالر پی ایچ-ڈی اردو (ریگولر)

این میری شمل ۱۹۲۲ تا ۲۰۰۳

فہرست

عنوان

صفحہ

مُلخّص

ڈاکٹر آنیماری شمل جنھیں بیشتر این میری شمل لکھا اور پڑھا جاتا ہے، اردو دان طبقے کے لیے کسی تعارف کو محتاج نہیں اہلِ ذوق ان کی مقتدر کاوشوں سے بخوبی آگاہ ہیں تاہم راقم کے اس تفحص میں، بالاستعیاب، ایسے تمام فکری تلازمات موجود ہیں جن کی بابت گفتگو کرنا ضروری تھا اور اس ضمن میں خاص طور سے یہ خیال رکھا گیا ہے کہ بے مقصد اور لاحاصل مباحث سے گریز کیا جائے۔

موضوعِ مقالہ" این میری شمل: بحیثیت مستشرق (انگریزی میں دستیاب تحریروں کی روشنی میں) "کا بابِ اول،"استشراق ایک تعارف" میں راقم نے اختصار سے استشراق، اہم مستشرقین اور ان کے کارہائے نمایاں کو پیش کیا ہے۔ یوں انگریز، فرانسیسی اور جرمن مستشرقین کا ایک اجمالی تعارف اس باب کا حصہ ہے۔ بیشتر عہد ساز مستشرقین کا تعلق اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی سے ہے۔

باب دوم "آنیماری شمل۔ حیات و شخصیت" میں کرداری اوصاف کے ساتھ زندگی کے اہم واقعات ومیلانات کو مبحث کا حصہ بنایا ہے۔ شمل کی پیدائش، ان کی تربیت، تدریسی و تحقیقی فرائض، اساتذہ کرام، خاندان، شمل کی اسلام پسندی، تصوف سے وابستگی، ترکی اور مسلم ثقافت سے انسیت، ان کی اہم کتب اور لیکچرز، اُن کے اعزازت واختصاصات، غرض شمل کی اقبال شناسی اور پاکستان سے ان کی محبت کے مختلف پہلو مندرج ہیں۔ یوں یہ باب بڑی حد تک ان کی زندگی، فن اور شخصیت سے متعلق ہے۔

بابِ سوم براہِ راست شمل کی اردو سے وابستگی کا احاطہ کرتا ہے اور یہی ہمارے مقالے کا اہم ترین حصہ ہے۔ اس باب میں شمل کی اردو زبان وادب سے متعلق جملہ علمی کاوشوں کو جانچا گیا ہے جو کتب اور مضامین کی صورت، مختلف اوقات میں شائع ہوئے اور ان پر موجود نقد کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے؛ اور چونکہ یہ ہمارے مقالے کا فکری محور ہے اس لیے اسے کسی قدر صراحت سے بیان کرنے کی جستجو کی گئی ہے۔ یہاں زمانی ترتیب کا خاص طور سے خیال رکھا گیا ہے یعنی اردو ادب میں افراد و شخصیات کی تاریخی و قوعاتی ترتیب اور ادوار میں ایک ضبط ہے۔ یہی سبب ہے کہ سب سے پہلے شمل کے جس تفحص کو مبحث کا حصہ بنایا وہ زمانی اعتبار سے بھی مقدم ہے؛ یعنی PAIN AND GRACE –A Study of Two Mystical Writers of Eighteenth-Century Muslim India ہماری جانچ کا پہلا پڑاؤ ہے۔ یہ علمی و تحقیقی کاوش حضرت خواجہ میر دردؔ اور حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی حیات مقدسہ اور ان کے جملہ افکار کا خوبصورت بیانیہ ہے۔ راقم نے اس کا اردو ترجمہ "دردؔ اور شِکوہ" کے عنوان سے کیا ہے۔ اس کتاب کا معیار و مقام

اور اس میں موجود فکری مباحث ہمارے مقالے کا حصہ ہیں۔ کتاب پر موجود ملکی اور بین الاقوامی نقد بھی تسوید کا حصہ ہے؛ خصوصاً شمل کی دردؔ فہمی اس باب کا موضوع ہے۔

باب سوم کے حصہ دوم میں زمانی ترتیب ملحوظ رکھتے ہوئے شمل کی ایک اہم علمی کاوش A DANCE OF SPARKS- Imagery of Fire in Ghalib's Poetry کو تحقیق کے دائرہ میں لایا گیا ہے۔ شمل اس کتاب میں قاری کو کئی زاویوں سے متاثر کرتی ہیں اور پڑھنے والا ان کے بسیط مطالعہ سے مرعوب ہوتا ہے۔ یہاں بھی شمل کی غالبؔ فہمی مرکزِ نگاہ بنتی ہے اور جہاں ہم نے تاریخی اسناد کو پیش کیا وہیں غالبؔ کے مترجَم اشعار بھی پیشِ نظر رکھے۔ ناقدین کی آراء اور ان پر شائع ہونے والے مغربی اسکالرز کے مضامین بھی نقد و تحقیق کا حصہ ہیں۔

بابِ سوم کے حصہ سوم کا تعلق فکرِ اقبالؔ سے ہے جو شمل کے انتہائی محبوب موضوعات میں سے ایک ہے۔ راقم نے شمل کی معروف کتاب.GABRIEL'S WING: A Study into the religious Ideas of Sir Muhammad Iqbal اور چند دیگر اہم تحقیقی و تنقیدی مضامین اس حصہ کے لیے مختص کیے ہیں اور اس امر کا التزام بھی ہوا کہ وہی مضامین مبحث کا حصہ بنیں جو کسی نہ کسی حوالہ سے شمل کی تحریروں سے متعلق ہیں۔ اس حصہ میں فکرِ اقبالؔ کی قریباً تمام سمتیں سمٹتی ہیں اور یہ بھی صراحت بھی موجود ہے کہ فکری حوالہ سے شمل کن زاویوں اور حوالوں سے اقبالؔ تک پہنچیں اور اقبالؔ سے ان کی انسیت اور شیفتگی کے اسباب کیا ہیں؟ مزید براں اقبالؔ کی عصری حسیت، اخذ و استنباط کی مختلف صورتیں، فلسفہ، معیشت، الٰہیات اور سیاسی عوامل سے اثر پزیری ان سب کا احوال موجود ہے۔ تقابلی مطالعہ کو اہمیت دی گئی ہے اور شمل پر ہونے والا ابرا، بھلا نقد بھی پیش کیا گیا ہے۔ غرض اس باب میں اقبالؔ کی بابت شمل کے فہم کا درست تعین اور جملہ معلومات کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب سوم کے حصہ چہارم کا تعلق اردو زبان و ادب کی تاریخ سے ہے۔ ڈچ مستشرق جین گونڈا کا مرتّب کردہ سلسلہ کتاب (A HISTORY OF INDIAN LITERATURE) کی جلد ہشتم کا حصہ سوم بعنوان CLASSICAL URDU LITERATURE FROM THE BEGINNING TO IQBAL شمل کا تحریر کردہ ہے۔ یہ کتابی صورت میں تاریخِ ادبِ اردو کا اہم تنقیدی و تحقیقی مطالعہ ہے اور دکنیات اس کا وہ تخصیصی جز ہے جس پر مصنفہ کی دقتِ نظری قاری کو متاثر کرتی ہے۔ اردو زبان کے آغاز و آثار کی بابت اہم تحقیقی مباحث مختلف کتب میں موجود ہیں تاہم جو شے اس کتاب کو ممیز کرتی ہے وہ اِس کے مصادر و منابع ہیں جو نامور مستشرقین کے تفحصات کا حاصل ہیں۔ غرض شمل کی یہ تحقیقی کاوش کئی زاویوں سے منفرد معلومات کا احاطہ کرتی ہے اور اس سے جہاں ان کی علمی احتیاط کا پتہ ملتا ہے وہیں ان کی ادب فہمی، فکر و نظر کے مختلف در وا کرتی ہے۔

باب چہارم میں شمل کی اہم متفرق کتب کا اجمالاً تعارف اور جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ وہ کتب ہیں جو براہِ راست اردو زبان و ادب سے متعلق نہیں، چنانچہ ان کا جزوی تعارف اور اہم نکات پیش کرنے ہی کو مناسب خیال کیا گیا ہے۔ الٰہیات، تصوف، تہذیب و ثقافت، تاریخ اور فنونِ لطیفہ سے جڑی ان کتب کو موضوع اور اہمیت کے اعتبار سے جانچا گیا ہے اور اس کا مقصد شمل کی جملہ کاوشوں کو ایک مقام پر مترتب دکھانا ہے تاکہ پیش پا آئندہ محققین کے لیے شمل کی کتب کے موضوعات کے علاوہ اہم مندرجات بھی بہ سہولت دستیاب ہوں۔ یہاں اس امر کی صراحت ضروری ہے کہ شمل کی بیشتر کتب ان کے محاضرات کا حاصل ہیں جو انھوں نے وقتاً فوقتاً دنیا کی مختلف اہم جگہوں اور یونیورسٹیوں میں پیش کیے۔

مقالہ کا آخری باب، بابِ پنجم، اردو زبان و ادب سے متعلق شمل کے تفحصات کا حاصل ہے؛ غیر ضروری مباحث اور موضوعات سے اجتناب کرتے ہوئے صرف اردو سے متعلق ان کی جملہ کاوشوں کو پرکھنے کی کوشش کی ہے تاکہ بہتر طور پر شمل کی علمی حیثیت متعین ہو۔ یہ ہمارے تحقیقی نتائج کا حاصل ہے جس کا اختتام راقم نے ان الفاظ میں کرتے ہوئے اطمینان محسوس کیا کہ اُن کی یہ شدید خواہش رہی کہ مشرق اور بالخصوص اسلام کی بابت، اہلِ مغرب اپنا رویہ بہتر کرے۔ صدیوں کو محیط بغض و عناد اور مخاصمت میں کمی واقع ہو۔ اسلام کا جمالیاتی پہلو۔۔ ادب، متصوفانہ شاعری اور فنونِ لطیفہ کے وسیلہ سے نمایاں ہو اور اس علمی کاوش میں وہ ایک حد تک کامیاب نظر آتی ہیں۔ مشرق اور مغرب کے درمیاں یہ علمی ربط شمل نے ان تھک محنت سے پیدا کیا، اس پر وہ ستائش کی اہل ہیں۔

پیش گفتار

۱۴محرم الحرام، ۱۴۳۸ہجری (اکتوبر۱۶، ۲۰۱۶ء) بروز اتوار مقالہ لکھنے کا آغاز ہوا، اور اس سے قبل قریباً تین برس، راقم حصولِ مواد کے لیے مختلف کتب، رسائل اور فہارس کو بغور دیکھتا رہا۔ اس موضوع پر کام کرنے کا مقصد ایک ایسی کاوش کو سامنے لانا ہے جس کا فکری و تحقیقی بست قریباً ایک صدی کو محیط ہے یعنی ایک ایسی بدیسی جستجو جو بیسویں صدی کے بیشتر حصے کو سمیٹے ہوئے ہے اور جو براہِ راست مسلم الٰہیات، تصوف، تاریخ اور خاص طور سے پاکستانی ادب سے والہانہ شغف لیے ہوئے ہے۔

ڈاکٹر آنیماری شمل جنھیں بیشتر این میری شمل لکھا اور پڑھا جاتا ہے، اردو دان طبقے کے لیے کسی تعارف کو محتاج نہیں۔ اہلِ ذوق ان کی مقتدر کاوشوں سے بخوبی آگاہ ہیں تاہم راقم کے اس تفحص میں، بالاستعیاب، ایسے تمام فکری تلازمات مرقوم ہیں جن کی بابت گفتگو کرنا ضروری تھا اور اس ضمن میں یہ خیال رکھا گیا کہ بے مقصد اور لاحاصل مباحث سے گریز کیا جائے۔

موضوعِ مقالہ " این میری شمل: بحیثیت مستشرق (انگریزی میں دستیاب تحریروں کی روشنی میں) "کا بابِ اول، "استشراق ایک تعارف" میں راقم نے اختصار سے استشراق، اہم مستشرقین اور ان کے کارہائے نمایاں کو پیش کیا ہے۔ یوں برطانوی، فرانسیسی اور جرمن مستشرقین کا اجمالی تعارف باب کا حصہ ہے۔ بیشتر عہد ساز مستشرقین کا تعلق اٹھارہویں اور انیسویں صدی سے ہے۔

باب دوم " آنیماری شمل ۔ حیات و شخصیت " میں کرداری اوصاف کے ساتھ زندگی کے اہم واقعات و میلانات کو مبحث کا حصہ بنایا ہے۔ شمل کی پیدائش، ان کی تربیت، تدریسی و تحقیقی فرائض، اساتذہ کرام، خاندان، شمل کی اسلام پسندی، تصوف سے وابستگی، ترکی اور مسلم ثقافت سے انسیت، ان کی اہم کتب اور لیکچرز، اُن کے اعزازت و

اختصاصات، غرض شمل کی اقبال شناسی اور پاکستان سے ان کی محبت کے مختلف پہلو اس کا حصہ ہیں۔ یوں یہ باب بڑی حد تک ان کی زندگی، فن اور شخصیت سے متعلق ہے۔

بابِ سوم براہِ راست شمل کی اردو سے وابستگی کا احاطہ کرتا ہے اور یہی ہمارے مقالے کا اہم ترین حصہ ہے۔ اس باب میں شمل کی اردو زبان و ادب سے متعلق جملہ علمی کاوشوں کو جانچا گیا ہے، جو کتب اور مضامین کی صورت، مختلف اوقات میں شائع ہوئے اور ان پر موجود نقد کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے؛ اور چونکہ یہ ہمارے مقالے کا فکری محور ہے اس لیے اسے کسی قدر صراحت سے پیش کرنے کی جستجو کی گئی ہے۔ یہاں زمانی ترتیب کا خاص طور سے خیال رکھا گیا ہے یعنی اردو ادب میں افراد و شخصیات کی تاریخی و قوعاتی ترتیب اور ادوار میں ایک ضبط ہے۔ یہی سبب ہے کہ سب سے پہلے شمل کے جس تفحص کو مبحث کا حصہ بنایا وہ زمانی اعتبار سے بھی مقدم ہے؛ یعنی PAIN AND GRACE –A Study of Two Mystical Writers of Eighteenth-Century Muslim India ہماری جانچ کا پہلا پڑاؤ ہے۔ یہ علمی و تحقیقی کاوش حضرت خواجہ میر دردؒ اور حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی حیات مقدسہ اور ان کے جملہ افکار کا خوبصورت بیانیہ ہے۔ راقم نے اس کا اردو ترجمہ "درد اور شِکوہ" کے عنوان سے کیا ہے۔ اس کتاب کا معیار و مقام اور اس میں موجود فکری مباحث ہمارے مقالے کا حصہ ہیں۔ کتاب پر موجود ملکی اور بین الاقوامی نقد بھی راقم کے پیشِ نظر رہا؛ خصوصاً شمل کی درد فہمی اس باب کا موضوع ہے۔

باب سوم کے حصہ دوم میں زمانی ترتیب ملحوظ رکھتے ہوئے شمل کی ایک اہم علمی کاوش A DANCE OF SPARKS-Imagery of Fire in Ghalib's Poetry

کو جانچا گیا ہے۔ شمل اس کتاب میں کئی زاویوں سے متاثر کرتی ہیں اور پڑھنے والا ان کے بسیط مطالعہ سے بہر طور مرعوب ہوتا ہے۔ یہاں بھی شمل کی غالب فہمی مرکزِ نگاہ ہے اور جہاں ہم نے تاریخی اسناد کو پیش کیا وہیں

غالبؔ کے مترجَم اشعار بھی پیشِ نظر رکھے۔ ناقدین کی آراء اور ان پر شائع ہونے والے مغربی اسکالرز کے مضامین بھی نقد و تحقیق کا حصہ ہیں۔

بابِ سوم کے حصہ سوم کا تعلق فکرِ اقبالؔ سے ہے جو شمل کے محبوب موضوعات میں سے ایک ہے۔ راقم نے شمل کی معروف کتاب

GABRIEL'S WING: A Study into the religious Ideas of Sir Muhammad Iqbal. اور چند دیگر اہم تحقیقی و تنقیدی مضامین اس حصہ کے لیے مختص کیے ہیں اور اس امر کا التزام بھی ہے کہ وہی مضامین مبحث کا حصہ بنیں جو کسی نہ کسی حوالہ سے شمل کی تحریروں سے متعلق ہیں۔ اس حصہ میں فکرِ اقبالؔ کی قریباً تمام سمتیں سمٹتی ہیں اور یہ صراحت بھی ہے کہ فکری حوالہ سے شمل کن وسیلوں سے اقبالؔ تک پہنچیں اور اقبالؔ سے ان کی انسیت اور شیفتگی کے دیگر اسباب کیا ہیں؟ مزید براں اقبالؔ کی عصری حسیت، اخذ و استنباط کی مختلف صورتیں، فلسفہ، معیشت، الٰہیات اور سیاسی عوامل سے اثر پذیری ان سب کا احوال موجود ہے۔ تقابلی مطالعہ کو اہمیت دی گئی ہے اور شمل پر ہونے والا برا، بھلا نقد بھی پیش کیا گیا ہے۔ غرض اس باب میں اقبالؔ کی بابت شمل کے فہم کا درست تعین اور جملہ معلومات کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب سوم کے حصہ چہارم کا تعلق اردو زبان و ادب کی تاریخ سے ہے۔ ڈچ مستشرق جین گونڈا کا مرتّب کردہ کتابی سلسلہ HISTORY OF INDIAN LITERATURE کی جلد ہشتم کا حصہ سوم بعنوان

A CLASSICAL URDU LITERATURE FROM THE BEGINNING TO

IQBAL شمل کا تحریر کردہ ہے۔ یہ کتابی صورت میں تاریخِ ادبِ اردو کا اہم تنقیدی و تحقیقی مطالعہ ہے اور دکنیات اس کا وہ تخصیصی جز ہے جس پر مصنفِہ کی دقتِ نظری قاری کو متاثر کرتی ہے۔ اردو زبان کے آغاز و آثار کی بابت اہم تحقیقی مباحث مختلف کتب میں موجود ہیں تاہم جو شے اس کتاب کو ممیز کرتی ہے وہ اِس کے مصادر و منابع ہیں جو

نامور مستشرقین کے تفحصات کا حاصل ہیں۔ غرض شمل کی یہ تحقیقی کاوش کئی زاویوں سے منفرد معلومات کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور اس سے جہاں ان کے علمی تبحر کا احساس ہوتا ہے وہیں ان کی ادب فہمی، فکر و نظر کے مختلف در وا کرتی ہے۔

باب چہارم میں شمل کی اہم متفرق کتب کا اجمالاً تعارف اور جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ وہ کتب ہیں جو براہِ راست اردو زبان و ادب سے متعلق نہیں، چنانچہ ان کا جزوی تعارف اور اہم نکات پیش کرنا ہی مناسب خیال کیا۔ الٰہیات، تصوف، تہذیب و ثقافت، تاریخ اور فنونِ لطیفہ سے جڑی ان کتب کو موضوع اور اہمیت کے اعتبار سے جانچا گیا ہے اور اس کا مقصد شمل کی جملہ کاوشوں کو ایک مقام پر مرتب دکھانا ہے تاکہ پیش آیند محققین کے لیے شمل کی کتب کے موضوعات کے علاوہ اہم مندرجات بھی بہ سہولت دستیاب ہوں۔ یہاں اس امر کی صراحت ضروری ہے کہ شمل کی بیشتر کتب ان کے محاضرات کا حاصل ہیں جو انھوں نے وقتاً فوقتاً اہم اداروں اور یونیورسٹیوں میں پیش کیے۔

مقالہ کا آخری باب، بابِ پنجم، اردو زبان و ادب سے متعلق شمل کے تفحصات کا حاصل ہے؛ غیر ضروری مباحث سے اجتناب کرتے ہوئے صرف اردو سے متعلق ان کی جملہ کاوشوں کو پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ بہتر طور پر شمل کی علمی حیثیت متعین ہو۔ یہ ہمارے تحقیقی نتائج کا حاصل ہے جس کا اختتام راقم نے ان الفاظ میں کرتے ہوئے اطمینان محسوس کیا کہ اُن کی یہ شدید خواہش تھی کہ مشرق اور بالخصوص اسلام کی بابت، اہلِ مغرب اپنا رویہ بہتر کرے۔ صدیوں کو محیط بغض و عناد اور مخاصمت میں کمی واقع ہو۔ اسلام کا جمالیاتی پہلو۔۔ ادب، متصوفانہ شاعری اور فنونِ لطیفہ کے وسیلہ سے نمایاں ہو اور اس عملی کاوش میں وہ کسی قدر کامیاب نظر آتی ہیں۔ مشرق اور مغرب کے درمیاں یہ علمی ربط شمل نے ان تھک محنت سے پیدا کیا، اس پر بہر طور ستائش کی اہل ہیں۔

حصولِ مواد کے لیے راقم کو دانشگاہوں اور اِن سے جڑے کتاب خانوں کے ساتھ ساتھ خود مختار کتب خانوں میں متعدد بار جانا پڑا۔ استشراق اور شمل سے متعلق کتب اور فہارس کو قدرے تفصیل سے دیکھا، خود فہارس تیار کیں اور بہ اطمینان دیکھا کہ کون سی کتب کن کتاب خانوں میں موجود ہے؟ کن کتب سے کاملاً استفادہ کرنا ہے اور کن کو

سرسری دیکھنا ہے؟ کتاب خانوں کے علاوہ ایک دو جگہ ایسی بھی تھیں جہاں معلومات کے حصول کی خاطر جانا پڑا؛ جو کتاب خانے دیکھے گئے ان میں اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی اور اس کا مرکزی کتاب خانہ جو نیو کیمپس میں واقع ہے کو خاص طور سے استفادے کے لیے چنا۔ اس کے علاوہ اقبال اکیڈمی کا کتاب خانہ، شمل سے متعلق کتب اور جرائد و رسائل کے حوالہ سے بہترین جگہ ہے۔ شمل کی تحریر کردہ کتابیں اور مضامین کا لاہور میں سب سے بڑا ذخیرہ یہی کتاب خانہ ہے حالانکہ یہ ذمہ داری شمل ہاؤس کی تھی جو کبھی گوئٹے سینٹر تھا کہ یہ بار وہ اٹھاتا۔ وہاں شمل سے متعلق کتب یا مواد افسوسناک حد تک کم ہے۔ اقبال اکیڈمی کے بعد شمل کے حوالہ سے جو بہتر مواد کہیں موجود ہے تو وہ پنجاب یونیورسٹی، نیو کیمپس کا مرکزی کتاب خانہ ہے جہاں کتب بڑی حد تک سلیقہ اور ترتیب سے رکھی جاتی ہیں اور عملہ بہتر تعاون کرتا ہے۔ علاوہ ازیں قائدِاعظم اور پنجاب پبلک لائبریری، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، سینٹ لایولا ہال ریسرچ سینٹر (Saint Loyola Hall Research Center) اور دیال سنگھ کالج، لاہور کے کتاب خانوں سے استفادہ کیا۔ شمل سے متعلق بعض نایاب کتب ڈاکٹر اکرام چغتائی کی نشاندہی پر دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری میں دیکھی گئیں اور ان کے نوٹس لیے، غرض راقم نے حتی المقدور کوشش کی کہ شمل کی بابت انگریزی و اردو میں موجود مواد کو کم از کم لاہور کی حد تک ضرور تلاش کیا جائے اور پھر دیگر جدید ذرائع برتتے ہوئے انٹرنیٹ کے وسیلہ سے گڈریڈز (GOODREADS) اور دیگر بین الاقوامی آن لائن کتب خانوں کو بھی کھنگالا گیا تاہم راقم اس نتیجہ پر پہنچا کہ شمل سے متعلق کتب میں تواتر سے اضافہ ہو رہا ہے اور ان کی جرمن زبان میں لکھی کتب کو انگریزی کے قالب میں ڈھالنے کی جستجو جاری و ساری ہے۔ شمل پر لکھے گئے مضامین، مقالات اور کتب کا ایک شاندار ذخیرہ ڈیجیٹل لائبریری، جے اسٹور (JSTOR) پر دستیاب ہے اور اس ضمن میں گوگل سکالر (GOOGLE SCHOLAR) اور اقتباس حوالہ کے لیے ورلڈکیٹ (WORLDCAT) سے مستفید ہونے کا موقع بار بار ملا۔ اقتباس حوالہ اور کتابیات سازی (BIBLIOGRAPHY) کے لیے ایم۔ ایل۔ اے (MLA) کی اشاعت ہفتم کو پیشِ نظر رکھا۔ لائبریری عملہ میں جن افراد و شخصیات نے خاص طور سے معاونت کی ان میں پنجاب یونیورسٹی، نیو کیمپس کے مرکزی کتب خانہ کے ڈپٹی لائبریرین سید سلیم عباس زیدی کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں جن

کے سبب مجھے مذکورہ لائبریری میں اطمینان اور آسودگی سے کام کرنے کا موقع ملا اور ان کے وسیلہ سے ڈیجیٹل لائبریری، اینڈ نوٹ(END NOTE)اور کتب حوالہ کے لیے ورلڈ کیٹ ایسی ویب سائٹس سے متعارف ہوا۔ اس ضمن میں مذکورہ کتاب خانہ کے بیشتر ذمہ داران، جن کے نام فرداً فرداً لینا شاید ممکن نہ ہو، کا راقم ممنون و سپاس گزار ہے۔

الفاظ کے معانی اور تلفظ کی درست ادائیگی کے لیے آن لائن لغات ، دائرۃ المعارف اور دیگر اہم ویب سائٹس سے استفادے کی صورت اطمینان بخش رہی۔ ان میں جو لغات تواتر سے مصرف میں آئیں ان میں اردو لغت(Urdulughat.info)، اردو انگلش لغت(urduenglishdictionary.org)، آکسفورڈ لغات(en.oxforddictionaries.com)، کیمبرج، جرمن۔انگریزی لغت(dictionary.cambridge.org/dictionary/german-english)، ادائیگی تلفظ اور معنی کے لیے howtopronounce.com/german اور لیجنشی (en.langenscheidt.com/german-english)شامل ہے۔

مقالہ کی تیاری اور اس کی صورت گری کے لیے جن افرادو شخصیات سے ملنا ناگزیر ہوا اور جنھوں نے خوش دلی اور فراخی سے رہنمائی کی، ان میں پہلا نام ڈاکٹر اکرام چغتائی صاحب کا ہے۔ انھوں نے مقالہ کی ترتیب و تسوید کے لیے گرانقدر تجاویز دیں۔ اہم کتب کی نشاندہی اوران کی دستیابی کی بابت اپنی معلومات اور تجربات سے مستفید کیا۔ راقم ان کی مساعی کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور جب کبھی ان سے نشست ہوئی تو شمل کی بابت خود کو پہلے سے زیادہ باخبر پایا۔ میں ان کا انتہائی شکر گزار ہوں۔

دوسری اہم شخصیت جنھوں نے شمل کے بارے، متنوع فکری گوشوں کی نشاندہی کی وہ محترم سہیل عمر ہیں۔ ان کے وسیلہ سے اہم تحقیقی و تنقیدی مواد حاصل ہوا۔ انھوں نے اپنی وہ ای۔ میلز تک مجھے فراہم کیں جو ان کے اور برزین کے۔ واغمر کے مابین شمل کی بابت متبادل ہوئیں۔ وہ 'اقبال ریویو' کا ایک خصوصی نمبر شمل پر شائع کرنا چاہتے تھے

تاہم ایسا عملی طور پر نہ ہو سکا۔ اُس خصوصی شمارے کے لیے جمع کردہ مواد راقم کو دستیاب رہا؛ ضروری اور اہم تحاریر کا انتخاب ہوا اور پھر ان میں سے صرف متعلق مواد کو مقالہ کا حصہ بنایا۔ڈاکٹر صاحب کے وسیلہ ہی سے واغمر سے رابطہ ہوا اوراقبال آکیڈمی کے کتب خانہ سے مستفید ہونے کا جو بہتر موقع حاصل ہوا، اس کے لیے بھی راقم ان کا شکر گزار ہے۔

ڈاکٹر اکرام چغتائی اور برزین واغمر(BURZINE WAGHMAR)شمل کی جملہ کتب کی فہارس مرتب کر چکے ہیں جو اقبال آکیڈمی سے متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔ واغمر کا تعلق ہندوستان ہے اور یہ یونیورسٹی آف لندن، اسکول آف اورینٹل اور افریقن اسٹڈیز سے متعلق ہیں؛ یہ سینئر لائبریری اسسٹنٹ ہیں۔ شمل کے بارے میں بہت سے اہم مضامین، اخباری کالم، تراشے اور طبع زاد مقالات ان کی جانب سے مہیا ہوئے۔ شمل کی بابت جب کبھی کسی معاملہ پر اشکال پیدا ہوئے تو واغمر نے میری داد رسی کی اور درست معلومات فراہم کرنے میں مطلق تامل نہ کیا۔ شمل کی درست تاریخِ وفات کا معاملہ ہو یا پھر ان کی مناکحت کا، مستشرقین کا مشرف بہ اسلام ہونا ہو یا پھر شمل کے جملہ اعزازات و کمالات کا، ان سب امور میں واغمر کا بیان اور تصحیح لائقِ ستائش ہے۔ میں اس ضمن میں ان کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب نے شمل کی ایک اہم کتاب I Am Wind, You Are Fire: The Life and Work of Rumi. کو میرے لیے فوٹو کاپی کرایااور تحفتاً دی۔ یہ کتاب اب لاہور کے کسی بھی کتب خانہ میں موجود نہیں۔ اس کی ایک کاپی پنجاب پبلک لائبریری میں موجود تھی جو اب دستیاب نہیں۔ یہ کتاب بعنوان Rumi's World–The life and work of the Great Sufi Poet سنگِ میل پبلی کیشنز کی جانب سے شائع ہو چکی ہے۔ استشراق کے ضمن میں انھوں نے ایڈورڈ سعید کے ایک اہم مترجم مضمون کی جانب راقم کی توجہ مبذول کرائی۔ شمل کے جملہ فارسی و اردو شعری تراجم کی بابت ان کا ایک اہم مضمون مقالے کا حصہ ہے۔ ان کے تعاون کا راقم سپاس گزار ہے۔

محترمہ ناصرہ اقبالؔ سے شمل کی بابت ایک تفصیلی نشست ۲۲اپریل ۲۰۱۶ء گلبرگ میں واقع ان کی رہائش گاہ پر ہوئی۔ مجھے ڈاکٹر اکرام چغتائی اور سہیل عمر صاحب کی جانب سے یہ کہا گیا کہ ان کے ہاں شمل کی کتب کا اہم ذخیرہ موجود ہو گا اور ان کا یہ گمان اس شے پر تھا کہ شمل کی ہر نئی کتاب بطور تحفہ ڈاکٹر جاوید اقبالؔ کو ارسال ہوئی ہو گی یا شمل کا جب بھی پاکستان آنا ہوا تو یقیناً وہ اپنی تازہ کتب دست بدست ڈاکٹر صاحب کو پیش کرتی ہوں گی۔ شمل لاہور میں یوں بھی بیشتر ڈاکٹر صاحب کی رہائش گاہ پر ہی قیام کرتی تھیں۔ تاہم یہ گمان ہی تھا۔ محترمہ ناصرہ اقبالؔ نے اس ضمن میں اپنی لاعلمی کا اظہار کیا اور شمل کے بارے میں صرف اتنا کہا کہ وہ ایک مجذوب صوفی تھیں۔

مقالہ کی جزوی قرأت ڈاکٹر شوکت حیات صاحب نے کی۔ جو فارسی کے استاد اور انتہائی وضع دار، محبت کرنے والے انسان ہیں۔ انھوں نے خصوصی وقت نکال کر مقالے کا کچھ حصہ دیکھا اور بعض امور کی نشاندھی کی۔ میں ان کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

ادیب، صحافی عبد الستار اعوان اور ڈاکٹر خادم حسین رائے کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنھوں نے مقالہ کی قرأت میں معاونت کی اور بعض غلطیوں کو مترتب کرایا۔ اسی طرح فلسفہ کے استاد پروفیسر سعد ملوک صاحب نے بھی بعض اہم امور کی بابت توجہ مبذول کرائی۔ میں ان سب اصحابِ فکر و دانش کا احسان مند ہوں۔

آنیماری شمل ہاؤس، جرمن کلچرل سینٹر کی ڈائریکٹر نورین احمد ذکی صاحبہ کا بھی شکریہ ادا ہونا چاہیے جن کے وسیلہ سے میں جرمن جریدہ 'فکر و فن' کے ایڈیٹر اسٹیفن وائیڈنر سے متعارف ہوا اور شمل کے بارے میں اہم معلومات حاصل کیں۔

گورنمنٹ دیال سنگھ کالج، لاہور جہاں میں بہ حیثیت صدرِ شعبہ (اردو) اپنے تدریسی فرائض سر انجام دے رہا ہوں کے پرنسپل صاحبان یعنی ڈاکٹر طاہر یعقوب (ریٹائرڈ) اور محترم نعیم اکبر یٰسین (ریٹائرڈ) کا شکر گزار ہوں جن کی معاونتِ خاص سے یہ مقالہ مکمل ہوا۔ ان کی جانب سے جو آسودگی میسر ہوئی وہ بہتر کام کرنے کا سبب بنی۔ اس پر ان کا شکر گزار ہوں۔

محسن رضا میرے شاگرد ہیں اور اس وقت منہاج یونیورسٹی سے ایم۔فل (اردو) کر رہے ہیں، نے اس وقت میری معاونت کی جب میں مقالہ لکھتے ہوئے قریباً تھک چکا تھا ایسے میں، ایک مخلص شاگرد کی ہمنوائی کسی نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہ تھی۔ خدا، اس کے ہر امر میں آسانی پیدا فرمائے۔

آخر میں، میں مقالہ کے نگران ڈاکٹر محمد کامران صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنھوں نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ مجھے بر وقت کام مکمل کرنے کی صلاح دی۔ مجھ پر اعتماد کیا اور ایک طرح سے خود مختاری دی کہ جہاں اور جس فرد یا شخصیت سے شمل کے بارے میں معلومات حاصل ہوں، اسے لیا جائے اور وقت ضائع کرنے سے اجتناب برتا جائے۔ ان کے ایماء پر راقم نے ترکی میں خلیل طوقار اور جلال سوئیدان سے رابطہ کیا تاکہ شمل کی نجی زندگی کی بابت بہتر معلومات حاصل ہوں۔ میں ان کی دل دہی اور مسلسل ڈھارس بندھانے پر واقعتاً ممنون ہوں۔

راقم کو گھر پر جو ساز گار ماحول، مقالہ کی تسوید و ترتیب کے لیے ملا، اس کی بیشتر ذمہ دار، میری شریکِ حیات شمائلہ سہیل ہیں۔ ان نے اس تحقیقی جانکاہی میں مسلسل میرا ساتھ دیا اگرچہ بسا اوقات وہ مایوس بھی ہو جاتیں کہ شاید یہ کام ادھورا ہی رہ جائے تاہم اگر ان کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو اس کام کی تکمیل مجھ پر ارزاں نہ ہوتی۔ میں ان کی اس جہدِ مسلسل پر انھیں شاباش دیتا ہوں اور شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مقالہ کے آخر میں حوالہ جاتی کتب کی فہرست (BIBLIOGRAPHY) میں دو طرح کی کتب، جرائد و رسائل اور دائرۃ المعارف شامل ہیں۔ ایک وہ جن سے راقم براہِ راست مستفید ہوا اور دوسرے وہ جن کا اقتباس حوالہ، کسی نہ کسی سبب، مقالے کا حصہ نہ بن سکا البتہ ان کا مندرج کرنا اس لیے مناسب جانا کہ پیش آیند محققین ان سے بہرہ مند ہوں۔ یہ کتابیات مختلف ذرائع سے مرتب ہوئی اور یہ شمل سے متعلق بیشتر کتب کا احاطہ کرتی ہے۔

سہیل ممتاز

مقالہ نگار۔ پی ایچ ڈی (اردو)

۱۳ اپریل ۲۰۱۸ء

بابِ اوّل

استشراق ایک تعارف

لفظ 'استِشراق' استفِعال کے وزن پر ہے اور اس کا مادہ 'شرق' ہے جو مشرق، پورب کے معنیٰ میں مستعمل ہے اور انگریزی زبان میں اس کے لیے The East or Orient[۱] ایسے الفاظ، استعمال ہوتے ہیں۔ اسی طرح استشراق کے لیے 'Orientalism' اور مستشرق کے لیے 'Orientalist' ایسے الفاظ مروج ہیں۔ لفظ 'شرق' کا اطلاق اور اس کی جغرافیائی تفہیم کی بابت ذیل کی دو آراء اہم ہیں:

> " قرونِ وسطیٰ بلکہ از منہ قدیمہ میں بحیرہ روم کو دنیا کا مرکز قرار دیا جاتا تھا اور جہتوں کا تعین اسی کے حساب سے ہوتا تھا۔ اس کے مشرقی اطراف میں واقع علاقوں کو مشرق اور اس کے مغرب میں واقع علاقوں کو مغرب سے تعبیر کیا جاتا تھا"۔[۲]

> "The term 'ORIENT' has been used in western culture discourses to designate the area east of the Mediterranean, including the near East, Middle East, and Central and 3"South Asia.

تحریکِ استشراق کا آغاز مغرب سے ہوا، اور ظاہر ہے کہ اس کا تحقیقی اور مطالعاتی مرکز و محور مشرق تھا۔ اس تحریک کے آغاز، اہداف اور مبسوط لائحہ عمل پر بات کرنے سے قبل لفظ استشراق اور مستشرق کی صراحت میں چند لائقِ ذکر افہام پیشِ نظر رہنے چاہیں:

"Anyone who teaches, writes about, or researches the Orient—and this applies whether the person is an anthropologist, sociologist, historian, or philologist—either in its specific or its general aspects, is an Orientalist, and what he or she does is Orientalism."4

اسی نوع کی ایک اور رائے:

"مشرقی زبانوں، آداب اور علوم کے عالم کو مستشرق کہا جاتا ہے اور اس علم کا نام استشراق ہے۔"۵

استشراق کی بابت ایک سے زائد بیانیے(NARRATIONS) موجود ہیں، جو اس کی مختلف جہتوں کو سامنے لاتے ہیں۔ مثلاً ایک بیانیہ اس مکمل ضابطے ہی کو تشکیک اور منفی عزائم کا حامل قرار دیتا ہے کہ اس تحریک کی اساس ہی میں اسلام دشمنی، بانیؐ اسلام سے عداوت اور مشرق پر تفوق کا جوہر موجود ہے۔ اس ضمن میں محققین کے ہاں اسناد کا نامختتم ذخیرہ موجود ہے؛ جبکہ دوسرا بیانیہ سراسر اس کے برعکس ہے اور وہ یہ کہ تحریکِ استشراق خالصتاً ایک علمی اور فکری کاوش ہے اور خاور شناسی کا مقصد و ہدف، دانائی کا حصول اور اس کا عملی ابلاغ ہے؛ اور یہ کہ غیر ضروری اور تعصب کی بنیاد پر، اس برتر تحقیقی جستجو کو کم مایہ ثابت کیا گیا ہے۔

راقم کا تحقیقی مطالعہ اول نوع کے بیانیہ سے ، ایک حد تک قربت لیے ہوئے ہے تاہم اس فرق کے ساتھ کہ کچھ افراد و شخصیات ایسی رہی ہیں جن کے علمی خلوص کی بابت کوئی دو رائے نہیں اور ان لوگوں نے واقعتاً حصولِ علم اور انسانی خدمت کی غرض کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی زندگیوں کے بہترین ایام، خاور شناسی میں صرف کیے۔ تاجِ برطانیہ، فرانس، پرتگال، ہالینڈ اور روس کے لیے مشرق (وسط ایشیا سے مشرقِ وسطیٰ اور جنوبی ایشیا تک) سلطنت کی وسعت یا کاروباری منڈی کے لیے ایک جہانِ نوع کی حیثیت رکھتا تھا لیکن المانیوں کے لیے مشرق کا وجود، خوابیدہ رومان اور دانائی کا مرکز رہا۔ یہی سبب ہے کہ گوئٹے سے آنیماری شمل تک المانوی مستشرقین کا طرزِ احساس دیگر مغربی ممالک کے برعکس انسیت اور شیفتگی کا رنگ لیے ہوئے ہے، اور جسے بعض ناقدین نے خوب آڑے ہاتھوں لیا۔

مشرق، از منہ قدیم ہی سے، مغرب کے لیے اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی پر اسرایت، دیو مالا، مذاہب، تہذیب و ثقافت، زبانیں، ادب اور مصالحہ جات سے ریشم تک مختلف النوع اشیاء و مظاہر، اہلِ مغرب کے لیے دلچسپی کے منہاج رہے۔ مشرق کی بابت تحیر اور سرّیت کا پس منظر ہمیشہ سے موجود رہا، اور اسے رومانی انداز پر دیکھنے کا معاملہ آج بھی شگفتہ و تروتازہ ہے؛ تاہم اس کے ساتھ ساتھ مشرق کو نسلی اور فکری اعتبار سے کم مایہ سمجھا گیا۔ یعنی ایک جانب تو مشرق ان کے لیے بھرپور کشش کا حامل منطقہ ہے اور دوسری جانب مشرق کو بہ نگاہِ حقارت بھی دیکھا جارہاہے۔ کشش کا تعلق سرّیت، ادیان، لسان، تجارت اور منڈی وغیرہ سے جڑاہوا ہے اور احقر جاننے کا معاملہ نسلی، مذہبی اور فکری برتری سے گتھا ہوا ہے:

" مغرب کے احساسِ برتری کے عناصر میں ایک عنصر مذہبی برتری کا بھی تھا۔ سلطنتِ روما کے خاتمے کے بعد نشاۃِ ثانیہ تک مغرب کی اہم ترین قدر ان کا مذہب ہی تھا۔ اس دور میں پورا مغرب چرچ کی گرفت میں تھا"[٦]

اور بات صرف نشاۃِ ثانیہ تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ ہندوستان کی انیسویں صدی اس امر کی شاہد ہے کہ مذہبی انتہا پسندی جسے مغرب عہدِ مظلمہ (DARK AGES) کا سب سے بڑا جوہر جانتا تھا، ایسٹ انڈیا کمپنی اور دیگر نو آبادیات طالع آزماؤں کا ایک ایسا افادی رویہ تھا جس کو برتنا وہ ضروری سمجھتے تھے۔ یہ ایک نوع کا اہم، نو آبادیاتی جواز تھا کہ آخر دور افتادہ، پسماندہ اور غیر منظم لوگوں پر حکومت، کیوں اور کس سبب کی جائے؟ اور وہ بھی دھونس جماتے ہوئے ان کے منشاء و رضا کے بغیر؛ اور اگر ہم اس جانچ میں مزید پیچھے جائیں تو اس کی فکری رویّے کی پشت پر بازنطینی شہنشاہت (مشرقی رومن ایمپائر) کھڑی نظر آتی ہے جو مغرب میں زوال پذیر ہونے پر، مشرق میں قریباً ایک ہزار برس، بر سرِ اقتدار رہ کر، عثمانی خلافت کے ہاتھوں شکست کھاتی ہے لیکن اس کے آدرش، ریاستی امور کے ضابطے، اہلِ مغرب کے لیے مسلمہ اصول بن جاتے ہیں اور وہ اس شہنشاہت کے خاتمے کے بعد بھی فروغِ دین کے لیے متحرک رہتے ہیں؛ یعنی وہ الوہی مقصد جو بازنطینی ریاست کو فعال اور قائم رکھنے کا ایک اہم جواز فراہم کرتا تھا وہ کسی نہ کسی

صورت نشاۃِ ثانیہ کے عہد انسانیت(HUMANISM) میں بھی فعال رہا اور سلطنتِ روما، تاجِ برطانیہ کی صورت، دوسری جنگِ عظیم تک، مکمل طمطراق سے قائم دائم رہی:

"شروع شروع میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت مشنریوں کو ایک نیوسنس سمجھتی تھی۔ سیرام پور میں بپٹسٹ مشن کی طرف سے شائع ہونے والا انتہائی دلآزار لٹریچر پہلے فورٹ ولیم میں سنسر کیا جاتا تھا کہ ابھی ہندوستان میں مسیحی مشن کو یونین جیک کی سرپرستی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ لارڈ منٹو نے سیرام پور کے لٹریچر کے متعلق کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کو مطلع کیا کہ یہ ہندوؤں کے لیے بے حد اشتعال انگیز ثابت ہو رہا ہے۔ اس کے جواب میں سیرام کے مشہور مشنری ڈاکٹر مارش مین نے لکھا تھا کہ ہندوستانی انتہائی کمزور اور احمق کردار کا مالک ہے اور اس کمزوری کی وجہ سے ہمیشہ کسی نہ کسی غیر قوم کا محکوم رہے گا اور اس کے بودے پن کو عیسائیت بھی دور نہیں کر سکتی۔ لیکن برطانیہ کے زیرِ سایہ زندہ رہنا اس کے لیے برکتِ الٰہی کا موجب ہے۔ اس وجہ سے جو ہندو یا محمڈن عیسائی ہو جائے وہ اپنے تحفظ کی خاطر برطانیہ کا انتہائی وفادار ثابت ہو گا۔ کیونکہ محض اس ایمپائر کی سلامتی اور توسیع پر اس کے وجود کا انحصار ہے"۔[7]

افسانہ 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' میں منٹو نے کمال مہارت سے 'ہاف کاسٹ' کا تذبذب ذہنی شفاخانہ میں کچھ اس طرح سے دکھایا (یہ تقسیمِ ہند کے وقت انتہائی حراساں تھے) کہ انگریز سرکار کے چلے جانے کے بعد، اُن سے کس نوع کا برتاؤ ہو گا؟ انھیں بریڈ کھانے کو ملے گی یا پھر 'بلڈی چپاتی' پر ہی گزارہ کرنا پڑے گا؟ صرف ایک فقرے سے مکمل سماجی رویہ سامنے آجاتا ہے۔

بازنطینی ریاست کا تعلق عہد مظلمہ (DARK AGES)سے تھا جس کا عرصہ حیات عموماً پانچویں صدی سے پندرھویں صدی عیسوی تک شمار کیا جاتا ہے اور جس کی اساس، سخت گیر مذہبی عقائد پر تھی لیکن عہد انسانیت میں اس کا اِحیاء سلطنت کی توسیع سے فروغ پا رہا تھا؛ یعنی اقوامِ مشرق کی تہذیبی و معاشرتی اصلاح کے ساتھ ساتھ ان کے عقائد کی درستی کا ذمہ بھی نو آبادکاروں نے اپنے تئیں اٹھالیا۔ اردو ادب کے ایک اہم محسن 'گل کرسٹ' کی بابت ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا یہ کہنا توجہ کا حامل ہے:

" ۱۸۰۴ء میں ہندوستانی شعبے کے لیے گل کرسٹ نے مباحثہ کا جو عنوان تجویز کیا تھا وہ متنازعہ فیہ قرار پایا۔ عنوان یہ تھا 'اگر ہندوستانی باشندے عیسائی اصولوں کا مقابلہ اپنی مذہبی کتابوں سے کریں تو وہ عیسائیت قبول کر لیں گے 'اس موضوع سے کلکتہ کے مسلمان حلقوں میں شدید احتجاج پیدا ہوا۔ اس احتجاج کو دیکھ کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے برطانوی حلقوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ موضوع سرکاری حکمتِ عملی کے مطابق نہیں ہے، لہٰذا انھوں نے اس کے خلاف عرضداشت بھجوائی۔ ولزلی کو اس موضوع میں کوئی پریشان کن مسئلہ نظر نہیں آیا مگر کلکتہ کے مقامی حلقوں کے احتجاج کو دیکھ کر اُس نے اِس موضوع کو بدلنے کا حکم صادر کر دیا۔ گل کرسٹ نے اس حکم کو اپنے شعبہ میں مداخلت قرار دیا اور اس غم و غصہ کی حالت میں اس نے ہندوستان چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا"۸

اس مذہبی تفاخر کے پسِ پردہ وہ جملہ عقائد و نظریات تھے جو اہلِ مغرب کے ہاں صدیوں پروان چڑھتے رہے۔ ان کے نزدیک اسلام غیر ضروری طور پر دینِ عیسوی کی اشاعت میں سدِ راہ ہوا۔ اس سے عیسائی تبلیغ متاثر ہوئی۔ اسلام جن مغربی علاقوں تک پھیل چکا تھا اُس سے اِن کی تہذیبی معاشرت کو بہت زک پہنچی۔ عہدِ وسطیٰ کے لوگ خاص طور سے اس بابت متفکر و مضطرب تھے۔ ان کا الوہی مقصد تشنہ رہ گیا۔ ان کے نزدیک عیسائیت کے بعد اقوامِ عالم کو اب مزید کسی دین کی ضرورت نہ تھی اور یوں بھی وہ اسلام کو یہودی اور عیسائی عقائد کا چربہ سمجھتے تھے۔ صلیبی جنگیں ہوں یا سقوطِ قسطنطنیہ یا پھر اسپین، سسلی اور یوگوسلاویہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو، غرض مغرب کا مسلمانوں، ان کے عقائد و نظریات اور نبی اکرمؐ کی بابت معاندانہ رویہ، شدت سے عہد بہ عہد فروغ پاتا رہا۔ دانتے کی ڈیوائن کامیڈی سے اشپرنگر کی سیرتِ نبویؐ تک اس غیر معتدل اندازِ فکر کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کے ہاتھوں مفتوح ہونے کا قلق اور اس پر مستزاد تہذیبی اور اقتصادی شکستگی نے اسلام کی بابت نفرت پر مبنی نظریات قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اسلام اور داعی اسلام حضرت محمدؐ کے حوالہ سے منصف اور معتدل تصور ناپید رہا:

"From the End of the seventh century until the battle of Lepanto in 1571, Islam is its Arab, Ottoman, or North African and Spanish form dominated

or effectively threatened European Christianity. That Islam outstripped and outshone Rome cannot have been absent from the mind of any European past and presen."9

اس تصادم کے نتیجہ میں مشرق اور مغرب کے مابین فکری بُعد اور نفرت کی ایک بڑی خلیج حائل ہو چکی تھی۔ صلیبی جنگوں پر جانے والے بہادر جنگ جو(KNIGHTS) مجاہد کہلائے اور ان کے مقابل آنے والے مسلمان، کافر(INFIDELS) سمجھے گئے، اور کم و بیش یہی عقیدہ، صلیبیوں کی بابت مسلمانوں کا تھا۔ دونوں ابراہیمی مذاہب کے ماننے والے شہادت کی صورت میں، جنت میں جانے کے خواہاں تھے۔ اذہان پر ان جنگوں کا اثر، آج بھی، اہلِ مغرب کے ہاں، خاص طور سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ۱۱/۹ کے بعد امریکی صدر کا رویہ یا بوسنیا میں مسلمانوں کے قتلِ عام کے بعد سرب جنرل کا میڈیا کے سامنے آن کر، برملا مسلمانوں کی بابت نفرت پر مبنی گفتگو کرنا، غرض ان سب کے ڈانڈے ماضی کے ان واقعات سے جڑتے ہیں جو کبھی اسلام اور عیسائیت کی مخاصمت کی صورت میں یاد رکھے گئے ہیں۔

ایڈورڈ سعید مشرق کی بابت تحقیر آمیز رویے کی کھوج میں اسلام اور عیسائیت سے قبل کے ادوار کو سامنے لاتے ہیں اور ایسی اسناد فراہم کرتے ہیں جس سے اہلِ مغرب کا تفاخر نمایاں ہوتا ہے:

"Aeschylus portrays the sense of disaster overcoming the Persians when they learn that

Their armies, led by King Xerxes, have been destroyed by the Greeks. The chorus sings

The following ode:

Now all Asia's land Moans in emptiness. Xerxes led

forth, oh oh! Xerxes destroyed, woe woe!

Xerxes' plans have all miscarried."۱۰

یہاں یہ صراحت ضروری ہے کہ مغرب تہذیبی و فکری حوالوں سے ہمیشہ اہلِ یونان کا احسان مند رہا اور ریاستی امور میں رومن طرزِ حکومت کو پیشِ نظر رکھا۔ قدیم یونانی معاشرت اور دانائی ان کے نزدیک ایک مشترک مغربی ورثہ ہے جس کے ہوتے ہوئے کسی اور تہذیب کی طرف دیکھنا ان کے شایانِ شان نہیں۔ فلسفہ، نفسیات اور دیگر متداول علوم میں قدیم یونانی(HELLENIC)اوتار، واقعات اور اساطیری قصوں کی بھرمار ہے۔ یہاں تک جدید نفسیات میں ہمیں یونانی دیومالا اور کرداروں کا ذکر بہ کثرت ملتا ہے۔ احساسِ برتری کا یہ ثقافتی احساس بڑھ کر نسلی افتخار کو جا پہنچا ہے؛ اور اہلِ مشرق کو بہ حقارت دیکھنے کا ایک جواز فراہم کرتا ہے۔ غرض یہ ایک طرزِ احساس ہے جو مختلف صورتوں میں وقوع پذیر رہا اور تاریخی اعتبار سے حقائق کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی:

"the Middle East does not attract scholarly attention because of its intrinsic weaknesses- we have an almost exact duplication of a canonical Orientalist opinion that the Semites never produced a great culture and that, as Renan frequently said, the Semitic world was too impoverished ever to attract universal attention."11

صلیبی جنگوں کے بعد بالعموم اور سقوطِ قسطنطنیہ کے بعد بالخصوص اہلِ مغرب اس حقیقت سے بہرہ مند ہو چکے تھے کہ ان سے مزاحم اسلام، تلوار کی طاقت سے زیرنگیں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے انھیں کچھ اور وسائل بروئے کار لانا ہوں گے اور اس ضمن میں اول، اسلام کا دقیق مطالعہ اور پھر اس میں موجود ان پہلوؤں پر نگاہ جمانا تھا جس سے اس مذہب کے ماننے والوں میں افتراق و انتشار کے اسباب پیدا ہوں۔ اس بابت اسلامی تاریخ، سیرت، فقہ، حدیث اور خاص طور سے قرآنِ حکیم کو منتخب کیا گیا۔ ان کے پیشِ نظر، اسلامی علوم میں مہارت کا مقصد اپنے مخالف کی

جمعیت اور قوت کو کمزور کرنا تھا۔ وہ اسلام اور سلطنتِ عثمانیہ کو اپنا حریف جان رہے تھے۔ متن کی اہمیت سے بخوبی آگاہ تھے، اور اس کی برتر عملی افادیت سے، مستفید ہونے کا ارادہ باندھ چکے تھے؛ اور یہ سب ایک باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت وقوع پذیر ہونے لگا:

"But the Crusades had a chastening influence on Christendom. Instead of attempting to regain former Christian territory by force of arms, instead of fighting the 'Saracen', a new approach had gradually been gaining recognition. Thus Francis of Assisi sought, through missionary persuasion, to evangelize the 'infidels', and Raymond Lull, with similar motives in mind, was instrumental in the introduction of the teaching of Arabic in Christian institutions of higher learning. But the aim was still largely destructive, hostile: to know more about Islam so as to be better equipped to expose its 'defects'. Indeed, Peter the Venerable, who encouraged the first Latin translation of the Qur'an, was himself the author of a vehement polemic against Islam."12

مستشرق، اسے کہا جارہا تھا جو اسلام اور عربی زبان و ادب کے کسی ایک پہلو پر تحقیقی گرفت رکھتا ہو اور مشرق، مسلم ریاست کے جغرافیے کی صورت، مشخص ہونے لگا۔ استشراق کے آغاز کی بابت ایڈورڈ سعید اور اس کے اہداف کے بارے میں ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی کی آراء بالترتیب لائقِ توجہ ہیں:

"In the Christian West, Orientalism considered to have commenced its formal existence with a decision of the Church Council of Vienne in 1312 to establish a series of chairs in "Arabic, Greek, Hebrew, and Syriac at Paris, Oxford, Bologna, Avignon, and Salamanca."13

"مستشرقین کا وجود کوئی اتفاقی امر نہیں تھا۔ وہ ایک ایسے معاشرے کے ذمہ دار اصحابِ فکر تھے جو صدیوں سے عالمِ اسلام کے ساتھ حالتِ جنگ میں مبتلا تھا اور عالمِ اسلام کو ہر قیمت پر نابود یا کم از کم مغلوب کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔ جس نے اپنی کمزوریوں کی تشخیص کر لی تھی اور جسے دشمن کی برتری کے راز معلوم ہو چکے تھے۔۔۔۔۔علومِ شرقیہ کا مطالعہ اسی جنگی منصوبے کا ایک اہم حصہ تھا۔ مستشرقین اس منصوبے کے اہم کارکن تھے۔ وہ روحانی حروف صلیبیہ کے ہر اول دستے تھے۔ جن کا فرض یہ تھا کہ وہ دشمن کے خزانوں سے اپنے ملک کو مالا مال کریں اور ان کمزور مقامات کو دریافت کریں، جہاں سے دشمن پر حملہ آور ہوا جا سکے۔"۱۴

خاور شناسی کا یہ سلسلہ کئی صدیوں کو محیط رہا۔ اب نبرد آزمائی کے لیے کوئی عسکری میدان نہ تھا بلکہ فکر و عمل کا اک جدا راستہ اختیار کیا گیا جس کا مطمحِ نظر، واضح طور پر اسلام کی شکست وریخت سے مشروط تھا۔ ایک بھرپور اور مستعد کاوش کا آغاز ہوا، اور اسلام کے ان فکری گوشوں کو باریک بینی سے دیکھنے کا بیڑا اٹھایا گیا جس کا مقصد مذہب اور اس کے پیروکاروں کے درمیان مناشقات اور روحانی خلیج پیدا کرنا تھا۔ عقیدے کی کمر توڑنے کے لیے داعئ اسلام کی تواتر سے کردار کشی کی گئی ۔ معروضی طور پر یہ دکھانے کی کوشش ہوئی کہ اسلام اور فطری تقاضوں میں ایک نوع کا بُعد ہے، اور اسلام کا جو ادّعا ہے کہ وہ دینِ فطرت پر قائم ہے، سراسر غلط اور حقیقت کے منافی ہے۔ اسلامی متن کا مطالعہ اُن زاویوں سے کیا گیا جس سے اِس دین کی کجی سامنے لائی جا سکے۔ پندرھویں صدی کے ابتدائی عشروں میں سالامانکا (SALAMANCA) یونیورسٹی میں الٰہیات کے پروفیسر جان آف سیگوویہ اور جرمن فلاسفر، ماہرِ الٰہیات نکولس آف کیوسہ (NICHOLAS OF CUSA) کس نوع کی کارگزاریوں میں منہمک تھے اس کی ایک جھلک کچھ یوں ہے:

"جان آف سیگویہ قرآن کے دقیق مطالعہ کے بعد اس میں خامیاں دریافت کر کے (مسلمانوں پر) یہ ثابت کرنے کا داعی تھا کہ یہ کلامِ ربانی نہیں ہے۔ وہ ہتھیاروں کے بجائے دلائل و براہین کے ذریعے اسلام کو شکست دینے کا حامی تھا۔ نکولاس آف کیوسہ اختلافی مسائل سمیٹ کر مجتمع کرنا چاہتا تھا اور اختلافی وجوہات ختم کر کے مسلمانوں کو دائرہ عیسائیت میں داخل کرنے کا متمنی تھا"۔۱۵

اسی بیانیے میں ایک اور اہم رائے:

"اسلام کے بارے میں روایتی تحقیر ایک غیر معتدل فرقہ پرستی کی شکل میں ان کے مطالعات میں سرایت کرنے لگی۔ یورپ اور عالمِ اسلام کے درمیان صلیبی جنگوں نے جو خلیج پیدا کر دی تھی اس کو پاٹا نہیں جا سکتا۔ پھر اسلام سے نفرت یورپی فکر کا حصہ بن گئی۔ دراصل ابتدائی مستشرقین دورہائے جدید میں وہ مسیحی مبلغین تھے جنھوں نے عالمِ اسلام میں مشنری سرگرمیوں کو فروغ دیا۔۔۔۔۔استشراق اگرچہ بعد میں مشنری نفوذ سے آزاد ہو گیا"۔۱۶

یعنی تحریکِ استشراق مذہبی اور سیاسی تعصبات سے فروغ پاتی رہی، اور یہ فکری تسلسل انیسویں صدی تک کسی نہ کسی صورت موجود رہا، تاہم اس فرق کے ساتھ کہ نشاۃِ ثانیہ کے بعد جب مغرب ریاستیں یکے بعد دیگرے پاپائیت کے دائرہ اختیار سے باہر نکل کر قومیت کی بنیاد پر معاشرت کی تشکیل میں منہمک ہوئیں تو ایسے میں استشراق کا استعمال مغربی ریاستوں اور اس کے باشندوں کی بہبود کے لیے ہونے لگا۔ اسلام اب مغرب کے لیے کوئی بڑا خطرہ نہ تھا۔ سلطنتِ عثمانیہ کا دم خم نکل چکا تھا اور مغرب، سائنسی علوم کے بہت سے اہم مراحل طے کر چکا تھا۔ سیاسی معیشت اب اقوامِ مغرب کا نصب العین تھی۔ وہ عیسائیت اور اس کے فروغ کی بابت ایک حد تک جا سکتے تھے۔ مذہب کی جگہ وطن پرستی اور قوم پرستی فروغ پانے لگی۔ مغرب میں نشاۃِ ثانیہ کے تین مراحل طے ہو رہے تھے۔ ابتدائی، اعلیٰ وارفع اور اخروی نشاۃِ ثانیہ کے باطن سے ریاست کی توسیع کے سوتے پھوٹنے لگے۔ مغرب بااعتماد تھا۔ وہ مسلم افکار، معاشرت، عقائد و نظریات غرض ہر سمت میں ٹوہ لگا چکا تھا۔ اب اسلامی مشرق سے انھیں کوئی خطرہ نہ تھا۔ اور یہ کیسا اتفاق ہے کہ ایک ہی دور میں برطانیہ، فرانس، پرتگال، ڈچ، ڈینش اور نارویجین ایسٹ انڈیا کمپنیاں وجود میں آتی ہیں اور وہ کمال سرعت سے سترھویں صدی کے آغاز میں ہندوستان کے ساحلوں پر لنگر انداز ہوتی ہیں اور ان کے ہاتھوں مقامی بندرگاہیں اور علاقے بتدریج مفتوح ہونے لگتے ہیں، یعنی معاشی فراخی کے لیے سیاسی تسلط قائم کرنا ناگزیر تھا۔ اب مذہب خود مغرب کے لیے کوئی بڑا آدرش نہ رہا تھا۔ اصل اہمیت اور حیثیت سرمائے کو حاصل ہو چکی تھی۔ مذہب ثانوی حیثیت میں، فروغ پاتا رہا۔ تجار کی صورت، ساحلوں پر لنگر انداز ہونے والے، اپنے سرمائے کے تحفظ

کی خاطر، اسلحہ سے لیس ہونے لگے۔ کبھی آپس میں لڑتے بھڑتے تھے اور کبھی اوروں کو لڑتا دیکھ کر تماشا کرتے تھے۔ درحقیقت یہ قدیم رومن مقولے DIVIDE AND RULE کو عملی طور پر برت رہے تھے۔ حالات خاص طور سے برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی موافقت میں تبدیل ہو رہے تھے۔ ۱۷۰۷ء یعنی اورنگزیب کی وفات کے بعد سلطنت کمزور پڑنے لگی اور بدقسمتی سے خطے کے لوگوں کی اکثریت جدید علوم سے ناآشنا تھی۔ یہاں ہندوستان میں بادشاہت اور تمن داری کے سبب لوگوں کا طرزِ رہن سہن ایک سا رہا جبکہ مغرب میں صنعتی انقلاب نمو پانے لگا۔ یہاں کے باشندے جو پہلے ہی مطلق العنان حکومتوں کے آگے مزاحم نہ ہوتے تھے، انھیں باقاعدہ منصوبے کے تحت نوآبادیات کا حصہ بنانا، دشوار نہ تھا۔ استشراق اس ضمن میں اب ایک اور طور سے مغرب کے توسیع پسندانہ عزائم کی تکمیل میں جٹ گیا اور افریقہ سے ایشیا تک کے وہ علاقے نوآبادیات کا حصہ بننے لگے جو وسائل سے مالامال اور سماجی اعتبار سے انتہائی پسماندہ تھے۔ اب ریاست کی توسیع کا مقصد الوہی نہ رہا۔ اس کی جگہ کاروبارِ معیشت لے چکا تھا۔ یہ معاملہ مغربی ریاستوں کے مابین، خوفناک حد تک، حساس صورت اختیار کر چکا تھا، اور وہ ایک دوسرے کو مرنے مارنے پر آمادہ رہتے تھے۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کا منافع، دنیا کی تمام معیشتوں کے منافع کے نصف تک آن پہنچا تھا۔ اتنی اہم کامیابی، ہندوستان کو جانے بغیر حاصل کرنا ممکن نہ تھا۔ توسیع پسندانہ عزائم واضح ہونے لگے، اور پہلے جو استشراق مذہبی اکھاڑ پچھاڑ میں متحرک تھا اب ریاست کی سیاسی معیشت کا محافظ بن گیا۔ یہ بیانیہ اپنے باطن میں بہت سی تلخ اسناد لیے ہوئے ہے۔ اہلِ مشرق یا ہندوستان پر حکومت کرنے کے متعدد جواز فراہم کیے گئے۔ اہلِ مشرق پسماندہ، گنوار اور اجڈ لوگ ہیں۔ انھیں بہترین معاشرت کی ضرورت ہے۔ سماجی اعتبار سے یہ مفلوک الحال لوگ، ٹھیک طور سے اپنی نمائندگی کا حق بھی ادا نہیں کر سکتے۔ ان کی بہترین نمائندگی کے لیے اہلِ مغرب کو آگے آنا چاہیے۔ وسائل ہونے کے باوجود ان کے ہاں ڈھنگ کا انفراسٹرکچر موجود نہیں، اہلِ مغرب کو خاص طور سے اس ضمن میں ان کی معاونت کرنا ہوگی۔ یہ لوگ جدید علوم سے بے بہرہ ہیں اور یہ ایک نوع کی الوہی خدمت ہوگی کہ انھیں زیورِ علم سے آشنا کیا جائے۔ مشرقی باشندے ٹھیک طور سے حالات کا تجزیہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ ضیعف الاعتقادی، غیر معقول تجزیاتی رویہ اور گلبلک اندازِ فکر ان کے مخصوص شخصی وضائف ہیں جن کے ہوتے یہ

کسی بھی طور جدید مغربی ذہن کی ہم سری نہیں کر سکتے اور یہ کہ نسلی اعتبار سے یہ کج فہم اور بے عمل لوگ ہیں لہٰذا یہ نسلِ انسانی کی اعلیٰ خدمت ہو گی کہ اِنھیں اُن خوبیوں سے متصف کیا جائے جن کی انھیں اشد ضرورت ہے۔ گورے کی یہ اخلاقی ذمہ داری(WHITE MAN BURDEN) مملکت کی توسیع کے لیے، وہ عذرِ بے بہا جانی گئی جو نسل در نسل، کم و بیش، تین صدیوں کو محیط رہی اور آج بھی اہلِ مغرب کا یہ اندازِ فکر، زمینی حقائق کے باوصف، کچھ زیادہ بدلاؤ نہیں رکھتا۔ ذیل کے یہ اقتباسات بین السطور بیانیے کے مؤید ہیں:

"During the nineteenth and twentieth centuries, the Orientalists became a more serious quantity, because by then the reaches of imaginative and actual geography had shrunk, because the Oriental –European relationship was determined by an unstoppable European expansion in search of Markets, resources, and colonies, and finally, because Orientalism had accomplished its self- metamorphosis from a scholarly discourse to an imperial institution."17

"Finally, with twentieth –century nationalist movements of decolonization, orientalism acquired a third meaning when some nationalist activists and scholars argued that scholarly discipline of Orientalism could not be understood apart of its production, namely, western imperialism."18

مشرق اور خاص طور سے جنوبی ایشیا کو سیاسی اور معاشی طور پر زیر نگیں کرنے کے لیے، اس بڑے زمینی خطے پر بسنے والے لوگوں سے شناسائی کا معاملہ حساس نوع کا تھا۔ مذہبی اقدار، رسوم و رواج، معیشت، سیاست اور خاص طور سے زبان ایک ایسا ذریعہ، وسیلہ تھا جو کسی بھی تہذیب کے باطن کو پوشیدہ نہیں رہنے دیتا۔ یہی سبب ہے کہ ابتدائی

مستشرقین خاص طور سے لسانیات(PHILOLOGY) کی طرف راغب ہوئے اور مقامی ، قدیمی اور متداول زبانوں پر عبور حاصل کیا، اور ان کے توسط سے خطے کے ماضی اور حال، تہذیب و ثقافت، قوموں، نسلوں کی نفسیات اور شخصی، کرداری اوصاف سے آگاہی حاصل کی اور یہ شعبۂ تحقیق اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں مسلسل فروغ پاتا رہا۔ زبان ایک نوع کا درّہ تھا جس سے گزر کر ہی ایک نئی دنیا کو دیکھنا اور ایک نئے تمدّن کو جاننا تھا۔ حکمرانی کرنے کے لیے مکمل تعارف ضروری تھا اور یہ مکمل تعارف زبان ہی کے وسیلہ سے حاصل ہوا۔ ایڈورڈ سعید نے درست کہا کہ ہندوستان کا مطالعہ ایک متن کے طور پر کیا گیا۔ متن کتنا زور آور ہوتا ہے اس سے بدیسی طالع آزما بخوبی آگاہ تھے۔ علمی سطح پر بڑے زوروں سے زبانوں کی بابت آگاہی کا ڈول ڈالا گیا اور بعض مستشرقین اس ضمن میں اتنی مہارت لیے ہوئے تھے کہ مقامی زبانوں کے اساتذہ ششدر رہ گئے۔ تمام بڑی زبانوں کے متون کھنگالے گئے۔ ان کو از سرِ نو چھاپنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان میں موجود مٹی ہوئی قدیم تہذیبوں کا سراغ لگایا گیا۔ قدیم اور متداول ادب کو جانچا گیا۔ غرض مغرب کا بڑھتا ہوا لسانی اشتیاق جہاں ایک طرف سلطنت کی توسیع میں معاون تھا تو دوسری جانب حصولِ علم کی تکمیل میں افزودگی کا باعث بھی بنا۔ اس سے جہاں استشراق کی تحریک توانا ہو رہی تھی وہیں اہلِ مغرب، خاص طور سے انگلستان اور فرانس میں خود اعتمادی بڑھ رہی تھی۔ انسانی اور زمینی حقائق مترشح ہونے لگے۔ ایک غیر ثقافت سے وہ خود بھی جڑنے لگے۔ کوئی شے اب اندھیرے میں نہ تھی اور ظاہر ہے کہ یہ کام چند دنوں یا ہفتوں میں نہ ہوا تھا اس کے لیے باقاعدہ ایک منصوبہ ، لائحہ عمل بنایا گیا۔ ابھی ولیم جونز ہندوستان کے ساحل پر اترا نہ تھا کہ اس نے آئندہ کے تحقیقی اور علمی منصوبوں کو صفحہ قرطاس پر کھینچ ڈالا۔ وہ خطے کی مقامی زبانوں سے لے کر یہاں کے رسوم ورواج، ہندو مسلم قوانین، قدیمی عہد کی تاریخ، صحائف کی صحت بابت حقائق کی تلاش، جدید سیاست اور ہندوستان کا جغرافیہ، سیلِ عظیم کی بابت روایات، علم الاعداد، جیومیٹری اور ایشیا کی مشترکہ سائنس، ادویات، کیمیا، جراحت، علم الاعضاء، ہندوستان کی فطری پیداوار، شاعری، خطابت، اخلاقیات، موسیقی، تبت، کشمیر، تجارت، صنعت و حرفت، زراعت، شماریات، مغل اور مرہٹہ آئین غرض جو کام ایک بڑے ادارے کو اپنے ذمّے لینا چاہئے تھا، اس کا بار، تنِ

تنہاخود انھوں نے اٹھالیا۔ یہ تاریخِ انسانی کی ایک بے مثل صورتحال تھی؛اور یہ بھی کیا اتفاق تھا کہ اپنی ہندوستان آمد کے فوراًبعد ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد رکھ دی:

"اس (ولیم جونز) نے اپنے عہد کے مسائل کا تصور اپنے فرائضِ منصبی سے کہیں آگے جا کر کیا۔ چنانچہ ابھی تین ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ اس نے ۱۵ جنوری ۱۷۸۴ء کو ایشیاٹک سوسائٹی کا ڈول ڈال دیا۔ ہندوستان میں نئے سال کا آغاز، استشراق کے نئے عہد کا پیش خیمہ بنا"۔۱۹

ایشیاٹک سوسائٹی کے قیام کی وجہ کچھ بھی ہو، یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ولیم جونز کو جلد یہ احساس ہو گیا تھا کہ اس اکیلے کے لیے اقلیمِ علم کی سرحدوں کا احاطہ کرنا ممکن نہیں اور شاید یہی اس کی واقعیت پسندی تھی۔ مذکورہ علمی اہداف کا خاکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اس فردِ واحد کے لیے ان فکری گوشوں کی تلاش اس قدر ضروری نہ تھی، اوران کا حصول ذاتی حوالہ سے، خود ان کے لیے کسی اہم کارگزاری کا وسیلہ نہ بن سکتا تھا کہ ایسے میں مہارت اور تفحص کا فقدان یقینی تھا جو ان کی شہرت اور علمیت کو داغدار کر سکتا تھا اور ولیم جونز ایسی شخصیت جن کی مدح میں لائقِ ذکر آراء ملتی ہیں، کسی بھی طور ایسی صورتحال قبول نہ کر سکتے تھے:

"جونز کا یہ کہنا ہے کہ تمام انسانی علم، انسان کی تین ذہنی صلاحیتوں: یادداشت، استدلال اور تخیل کی پیداوار ہے اور تمام انسانی علوم (تاریخ، سائنس اور آرٹ) ان تین صلاحیتوں کی پیداوار ہیں، اس کے آفاقی نقطہ نظر کا اظہار ہے"۔۲۰

"Sanskrit, Indian religion, and Indian History did not acquire the status of scientific knowledge until after Sir William Jones's efforts in the late eighteenth century, and even Jones's interest in India came to him by way of his prior interest in and knowledge of Islam."21

سر ولیم جونز جن کے تبحر کی بابت، بہت کچھ کہا گیا ہے؛ ان کی پر خلوص علمی مساعی نے، پیش آیند مستشرقین کے لیے گراں قدر، در وا کیے۔ وہ ایک ایسے سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، جہاں سے استشراق کے عمیق اور ثمر آور سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ ان کی کاوشیں سراہی گئیں اور آج ان کا نام، استشراق کے پس منظر میں، احترام سے لیا جاتا ہے:

"No other orientalists, Pauthier later affirmed, had so broad a range of knowledge at his disposal as Jones did. Jones himself acknowledged that he had a thorough knowledge of thirteen of the twenty-eight languages he had studied. His open-hearted nature and his curiosity, his penetrating intuition, his ardor, and his grace can all be read in his features, preserved, fortunately, in the portrait by Joshua Reynolds and reproduced in engravings as early as 1779 and 1782. It seems fitting that his name should be given to a formerly mythical tree: Jonesia Asoka".22

جونز عملاً کیا چاہتے تھے؟ اور توسیع پسندانہ امور میں، ان سے اور دیگر بڑے اذہان سے کیا کام لیا جا سکتا تھا، اس بابت ذیل کی آراء اہمیت کی حامل ہیں:

"Jones wanted to administer justice in Calcutta and from Pondi cherry to Bombay, he was able to accomplish what Anquetil had first set out to achieve."23

"The decisive period in Indic studies began with the arrival of English civil servants in Calcutta around 1780, who supported by the governor, Warren Hastings, began an extraordinary undertaking. Learning does not

undermine its own course alone, and the initial intention, conversion, yielded to or was intermingled with another intention, conquest. The aim in this period was no longer to clear a path of knowledge but for administration."24

ہمارے خطے میں بھی استشراق کے مخصوص اہداف تھے اور ولیم جونز ایسی مقتدر شخصیات بھی برطانوی سامراج کے استحکام میں معاون رہیں۔ یہ بیانیہ متعدد، مستند آراء کو سمیٹے ہوئے ہے۔ پیشتر اس کے کہ ہم اس کے متبادل بیانیے کو زیرِ بحث لائیں، مناسب ہو گا کہ ہم اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے اہم مستشرقین اور ان دو صدیوں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں پر ایک نظر ڈالیں اور برطانوی، فرانسیسی اور خاص طور سے جرمن استشراق کی بابت کچھ اہم امور کی نشاندہی کریں۔

اس ضمن میں ایک اہم رائے یہ بھی ملتی ہے کہ ابتدائی مستشرقین درحقیقت بائبل میں موجود دیگر زبانوں کے الفاظ کی بہتر تفہیم کے لیے لسانیات کے شعبے کی طرف راغب ہوئے۔ کچھ ایسی ہی صورت ہندوستان میں اٹھارہویں صدی میں دیکھی جاسکتی ہے۔ تاہم انیسویں صدی میں کیا اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کی بابت ذیل کی آراء خاص طور سے دیکھی جاسکتی ہیں:

"By and large, until the mid-eighteenth centuries Orientalists were biblical scholars, students of Semitic languages, Islamic specialists, or, because the Jesuits had opened up the new study of China, Sinologists.......by the middle of the nineteenth century Orientalism was as vast a treasure-house of learning as one could imagine."25

"In the nineteenth century orientalists representations of supposedly exotic cultures became commonplace themes in art, literature and music. Many leading

artists (and many not so leading ones), including Mozart, Flaubert, and Delacroix (to mention but three), made extensive use of Orientalist settings, motifs, and tropes in their work."26

مذکورہ دو صدیاں استشراق کے ضمن میں انتہائی ثمر آور ثابت ہوئیں، اور قریباً ہر موضوع اور پہلو پر گرانقدر کاوشیں منظرِ عام پر آئیں۔ ان سب کا یہاں تفصیلاً ذکر، اک جدا مقالے سے مشروط ہے تاہم چند اہم مستشرقین کی بابت گفتگو ناگزیر ہے۔ ہندوستان میں برطانوی، جرمنی اور فرانسیسی استشراق کے بہت سے اہم نام، اپنی منفرد اور بے مثل کارگزاریوں کے سبب آج بھی یاد کیے جاتے ہیں۔ ان کے اصل اہداف کچھ بھی ہوں، یہ ماننا ہوگا کہ ان کی علمی اور تحقیقی کدو کاوش کے سبب اس خطے کے لوگ بہر طور مستفید ہوئے۔ لوگوں میں لکھنے پڑھنے کی جستجو اور چیزوں کو منطقی انداز پر، پرکھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی؛ بہت سی توہمات اور غیر سائنسی استدلال پر خود گرفت کرنے کی عادت پختہ ہوئی۔ تحقیق و تدوین کے نئے ضابطوں سے شناسائی ہوئی اور جدید مغربی طرزِ احساس سے ایک نوع کی قربت بڑھی جو نئے اور انتہائی تخلیقی رویوں کو مزاج کا حصہ بنانے میں معاون ہوئی۔ عقیدت اور فضیلت سے ہٹ کر چیزوں کو پرکھنے کا رویہ فروغ پانے لگا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہاں بہت سی تحاریک کا آغاز ہوا۔ جدید تعلیم اور سائنسی علوم کے فروغ کے لیے باقاعدہ تنظیمیں وجود میں آئیں اور یہاں تک کہ قدیمی ادب اور زبانوں سے گلو خلاصی کا آغاز ہوا۔ بنارس میں سنسکرت کالج کی مخالفت میں روشن خیال ہندو سامنے آئے اور پیش پا افتادہ ادب سے مغائرت برتنے کا تُند جذبہ نمو پانے لگا؛ جبکہ استشراق کا اصل ہدف ہی وہ قدیم متون تھے جن کے وسیلوں سے وہ ہندوستان کو من حیث المجموع سمجھنا چاہ رہے تھے۔ غرض سرسید تحریک بھی اسی پس منظر میں جنم لیتی ہے اور نئے علوم وافکار کی تلاش میں اداروں، سوسائٹیز اور جریدوں کا اجراء ہوتا ہے اور یہ سب ایک غیر جذباتی، سائنسی استدلال سے فروغ پانے لگا، اس کی بنیاد ایک حد تک مستشرقین نے رکھی، غرض یہ ایک انتہائی پیچیدہ، تناقضاتی صورتحال تھی۔ مستشرقین کی خاور شناسی سے مغرب پسندی پروان چڑھنے لگی اور پھر ایک صورت لارڈ میکالے ایسی شخصیات کی تھی جو سرے سے

ہی مشرقی علوم کے ناقد تھے، اور مشرقی علوم کو کارِ بے کاراں سمجھتے تھے۔ شرق شناسی کی روایت ان کے لیے اہمیت کی حامل نہ تھی:

> " ۷ مارچ ۱۸۳۵ء کی تاریخ تعلیمی پروگرام میں اہم شمار ہو سکتی ہے۔ یہ اینگلی سسٹ افراد کی فتح کا یوم ہے۔ اس دن کے بعد مشرقی اداروں پر صرف ہونے والی رقم کا بہت تھوڑا حصہ ان اداروں کے لیے مخصوص رہ گیا اور حکومت کے تعلیمی فنڈ بڑی حد تک مغربی طرز کے مدرسوں اور کالجوں پر صرف ہونے لگے جن میں ذریعہ تعلیم انگریزی تھا۔۔۔۔ میکالے کی رائے یہ تھی کہ انگریزی کے ذریعے مفتوحین میں ایک ایسا طبقہ پیدا کر دیا جائے جو جسمانی طور پر تو مقامی ہو لیکن ذہناً اور مذاجاً انگریز ہو۔"۲۷

یعنی پہلے جو کام تبدّلِ مذہب سے لیا جاتا تھا، اب اس کا آغاز تبدّلِ لسان سے ہونے لگا ۔ ترجیحات بدل گئیں، لیکن بہرحال استشراق کی تحریک متوازی سطح پر بدستور جاری رہی۔ کمپنی کے نزدیک، فورٹ ولیم کالج اب ایک سفید ہاتھی کے طور پر رہ گیا تھا۔ اس بابت بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس کی افادیت اور مقاصد کے بارے میں مزید گفتگو، پہلے سے موجود تحقیقی مواد کو دہرانے کے سوا، اور کچھ بھی نہیں، البتہ اس کی، اور ایشیاٹک سوسائٹی کی اہمیت کیا تھی اس بابت ایک اہم رائے کچھ یوں ہے:

> "حقیقت یہ ہے کہ کلکتہ میں قائم ایشیاٹک سوسائٹی اور فورٹ ولیم کالج، ایسٹ انڈیا کمپنی کے یکے بعد دیگرے وجود میں آنے والے وہ " اسٹیٹ اپریٹس " تھے جن کے ذریعے شرق شناسی کی یورپی روایت پروان چڑھی"۲۸

تحریکِ استشراق کا چھتنار درخت ٹوٹنے جا رہا تھا۔ اس سے بہت سا کام لیا جا چکا تھا اور شاید زمینی حقائق پہلے سے دائم نہ رہے تھے۔ ہندوستان کو مزید سمجھنے کی اب چنداں ضرورت بھی نہ تھی۔ ان پر براہِ راست حکومت کرنے اور اپنے منشاً و مرضی کے مطابق یہاں کے لوگوں سے کام لینے کا وقت آ گیا تھا۔ مزید تردّدات اور توضیحات میں وسائل کو جھونکنا فہم سے بالا تھا۔ استشراق سمٹ کر شخصیات اور افراد تک محدود رہ گیا؛ البتہ ادبی و فکری وسیلوں سے حظ اٹھانے کا سلسلہ جاری رہا:

"۱۸۵۷ء کے بعد مشرقیات کا شوق صرف پنجاب (بشمول یو۔پی) سرحد میں رہ گیا۔ ورنہ برصغیر کے دوسرے علاقے مغرب کی رو میں پوری طرح ڈوب گئے اور مشرقی زبانوں کی کشش تحریک کی بجائے افراد کی متفرق کوششوں کی مرہونِ منت رہ گئی" [۲۹]

۱۸۳۰ء سے ۱۸۵۷ء تک جو اہم مستشرقین سامنے آتے ہیں ان کی بابت ڈاکٹر رضیہ نور محمد نے کسی قدر صراحت سے اپنے مقالے میں تعارف کرایا، یہاں ان کا از سرِنو اعادہ مناسب نہیں تاہم جو نام موصوفہ نے پیش کیے ان پر اگر سرسری نظر دوڑائیں توسینڈ فورڈ آرنٹ(SANFORD ARNET)جان شیکسپئیر، لیبی ڈیف(LEBEDEFF) ناتھے برائس(NATHE BRICE) فرگسن (FERGUSSON)ہنری گرانٹ(HENRY GRANT) ایس سلاٹر(S. SLOTTER) این ۔ ایچ ولسن(N.H.WILSON) ڈبلیو۔ سی۔ہاؤلنگ(W.C. HOWLING)اور ولیم ییسٹس(WILLIAM YESTES) ایسی شخصیات کے نام ملتے ہیں جو مختلف شعبہ جات میں منفرد و ممتاز تھے۔ ایڈورڈ سعید نے بھی بہت سے اہم نام گنوائے جن کا جدا سے اشاریہ بنایا جا سکتا ہے البتہ انیسویں صدی کے وہ اہم مستشرقین اور انجمنیں جنھوں نے اس پورے علمی ضابطے کو عالمی سطح پر دوام بخشا ان کی بابت ذیل کی رائے وقعت کی حامل ہے:

"The official intellectual genealogy of Orientalism would certainly include Gobineau, Renan, Humboldt, Steinthal, Burnouf, Remusat, Palmer, Weil, Dozy, Muir, to mention a few famous names almost at random from nineteenth century. It would also include the diffusive capacity of learned societies: the Societe asiatique, founded in 1822; ....the American Oriental Society, founded in 1842; and so on."30

مشنری تحاریک بھی اس کے متوازی اپنا کام مستعدی سے جاری رکھے ہوئے تھیں۔ استشراق کی یہ مقصدی تبلیغی جہت، اِس فکری منظر نامہ میں نمایاں رہی البتہ ان کی مناظرانہ کاوشیں، دور رس نتائج مرتب کرنے میں ناکام

ٹھہریں۔ جزوی طور پر کامیابی ضرور حاصل ہوئی لیکن چونکہ اس ضابطے میں حقیقت پسندی کا رویہ پنپ نہ سکتا تھا اس لیے انیسویں صدی میں ان کی کدوکاوش محدود بیانیے میں آگے بڑھی اور یوں استشراق میں سیکولر رجحانات فروغ پانے لگے جسے ماڈرن اوریئنٹل ازم کہا گیا:

“Linguists and explorers like Jones and Anquetil were contributors to modern orientalism, certainly, but what distinguishes modern Orientalism as a field, a a discourse, is the work of later generation than theirs. If we use group of ideas, the Napoleonic modern Orientalism, we can consider its inaugural heroes-in Islamic studies, Sacy and Renan and Lane to be builders of the field, creators of a tradition, progenitors of the Orientalist brotherhood.”31

انیسویں صدی، استشراق کا منہاج ہے۔ ایڈورڈ سعید اس ضمن میں دتاسی اور رینان کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ مؤخرالذّکر چونکہ براہِ راست اردو ادب متعلق سے نہیں اس لیے ہم دتاسی کو گفتگو کا حصہ بنائیں گے جنھوں نے ہندوستان سے ہزاروں میل دور بیٹھ کر، اردو کے فروغ میں، اہم کردار ادا کیا اور نہ صرف اپنے عہد کو متاثر کیا بلکہ پیش پا محققین اور ادب کے جویاؤں کے لیے ایسے ضابطے مرتب کیے جنھیں سامنے رکھ کر، علمی و فکری امکانات کو، عملی جامہ پہنایا جاسکتا تھا۔ شعراء کے دواوین، اردو کی سال بہ سال بدلتی صورتحال اور یورپ میں اردو کو متعارف کرانے میں اپنے عہد کی انتہائی اہم شخصیت جن کے تبحر اور کردار کی بابت، بدقسمتی سے، متصادم آراء ملتی ہیں۔ ایڈورڈ سعید ان کا نام احترام سے لیتے ہیں جبکہ قاضی عبدالودود اور مولوی عبدالحق صاحب کی رائے مختلف ہے۔ ذیل میں ان صاحبان کی آراء بالترتیب پیش کی جارہی ہیں:

“His heroism as a scholar was to have dealt successfully with insurmountable difficulties; he acquired the means to present a field to his students where there was none. He made the books, the precepts, the examples........The result was the

production of material about the Orient, methods for studying it, and exempla that even Orientals did not have."32

"دتاسی کی ذہنی صلاحیت محض معمولی ہے۔ اس نے جو اہم کام اپنے ذمے لیا تھا اس کے لیے کافی تیاری نہیں کی اور جو مواد اس کے پاس جمع ہوا تھا وہ کام بھی نہ لے سکا جو ایک متوسط درجے کا محقق لے سکتا تھا۔۔۔۔۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ اُس زمانے میں فرانس کا معیارِ تحقیق پست تھا"۳۳

"وہ پکا عیسائی ہے اور عیسائی مبلغین کی کوششوں کو بڑے شوق سے بیان کرتا ہے اور عیسائی مذہب کی اشاعت کا متمنی ہے۔ تیسری بات جو وہ صاف صاف کہتا ہے یہ کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت باعثِ برکت و خیر ہے"۳۴

اور یہ صرف دتاسی کا ہی کہنا نہ تھا بلکہ کارل مارکس ایسے انسان دوست سے انگلستان کے ماہر سیاسیات بیل فور تک متعدد اہم علمی شخصیات کی آراء بھی کچھ اسی نوع کی تھیں۔ برطانوی امپیریل ازم، ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہ گردانا گیا، اور متعدد حوالوں سے یہ باور کرایا گیا کہ اسی میں خطے اور اس میں بسنے والے کی نجات ہے کہ وہ جہالت کے اندھیروں سے باہر نکل رہے ہیں۔ ہندوستان کی سماجی تقلیب سے مصر کی تہذیبی تنقیح تک یہی راگ برابر الاپا گیا اور اس عذر کو بارہا پیش کیا گیا کہ مشرق، حالتِ تنزل میں ہے۔ یہ اپنی شاندار روایات سے منحرف ہو چکا ہے۔ اس کا بہترین دور، اب قصہ پارینہ ہے لہٰذا اسے اقوامِ عالم میں محکم بنیادوں پر کھڑا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مغرب اس کی مدد کو آئے اور اُس استحصالی نظام کا خاتمہ کرے جو قرنوں، زمانوں سے اِنھیں نسل در نسل برباد کر رہا ہے۔ یہ وہ دل پذیر استعماری کلیشے تھے جن کی بنیاد پر علاقے مفتوح کیے اور قومیں غلام بنائی گئیں۔

ہندوستان میں ۱۸۵۷ء سے بعد کے اہم مستشرقین میں جان بیمز(JOHN BEAMS)، پالمر(PALMER)، ڈاکٹر ولیم ہوئی(HOEY)، ایوژنڈ ایونگ(EIVING)، ایچ بوخ مین(H. BOLCKMAN) سے جان پلیٹس (JOHN T. PLATTS)، کیپٹن بورادیل(CAPT. BORRADAILE) اور ڈبلیو ایل

تھابرن(W.L.THOBURN) سے جی۔این۔رینکنگ(G.N.RANKING) اور ریورنڈ ہوپر(HOPPER)اور کریون(CRAVEN)کے نام ملتے ہیں:

"اس دور کے علمی سرمائے میں لسانی مطالعہ ہی اپنے عروج کو نہیں پہنچا بلکہ تدوینِ لغت میں جان پلیٹس کا نام بھی زندہ رہے گا جس نے اردو زبان کے مطالعے میں گرامر کی تدوین نو بھی کی اور لغت میں ان الفاظ پر زور دیا جن کی اصل سنسکرت یا پراکرت ہے"۔۳۵

اور گریرسن کا اصل کارنامہ لنگوئسٹک سروے آف انڈیا ہے۔ اس عہد کی دیگر اہم شخصیات میں ہالرائیڈ اور لائٹنر کے نام خاص طور سے لیے جاسکتے ہیں جن کی کاوشوں کے ثمرات سے خطے کے لوگ آج بھی بہرہ مند ہیں۔ انجمنِ پنجاب، گورنمنٹ کالج، اورینٹل کالج اور پنجاب یونیورسٹی کا قیام ان ہی افراد کی جملہ مساعی کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر کی مشرق پسندی کا یہ عالم تھا کہ ان کی بعض تحریریں ان کے قلمی نام مولوی عبدالرشید کے نام سے شائع ہوئیں۔ انجمنِ پنجاب کی بابت بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور اس ضمن میں کرنل ہالرائیڈ کی مخلصانہ کاوشوں کے بارے میں موجود مواد کا ذخیرہ خاصا وقیع ہے۔

یہ بات پہلے کہی جاچکی ہے کہ انیسویں صدی استشراق کا زریں دور ہے، اور ہمارا تعارف بہت سی بے مثل، نابغۂ عصر شخصیات سے ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ مشرق پسندی میں مسابقت کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ موجود تھا۔ انتہائی زیرک اور جفاکش محقق، ماہرِ لسانیات اور ادب کے پارکھ اس منظرنامے میں ابھرتے ہیں اور اپنے پیچھے خاور شناسی کی ایک گہری لکیر چھوڑ جاتے ہیں۔ یہاں ان تمام مستشرقین کا تعارف اور ان کے کارہائے نمایاں کام احاطہ ممکن نہیں۔ یہ ایک انتہائی مفصّل سلسلہ کلام ہے جس کے لیے ایک سے زائد ابواب کی ضرورت ہے۔ اور پھر ان میں مختلف شعبوں کی تخصیص کے ساتھ ساتھ ان کے آبائی اوطان کی تفریق بھی ضروری ہے کہ بہت سے اہم مستشرقین جو یوں تو عہدِ برطانیہ میں سرکاری افسران کی حیثیت سے وارد ہوئے، لیکن ان کے آبائی اوطان جدا یا متفرق تھے مثلاً دہلی کالج کے الوئس اشپرینگر اور ڈاکٹر لائیٹنر دونوں انگریز نہیں تھے مگر برطانوی شہریت حاصل کرکے ایسٹ

انڈیا کمپنی میں ملازم ہوئے اور ہندوستان آئے۔ دیگر اہم مستشرقین میں میجر اے آر فلر(FULLER)، سائمن میتھیو ایڈون کیمپسن(SIMON METHEW EDWIN KEMPSON)،جی۔ٹی ۔پلنکٹ (G.T.PLUNKETT)، ڈی۔ سی۔ فلاٹ اور گراہم بیلی وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ من حیث المجموع اگر ان مستشرقین کی خدمات کو پیشِ نظر رکھا جائے تو ہمیں یہ ماننے میں کچھ تامل نہ ہو گا:

" اردو زبان وادب کی آبیاری میں مستشرقین نے جو حصہ لیاوہ اردو زبان وادب کے لیے ناقابلِ فراموش ہے۔ اردو کی لسانی تاریخ، اردو لغت، اردو گرامر اور درسی کتابوں کی تدوین میں جو معیار ان فضلأنے قائم کیا، اس پر آج بھی بجاطور پر ناز کیا جاسکتا ہے۔۔۔۔۔ مستشرقین نے کلاسیکی کتابوں کی تدوین کا نیامعیار قائم کیا، اور زبان وادب کے معیاروں کو اس جانفشانی سے مرتّب کیا کہ آج کوئی لغت نویس، کوئی قواعد نویس، کوئی نقاد، کوئی تاریخِ ادب کالکھنے والا، اِن غیر ملکیوں کے کارناموں کو نظر انداز نہیں کر سکتا" ۳۶

استشراق کا فکری کینوس پھیلتے پھیلتے بیسوی صدی کو جالیتا ہے۔ اس انتہائی بو قلموں عہد میں ، جہاں آرٹ ، کلچر ، ادب، سیاست، معیشت، سائنس، نفسیات اور فلسفہ وروحانیت کے مختلف شعبہ ہائے جات میں افکار و نظریات کا ایک سیلِ بے پناہ ٹھاٹھیں مارتاہے وہیں خاور شناسی میں بھی بہت سی اہم تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی دیکھی جاسکتی ہیں۔ ریاستی سطح پر پہلے سے توانا منصوبے کے تحت ڈسکورس، آگے بڑھانے کا قرینہ نظر آتاہے، اور یہ صدی بھی اپنے جلو میں بہت سی ایسی بہترین کاوشوں کو سمیٹے ہوئے ہے کہ اس عہد کو استشراق کے زریں دور سے، موسوم کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں۔ اس پر بات کرنے سے قبل یہ دیکھنا مناسب ہے کہ استشراق کے تفاعل میں موجود فرق کس نوع کا تھا ، گو اس بابت متعدد بیانیے موجود ہیں تاہم ایک اہم رائے کچھ یوں ہے:

"It became clear that institutions and governments were better at the game of management than individuals"..........What accompanies the shift is a change in the attitude as well of the individual Orientalists, who need no longer see himself–as Lane, Sacy, Renan, Caussin, Muller, and others did–as belonging to a sort of guild

community with its own internal traditions and rituals. Now the Orientalists have become the representative man of his Western culture........"37

یعنی انفرادی حیثیت میں جو تبدیلی آئی بات اس سے بڑھ کر اداروں اور حکومت تک جا پہنچی۔ اب اہمیت کے حامل افراد نہ رہے بلکہ وہ ادارے موقر کہلائے جن سے افراد وابستہ تھے۔ جزوی طور پر یہ کہنا درست ہے، لیکن من حیث المجموع صورتحال، یکسر تبدیل نہ ہو سکی، اور ہمیں بیسویں صدی میں بہت سی ایسی اہم اور بڑی شخصیات دیکھنے کو ملتی ہیں جن کے ہوتے ہوئے اداروں کا قد ناٹا محسوس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر آنیماری شمل کا تعلق بھی بیسویں صدی سے ہے۔ ان کا بیشتر کام، مذکورہ صدی میں، دادِ تحسین وصول کر چکا ہے، اور ان سے بھی پہلے، عالمی سطح پر متعدد ایسی شخصیات دکھائی دیتی ہیں جن کی انفرادی کاوشوں نے ایک عالم متحیر رکھا اور جن کا پھیلا ہوا تحقیقی کام، اوروں کے لیے، آج بھی مشعلِ راہ ہے:

"Therefore, in the best Orientalist work done during the interwar period- represented in the impressive careers of Massignon and Gibb himself- we will find elements in common with the best humanistic scholarship of the period."38

میسی یوں کی انفرادی اہمیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس شخصیت نے شمل کی مانند اسلام اور مسلم روحانیت کا مطالعہ رومانی انداز پر کیا اور احتیاط کا دامن سلیقے سے پکڑا، اور پھر نہ صرف مطالعات پیش کیے بلکہ ایسے گرانقدر اضافے بھی کیے جو اوروں کے لیے کسی دریافت سے کم نہ تھے۔ میسی یوں کا اندازِ فکر ہمیشہ مثبت رہا۔ منصور حلاجؒ کی بابت جو مطالعہ پیش کیا وہ اس قدر جامع اور متاثر کن تھا کہ اقبالؒ تک کو اپنی رائے، مذکورہ شخصیت کی بابت تبدیل کرنا پڑی، اور جب شمل سے ملاقات ہوئی تو تصوف میں گلاب کے پھول کی سرّی اہمیت کچھ اس طرح سے بتاتے ہیں کہ موصوفہ بڑے احترام سے، اپنی آپ بیتی میں، اس کا تذکرہ کرتی ہیں۔ میسی یوں روحانیت کو ایک عملی تجربے سے کم نہ

جانتے تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اُس وقت تک روحانیت کو سمجھا نہیں جاسکتا جب تک عملی طور پر اس کے مدارج طے نہ کیے جائیں۔ ایڈورڈ سعید کچھ ان الفاظ میں انھیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں:

"Massignon was a tireless fighter on behalf of Muslim civilization and, as his numerous essays and letters after 1948 testify, in support of Palestinian refugees, in defense of Arab Mumslim and Christian rights in Palestine against Zionism..."39

کچھ اسی نوع کا علمی اور عملی رویہ شمل کے ہاں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ میسی یوں کی طرح شمل نے بھی اسلام اور اس کی سماجی اقدار کی بابت ایک ہمدردانہ رویہ قائم رکھا اور اس کے نتیجہ میں انھیں بھی سبّ و شتم کا ہدف بنایا گیا۔ غرض شمل سے قبل ایک بڑا نام جس نے مسلم معاشرت اور روحانیت کا بھرپور دفاع کیا وہ میسی یوں ہے۔

استشراق کے ضمن میں ایک بڑی تبدیلی اس وقت دیکھنے میں آئی جب دوسری جنگِ عظیم کے آخری دورانیے میں برطانوی امپریل ازم دم توڑنے لگا اور اس کے ساتھ تباہ حال فرانس، ہالینڈ اور بیلجیم بھی عالمی تسلط سے دستبردار نظر آنے لگے؛ یہ جان چکے تھے کہ اب حالات ان کی گرفت سے نکل کر کسی اور نہج پر جانکلے ہیں۔ عالمی افق پر ان کی حربی اور سیاسی عدم موجودگی سے امریکہ، تہذیبِ مغرب کو سہارتے، اپنے مذموم ارادوں کی تکمیل، کامیابی سے کرنے لگا، اور یوں استشراق کا ایک پھیلا ہوا فکری جغرافیہ، ایک عالمی طاقت کی فارن پالیسی کے تحت فروغ پانے لگا اور یہیں سے اس کے تنزل کا باقاعدہ آغاز ہوا، جب کم تربیت یافتہ اور خاور شناسی سے ناآشنا لوگ محض تعصب اور نفرت کی بنیاد پر، افکار و نظریات کی ترویج میں مشغول ہوگئے اور ریاستی ترجیحات میں دھونس اور دھاندلی کے عناصر فروغ پانے لگے تو ایسے میں پیش کردہ مطالعات غیر جانبدار نہ رہے اور ان کی بنیاد پر قائم ہونے والا نقطۂ نظر تعمیری نہ رہ سکا۔ غرض یہ امریکی استشراق جس کی مجموعی ساخت ہی جبری تسلط (HEGEMONY) پر قائم ہے اور جس کے لیے اپنے مفادات کا تحفظ ہر طرح کے انسانی وقار اور اقدار پر تفوق رکھتا ہے اور جو مقاصد کے حصول میں عسکری اور

انتظامی بندوبست کا اہتمام کرتا ہے، کے ہاں استشراق کا بیانیہ، سیاسی اور معاشی حاشیوں میں مقید ہو کر رہ گیا۔ یہ نہیں کہ ماضی میں استشراق، سیاسی معیشت کا موئدنہ تھا یا ریاستی پھیلاؤ میں معاون نہ تھا، لیکن اب صورتحال متشدد ہو چکی تھی۔ علمی اور تحقیقی مطالعات پر پہلے سے طے سیاسی مقاصد کے غلبہ نے خود امریکہ میں موجود دانشوروں کی ایک بڑی تعداد کو اپنی ہی حکومت کے خلاف آواز اٹھانے پر مجبور کیا اور ریاستی عالمی جبر کے خلاف باقاعدہ قلمی اور عملی مزاحمت بھی کی۔ نوم چومسکی، ایڈورڈ سعید اور اقبال احمد، عالمی افق پر چمکتی ایسی روشن شخصیات ہیں جنھوں نے بساط بھر، امریکہ کے توسیع پسندانہ معاشی بندوبست کے خلاف احتجاج کیا اور یہ باور کرایا کہ اس کا یہ طرزِ عمل دائرہ انسانیت سے خارج ہے:

> "Immediately after World War II, then, the Orient became, not a broad catholic issue as it had been for centuries in Europe, but an administrative one, a matter of policy. Enter the social scientist and the new expert, on whose somewhat narrower shoulders was to fall the mantle of orientalism. In their turn, as we shall see, they made such changes in it that it became scarcely recognizable. In any event, the Orientalists took over the attitude of cultural hostility and kept them."40

اس کے برعکس ایک بیانیہ اور جانچ کے لیے ملتا ہے جو استشراق کی بابت مجموعی طور پر ہمدردانہ اور مشفقانہ رویہ رکھتا ہے، اور اس سارے معاملے کو اک جدا نظر سے دیکھتا ہے۔ ان کے نزدیک استشراق، بے سبب اور تعصب کی بنیاد پر ہدفِ ملامت بنایا گیا۔ مستشرقین کی بہترین اور مخلص کاوشوں کو بلاضرورت مشکوک بنا کر پیش کیا گیا اور اس کے نتیجہ میں برپا ہونے والی عظیم معاشی اور تہذیبی ترقی نظر انداز ہوئی ۔ نہر سویز کی تعمیر کا معاملہ ہو یا غیر متمدن عرب اور ہندوستان کو مہذب بنانے کا جوکھم۔ اس ساری کدوکاوش کو صرف اس لیے مسترد کر دیا جائے کہ یہ صرف مغرب کی دین تھی اور اگر مغربی تہذیب برتر تھی تو اس پر ہاتھ ملنے یا تنفر برتنے سے حقائق تبدیل نہیں ہو سکتے۔ مشرق کو

مغرب کے علمی و سائنسی تفضّل، حقیقت پسندی اور برتر انسانی معیارات کا احسان مند ہونا چاہیے اور جو سماجی و معاشی فیوض مغرب کی سرپرستی میں حاصل ہوئے انھیں برملا تسلیم کیا جانا چاہیے۔ یہی اعلیٰ ظرفی ہے؛ اپنی کجیوں، کوتاہیوں اور محرومیوں کا ذمہ دار، مغرب کو ٹھہرانا، کسی بھی طور مناسب نہیں:

"The accuser in this trial, needless to say, is now the East itself, which from a passive object of history and study has revived as a subject, which seeks with profound travail its own soul and does not recognize it in its past or present in the mirror of European orientalistic investigation. Nor does it recognize the accuracy of the vision nor the honesty of the statements of this European and Western science, which for three centuries has been concerned with it. It tends precipitately to make of European orientalism a scapegoat for its own problems, anxieties and pains."41

آخر میں ہم ان جرمن مستشرقین کی بابت گفتگو کریں گے جن کی جملہ کاوشیں، اردو زبان وادب سے جڑی ہوئی ہیں۔ اقبالؔ نے پیامِ مشرق کے دیباچہ میں بہت سی اہم و غیر اہم شخصیات کا تعارف پیش کیا جو کسی نہ کسی حوالہ سے اردو اور فارسی زبان وادب سے وابستہ تھیں اور اقبالؔ جرمن استشراق کو باقاعدہ ایک تحریک کے طور پر پیش کرتے ہیں، گو اس بابت ان کی ذاتی رائے اس قدر حوصلہ افزا نہیں اور خود وہ بھی استشراق کے بارے میں شبہات کا اظہار کرتے ہیں البتہ جرمن استشراق کے بیشتر گوشے اِن کے لیے طمانیتِ قلب کا باعث ہیں اور خاص طور سے گوئٹے کے ذکر میں کسی قدر جذباتی نظر آتے ہیں:

" ۱۸۱۲ء میں فان ہیمر نے خواجہ حافظ کے دیوان کا پورا ترجمہ شائع کیا اور اسی ترجمے کی اشاعت سے جرمن ادبیات میں مشرقی تحریک کا آغاز ہوا۔ گوئٹے کی عمر اس وقت ۶۵ سال کی تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جبکہ جرمن قوم

کا انحطاط ہر پہلو سے انتہا تک پہنچ چکا تھا۔۔۔۔یورپ کی عام ہنگامہ آرائیوں سے بیزار ہو کر اس کی بے تاب اور بلند پرواز روح نے مشرقی فضا کے امن و سکون میں اپنے لیے ایک نشیمن تلاش کر لیا"۴۲

جیسا کہ پہلے اس امر کی وضاحت ہو چکی ہے کہ جرمن استشراق کی غایت، روحانی اور رومانوی لذت کا حصول تھا اور یہ یکسر طور پر برطانوی اور فرانسیسی استشراق سے جدا ،اِک منہاج تھا کہ اس مطالعے اور کسبِ فیض میں معاشی بندوبست یا کسی الوہی مقصد کی تمامی کا اہتمام نہ تھا، اور وہ اس لیے بھی کہ مشرق میں جرمنی کی کوئی کولونی (COLONY)نہ تھی ،اسی لیے اسے ایک بسیط اور کشادہ منظر کے طور پر دیکھا گیا۔برطانیہ اور فرانس کی کولونائزیشن کے خلاف اور مشرق کی حقانیت یا سچائی کو ایک بلیغ استعارہ جان کر خاور شناسی کی داغ بیل ڈالی گئی۔یہ ایک نوع کی مغربی کلاسیکیت اور عیسائیت کے تسلیم شدہ آفاقی ضوابط کے خلاف ایک مزاحمت تھی یعنی مغرب جو ہر اعتبار سے،خود مکتفی ہونے کا داعی تھا یہ ایک طرح سے اُس کا بطلان تھا۔اور جب لسانیاتی پردوں کے عقب میں تاک جھاک شروع ہوئی تو عقائد متزلزل ہو گئے اور یوں عیسائیت کا کائناتی رنگ ارنسٹ رینان اور یولیس ولہاسن نے گدلا دیا اور ان کا یہ ادّعا سامنے آیا کہ بائبل کی زبان الہامی نہیں۔غرض لسانیات کو ایک انتہائی خطرناک شعبہ علم کے طور پر لیا گیا جسے جرمن اصلاحات کے نتیجہ میں، انیسویں صدی کے آغاز میں پذیرائی حاصل ہوئی اور ریاستی معاونت کے نتیجہ میں، تصورِ ریاستِ الٰہیہ کو بے دخل کیا گیا۔جرمن استشراق کی ابتدائی صورت اور اس کے فکری تفاوت کی بابت سوزین مرچنڈ(SUZANNE MARCHAND)کی رائے اہمیت کی حامل ہے:

“With Herder and Friedrich Schlegel, a kind of orientalist primitivism came into vogue; but this only survived by dint of being taken up into the new disciplines of Sanskrit philology and Semitic literature. Institutions fix norms and career paths, and the appointment of Sanskrit philolo- gists A. W. Schlegel and Franz Bopp at the universities of Bonn and Berlin in 1818 and 1821 set a lasting pattern. While English, French, and Dutch orientalists of this generation made the Orient a career by going there, as officials

or travelers, German orientalists in this period made the Orient a career by becoming academics, and especially by becoming scholars of Sanskrit, Sumerian, and other safely dead orien- tal languages."43

اور بات صرف یہیں تک نہیں رہتی بلکہ جرمن قیصر ولہلم دوم مشرق پسندی میں اس حد تک بڑھ جاتے ہیں کہ اپنے زمانہ جلاوطنی میں،Leo Frobenius کو ۱۹۲۸ء میں لکھے ایک خط میں وہ اس شے کو تسلیم کرتے نظر آتے ہیں:

"We are Orientals [Morgenldnder], and not westerners [Abendldnder]."44

اقبالؔ نے جن دیگر افرادو شخصیات کو اختصار سے گفتگو کا حصہ بنایا ان میں ہرڈر، پلاٹن، روکرٹ اور بوڈن سٹاٹ سے ڈومر، ہر من سٹال، لوشکے اور فان شاک شامل ہیں۔ بوڈن سٹاٹک کی بابت ذیل کا اقتباس دلچسپی سے خالی نہیں:

"گوئٹے کے بعد مشرقی رنگ کا سب سے زیادہ مقبول شاعر بوڈن سٹاٹ ہے جس نے اپنی نظموں کو مرزا شفیع کے فرضی نام سے شائع کیا۔ یہ چھوٹا سا مجموعہ اس قدر مقبول ہوا کہ تھوڑی ہی مدت میں ۱۴۰ دفعہ شائع ہوا۔ اس شاعر نے عجمی روح کو اس خوبی سے جذب کیا ہے کہ جرمنی میں مرزا شفیع کے اشعار کو لوگ دیر تک فارسی نظم کا ترجمہ تصور کرتے رہے"۔۴۵

ڈاکٹر آنیماری شمل نے اپنی کتاب GERMAN CONTRIBUTIONS TO THE STUDY OF PAKISTANI LINGUISTICS میں بہت سے اہم جرمن مستشرقین کا تعارف پیش کیا اور متعدد ایسے ادبی مغالطے جو شخصیات اور کتب کے حوالے سے اردو ادب کی تواریخ اور موضوعاتی کتب میں موجود ہیں کی بابت گرہ کشائی کی ہے، مثلاً جنوبی ہندوستان میں وارد ہونے والے جرمن مشنری بینجمن شوئی زا(BENJAMIN SCHULTZE) کی بابت گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ یوں تو ۱۷۹۶ء میں شائع ہونے والی ہندوستانی زبان کے حوالہ سے گل کرسٹ کی عملی گرائمر(Grammar of the Hindoostanee Language) کا ایک خاص شہرہ ہے تاہم اس سے بھی قبل جے۔ فرگوسن نے رومن ہندسوں میں ہندوستانی زبان

کی گرائمر، ڈکشنری آف ہندوستانی(DICTIONARY OF HINDOTANI) کے ابتدائیہ میں پیش کی، جو لندن سے ۱۷۷۳ء میں شائع ہوئی، اور شوئی زا کو گل کرسٹ اور فرگوسن پر زمانی تقدم کچھ اس طرح سے حاصل ہے کہ انھوں نے عہد نامہ جدید کا ترجمہ ۱۷۴۸ء میں مکمل کیا اور اردو گرائمر کے پہلے لکھاری کی حیثیت سے اپنی شناخت رقم کرائی۔ تمام یورپ کے مشنریوں کی آسانی کے لیے یہ گرائمر لاطینی زبان میں، ۱۷۴۸ء میں لیپزی(LEIPZIG) سے شائع ہوئی۔ اس کی افادیت اور شوئی زا کو نظر انداز کرنے کی بابت ذیل کا اقتباس اہمیت کا حامل ہے:

> "Benjamin Schultze was almost forgotten by the scholars of Urdu; it was high time to revive his memory as the first successful writer on Urdu grammar. Schultze' pioneer work was finally published in its English text with an Urdu translation and copious notes in 1977 by the Board of Advancement of Literature, Lahore: A Grammar of Hindoostani Language, by Benjamino Schulzino, edited and translated by Dr. Abu Lais Siddiqi."46

شوئی زا کے بعد جرمن استشراق کے ضمن میں یوں تو بہت سے افراد کے نام لیے جاسکتے ہیں تاہم گوئٹے اور ہرڈر، جن کا سرسری ذکر پہلے ہو چکا ہے کے بعد انتہائی اہمیت کی حامل شخصیت آلوا شپرنگر (۱۸۹۳ء۔۱۸۱۳ء) کی ہے اور اگر اس کے کارہائے نمایاں کو جانچا جائے تو ولیم جونز کے بعد اٹھارہویں صدی عیسوی میں یہ منفرد مستشرق ہیں، جن کے ہاں مختلف النوع پیشہ ورانہ امور کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ کئی اور طرح کے علمی و فکری مشاغل نظر آئیں گے۔ غرض ان کی جملہ کاوشیں دیکھ کر ذہن کسی بھی طور یہ ماننے کو تیار نہیں ہوتا کہ یہ فردِ واحد کی زندگی کے معمولات تھے: دہلی کالج کی پرنسپل شپ، مخطوطات اور مسودات کی جانچ اور پھر اُن کی فہارس تیار کرنا، گرائمر کا لکھنا، چھاپے خانے کا اہتمام اور ٹرانسلیشن سوسائٹی کا قیام (اس سے امکاناً سر سید احمد خان نے شہ پاکر غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کا قیام عمل میں لایا ہوگا)، اردو و فارسی کا مترجم اور فقہ اسلامی کا ممتحن ہونا، کلکتہ مدرسہ، محمڈن کالج ہوگلی کی سربراہی اور

فورٹ ولیم کالج میں مشرقی زبانوں کی جانچ کے حوالہ سے ذمہ داریوں کو نبھانا، لکھنؤ لائبریری کا تفصیلی مطالعہ، ۱۸۴۸ء سے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی سیکرٹری شپ، صحیح بخاری کی اشاعت کے ساتھ ساتھ ہندوستانی کتب کی فہارس(BIBLIOTHECA INDICA)، اودھ لائبریری کا کیٹلاگ اور سیرت نبوی ﷺ پر ان کی کتاب بعنوان Leben und Lehre des Muhammad برلن(۶۵۔۱۸۶۱ء) سے شائع کرانا(گو کہ اس کتاب میں ان سے نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی کی بابت فروگزاشتیں بھی ہوئیں) یہ سب جستجو وتفحص ایک مستشرق کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں؛ اگرچہ ان کی جملہ مساعی، مالی منفعت کا چولا پہنے ہوئے تھی اور ان کی مقبولیت کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب ان کی والدہ آسٹریا (وی آنا) سے خط لکھتی ہیں تو بیٹے کا نام ALOY SPRENGER لکھ کر ایڈریس کی جگہ صرف ہندوستان لکھتی ہیں اور جب ڈاک کے ایک ذمہ دار نے نامکمل ایڈریس کی جانب توجہ مبذول کرائی تو جواباً ان کی والدہ نے کہا کہ ہندوستان میں میرے بیٹے کو ہر ایک جانتا ہے۔ اردو خدمات کے ضمن میں ان کی کاوشوں کی بابت ذیل کے دو اقتباسات لائقِ توجہ ہیں:

"In the field of Urdu studies, Sprenger's catalogue of Oudh library is a masterpiece. Its importance is all the greater since barely any of the manuscripts survived the catastrophes of 1857, so that for quite a number of works his notes are the only available source. On pages 195-306, Sprenger gives an account of 1512 poets who wrote in Rekhta of Urdu, and his biographical account was considered so important by the historians of Urdu literature that it was translated into Udru by Maulana Tufail Ahmad in 1932 and published in 1943 in Allahabad by the Hindustani Academy as Yadgar-i-Shu'ara".47

"Among the nearly 2000 precious manuscripts which Sprenger sold to the Berlin Staatsbibliothek, there were 96 Hindustani manuscripts. It seems that greater part of them was lost during the war or the partition of Germany; the number of the

Sprenger Urdu works in the Staasbibliothek Stiftung Preussischer Kulturbesitz in West Birlin in now 35, out of a total of 54 known Urdu manuscripts in all Western German libraries...".48

انیسویں صدی ہی میں ایک اہم پیشرفت جرمن زبان میں ترجمہ کے حوالہ سے سامنے آئی۔ امانت لکھنوی کی 'اندر سبھا' پہلی بار مذکورہ زبان میں ترجمہ ہو کر دادِ سخن پاتی ہے۔ فریڈ غش خوزن(FRIEDRICH ROSEN) کی پی۔ ایچ ڈی کا یہ مقالہ بعنوانDie Indarsabha des Amanat ۱۸۹۱ء میں سامنے آتا ہے؛ اور اس کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس مقالے کے فوراً بعد ہیوبا جینسن(HUBERT JANSEN) امانت کی واسوخت پر کام کرتے ہیں اور اپنے ڈاکٹورل مقالے بعنوان ZUR VERSKUNST DES URDU کو ۱۸۹۳ء میں پیش کرتے ہوئے اسے فریڈ غش خوزن کے نام معنون کرتے ہیں۔ امانت کے اس ترجمے کی اس قدر پذیرائی ہوئی کہ جرمنی میں اسے منقلب (ADAPT) کر کے پہلی بار ۱۹۰۴ء میں اسٹیج کیا گیا۔ فریڈ غش خوزن کا تعارف شمل نے کچھ یوں پیش کیا:

"A young orientalist who had just joined the German Foreign Service. Born on August 30, 1856 in Leipzig, he was the son of Georg Rosen (1820-1891)......in 1925 he (Friedrich Rosen) contributed an article entitled Die Literaturgeschichte des Urdu to a manual of history of Literature...Rosen begins his thesis by giving the reason for his choice of this topics: The modern Hindustani theatre, particularly drama in the Urdu language, is a field on which no European investigator has ever set foot".49

فریڈ غش خوزن معروف جرمن مستشرق اور سفارت کار گیا خوزن(GEORG ROSEN 1821-1891) کے بیٹے تھے جنھوں نے مولانا روم کی مثنوی کا ایک حصہ کامیابی سے جرمن زبان میں ترجمہ کیا۔

پاکستانی زبانوں کے حوالہ سے اہم نام ارنسٹ ٹرمپ(ERNEST TRUMPP 1828-1885) کا ہے جنھوں نے مقامی زبانوں کی بابت غیر معمولی صلاحیتوں کا اظہار کیا۔ بنیادی طور پر وہ ایک مشنری تھے اور الوہی مقصد لیے ہندوستان وارد ہوئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی اس یقین دہانی کے ساتھ کہ ان کی جملہ تحقیقی، علمی کاوشوں کو شائع کیا جائے گا، انھوں نے بہت کم عرصہ میں مختلف زبانیں سیکھیں اور کچھ عرصہ لاہور (۱۸۷۱۔۱۸۷۰ء) میں بھی گرنتھ کا ترجمہ کرتے ہوئے گزارا:

"Who was this man whose name is most important among German Philologists in the field of Pakistani linguistics, and who has been called with full right by his successor on the chair in Munich University, Friedrich Homme, " the true founder of neo-Indian philology"....His accuracy and great talent for grammatical problems attracted the attention of the church mission society. This institution asked him to go to India for an intense study of modern languages and to compose their grammars and dictionaries for use by future missionaries....In the summer of 1854, Trump left for India".50

۱۸۹۳ء میں آ۔ سائیڈل(A. SEIDEL) نے اردو گرائمر کو پیش کیا جو اگرچہ انتہائی مختصر تھی تاہم اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس سے اگلے ہی برس شوئی زا کی گرائمر بعنوان GRAMMATIK DEC HINDUSTANISCHEN SPRACHE لیپ زی (Leipzig) سے شائع ہوئی جو بقول شمل، نایاب ہے۔ اسی طرح انھوں نے ایک اور اہم گرائمر کی جانب ہماری توجہ مبذول کرائی جو بدقسمتی دوسری جنگِ عظیم کے اختتامی سال میں شائع ہوئی اور اسی ہنگام میں گم ہو کر رہ گئی۔ او شپیز(O.SPIES) کی اس گرائمر کی بابت شمل کی رائے کچھ یوں ہے:

"During World War II the interest in Hindustani grew in Germany for political reasons, and the study of this language was practiced in some special military units. It was utterly bad luck that the first larger German grammar of Urdu was published at a time when next to nobody took notice of this new venture: O. Speis- E. Bannerth, Lehrbuch der Hindustani-Sprache, appeared in Leipzig 1945, at the very end of World War II. This is one reason why this grammar is almost unknown".51

امراؤ جان ادا کا ترجمہ ۱۹۷۱ء میں سامنے آیا۔ اسے ارسلا غاستن ڈبز(URSULA ROTHEN-DUBS)نے پیش کیا اور افسانوں کی بابت ایک مجموعہ ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا، اس کے مرتب اٹالیاندا(ITALIAANDER)تھے۔

استشراق کے ضمن میں یہ اجمالی جائزہ جو ایک سے زائد بیانیوں کو محیط ہے بہت سے اہم مستشرقین کی بابت کسی قدر آگاہی فراہم کرتا ہے اور یقیناً اس شعبۂ علم کا دائرہ آج بھی اتنا ہی وسیع ہے جتنا انیسویں صدی میں متصور تھا۔ غرض اس محاظرہ میں ہم نے یہ کاوش کی کہ تحریک استشراق کے مثبت اور منفی پہلوؤں کے مع، اس کی غرض وغایت اور آغاز کے حوالہ سے مختلف افکار پیش کیے جائیں۔ تاہم تحقیق کا سفر کبھی مکمل نہیں ہوتا؛ تشنگی اور عدم تکمیل ہمیشہ اس کا خاصا رہی ہے۔

حواشی بابِ اوّل

۱: علی رضا نقوی، سید، ڈاکٹر۔ فرھنگِ جامع، فارسی بہ انگلیسی واردو۔ اسلام آباد: مرکزِ تحقیقاتِ ایران و پاکستان، اشاعتِ سوم ۲۰۱۱ء ص

۲: محمد کرم شاہ، الازہری، پیر۔ ضیأالنبی ﷺ (جلد ششم)۔ لاہور: ضیأالقرآن پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء ص ۱۲۰

3: Mikula Maja. Key concepts in cultural studies. England: Palgrave macmillan, p.144.Print

4: http://www.odsg.org/Said_Edward(1977)_Orientalism.pdf p.19

۵: محمد کرم شاہ، الازہری، پیر۔ ضیأالنبی ﷺ (جلد ششم) ص ۱۱۹

۶: عبدالقادر جیلانی، ڈاکٹر۔ اسلام، پیغمبرِ اسلامؐ اور مستشرقینِ مغرب کا اندازِ فکر۔ لاہور: کتاب سرائے، ۲۰۱۰ء ص ۲۰

۷: قرۃالعین حیدر۔ آخرِ شب کے ہمسفر۔ لاہور: چودھری اکیڈمی، س۔ن، ص ۵۲

۸: تبسم کاشمیری، ڈاکٹر۔ اردو ادب کی تاریخ، ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء ص ۴۸۷

9: Said, Edward W. Orientalism. Harmondsworth: Penguin, 1995. P.74. Print

10: http://www.odsg.org/Orientalism.pdf.p.56

11: Said, Edward W. Orientalism.p.289

12: Macfie, A L. Orientalism: A Reader. Edinburgh: Edinburgh University Press, 2000. P.58. Print

13: : http://www.odsg.org/Orientalism.pdf.p.49,50

۱۴:عبدالقادر جیلانی،ڈاکٹر۔اسلام،پیغمبرِ اسلامؐ اور مستشر قینِ مغرب کا اندازِ فکر۔ص ۱۷۰

۱۵:ایضاً۔ص ۲۱

۱۶:محمد ثنأاللہ ندوی،ڈاکٹر(مترجم و ملخص)۔علومِ اسلامیہ اور مستشر قین۔لاہور:نشریات،۲۰۰۹ء ص ۷۷

17: Said, Edward W. Orientalism.p.95

18: Burke, Edmund, and David Prochaska. Genealogies of Orientalism: History, Theory, Politics. Lincoln: University of Nebraska Press, 2008.p.10. Print

۱۹:ناصر عباس نیر۔مابعدِ نو آبادیات،اردو کے تناظر میں۔کراچی:اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس،۲۰۱۳ء ص ۱۰۱

۲۰:ایضاً۔ص ۱۱۰۔۱۰۹

21: Said, Edward W. Orientalism.p.75

22: Macfie, A L. Orientalism: A Reader. Edinburgh: Edinburgh University Press, 2000. Print. p.34

23: Ibid.p.32

24: ibid.p.5

25: Said, Edward W. Orientalism.p.51

26: Burke, Edmund, and David Prochaska. Genealogies of Orientalism: History, Theory, Politics. p.10

۲۷:رضیہ نور محمد،ڈاکٹر۔اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ۔لاہور: مکتبۂ خیابانِ ادب،۱۹۸۵ء ص۱۴۹۔۱۴۸

۲۸:ناصر عباس نیر۔مابعدِ نو آبادیات،اردو کے تناظر میں۔ص۱۲۰

۲۹:رضیہ نور محمد،ڈاکٹر۔اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ۔ص۱۴۹

30: Said, Edward W. Orientalism.p.99

31: Ibid. 122

32: Ibid. 127

۳۳:رضیہ نور محمد،ڈاکٹر۔اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ۔ص۱۶۶

۳۴:ایضاً۔ص۱۶۸

۳۵:ایضاً۔ص۲۶۰

۳۶:ایضاً۔ص۲۹۳

37: Said, Edward W. Orientalism.p.246

38: Ibid.p.258

39: Ibid.p.270

40: Ibid.p.290

41: Macfie, A L. Orientalism: A Reader. p.81

۴۲:احمد جاوید(تسہیل وفرہنگ)۔پیامِ مشرق(علامہ محمد اقبال)۔لاہور:اقبال اکادمی پاکستان،۱۹۹۲ء دیباچہ(ح)

43: Marchand, Suzanne. "German Orientalism and the Decline of the West." Proceedings of the American Philosophical Society. 145.4 (2001): P. 470. Print

44: Ibid.p. 472

۴۵:احمد جاوید (تسہیل و فرہنگ)۔پیامِ مشرق (علامہ محمد اقبال)۔دیباچہ (ی)

46: Schimmel, Annemarie. German Contributions to the Study of Pakistani Linguistics. Hamburg, 1981.P.47. Print

47: Ibid.p.64

48: Ibid.p.65

49: Ibid.p.74, 75, 77

50: Ibid.p.84, 87

51: Ibid.p.81, 82

بابِ دوم

آنیماری شمل: حیات اور شخصیت

این میری۔ شمل کا درست جرمن تلفظ "آنیماری شمل" ہے۔ موصوفہ ۷ اپریل ۱۹۲۲ء، اے فورٹ (ERFURT) کے ایک کلینک میں، جو اِس وقت وسطی جرمنی کی ریاست تھورینگیا (THURINGIA) کا دارالخلافہ ہے میں پیدا ہوئیں۔ ان کا تعلق پرشن (PRUSSIAN) گھرانے سے تھا جو کبھی یورپ کا وسطی علاقہ کہلاتا تھا، اوراب پولینڈ، روس اور لتھوینیا میں منقسم ہو چکا ہے۔ اپنے اس تعلق کو شمل فخر سے کچھ یوں بیان کرتی ہیں:

"We are a typically 'Prussian' family. Duty and absolute punctuality were the order of the day."2

اے فورٹ ایک خاص نوع کا علمی وادبی جغرافیہ رکھتا تھا۔ شمل قدرے لطف سے اپنی اس جنم بھومی کا ذکر کرتی ہیں:

"In central Germany–a town that boasted a number of gothic cathedrals, beautiful town and was a center of horticulture. The great medieval mystic Meister Eckhart had preached there; Luther had taken there his vow to become a monk and spent years in the Augustine monastery in its walls; and Goethe had met Napoleon in Erfurt, for the town's distance from the centers of classical German literature, Weimar and Jena, was only a few hours by horseback or coach."3

اکلوتی اولاد ہونے کے سبب، بے حد لاڈ پیار سے پرورش ہوئی۔ گھر کا ماحول ایک نوع کی فکری اور مذہبی کشادگی لیے ہوا تھا اور اس کی بڑی وجہ ان کے والدین کی وہ وسیع المشربی تھی جس نے آئندہ کے لیے نہ صرف ان کے افکار و نظریات کو جلا بخشی بلکہ ان کی خاور شناسی اور اسلامی افکار و ادب سے وابستگی کو ایک مہمیز عطا کی۔ گھر پر باقاعدہ ادبی نشستوں کا انعقاد ہوتا تھا اور اس کے لیے دن مقرر تھے، اور یوں بھی شمل کو گھر اور گھریلو مشاغل میں زیادہ لطف آتا۔ گھر کے اس ماحول میں دیگر مذاہب کے لیے احترام اور انسانی اقدار کو برابر اہمیت دینے کی ایک تہذیب موجود تھی۔ تنگ نظری، تعصب اور نسل پرستی ایسے منفی رجحانات کے لیے ان کے داخلی ماحول میں کوئی جا نہ تھی، اور یہ آفاقی رویّے ایک ایسے عہد میں پنپ رہے تھے، جب پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۹۔۱۹۱۴ء) کا خاتمہ ہو چکا تھا اور یورپ بشمول جرمن دوسری جنگ عظیم (۱۹۴۵۔۱۹۳۹ء) کے لیے پر تول رہا تھا۔ احیائے قومیت اور مذہبی منافرت عروج پر تھی ایسے میں خانگی ماحول کو انسان دوست بنانے کا سہرا، والدین کے سر ہے جو نہ تو نازی عہد کی یہود دشمنی کا عکس کہیں پڑنے دیتے ہیں اور نہ قومی افتخار کو بے جا اہمیت دیتے ہیں یہاں تک کہ فرانسیسی ادب پڑھنے کے لیے گھر ہی پر ایک دن مخصوص تھا۔ والدہ کا تعلق پروٹیسٹنٹ (PROTESTANT) جہاز ران گھرانے سے تھا، اور اس ضمن میں بہت سی کہانیاں خاندان میں زبان زدِ عام تھیں جبکہ والد محکمۂ ڈاک سے وابستہ تھے۔ شمل اپنے والدین کو متعدد حوالوں سے مثالی نمونہ سمجھتی ہیں:

"Papa...had wished for a girl and was the most tender father one could imagine. It was said that he changed my nappies, and in his free time he was a great playmate to me and was full of humour......

For Mama too, I was the child of her dreams. She would have loved to have many more children, but by the time I was born she was already thirty fife years old. I therefore, became the object of her intense love."4

الوہیت یا روحانیت سے مخلصانہ وابستگی دیگر مذاہب و ادیان کے لیے بھی ایک نوع کی تفہیمی گنجائش کا سبب بنتی ہے۔ شمل کا اسلام کی بابت جھکاؤ اس سبب نہ تھا کہ وہ اپنے مذہب سے بے زار تھیں یا پھر انھیں اسلام، عیسائیت سے بہتر

مذہب لگا بلکہ وہ جس ماحول میں پروان چڑھیں اور جو نفسی تربیت والدین نے سرانجام دی، اس میں دیگر مذاہب وادیان کے لیے احترام موجود تھا، اور پھر یہ کہ مذہب شمل کے لیے محض عبادات کو بجالانے اور رسومات کو ادا کر دینے کا نام نہ تھا بلکہ ایک بھرپور سماجی اور تہذیبی تعامل تھا جو متعلق سماجی سانچے یا معاشرے میں سرایت کر جاتا ہے اور پھر یہ کہ انسان ہمیشہ نبرد آزما تمدنی ماحول سے متاثر ہوتا ہے اور اس کا سوچنا سمجھنا اور زندگی کرنے کا ڈھنگ وہ انھیں ضابطوں قرینوں سے حاصل کرتا ہے جن سے وہ متصادم رہتا ہے۔ یہ معاشرتی ماحول (Milieu) کئی طرح سے فرد کو متاثر کرتا ہے اور پھر یہ ایک حد تک فرد پر منحصر ہے کہ وہ اس کے ادنیٰ و اعلیٰ، اچھے برے اوصاف میں سے کیا چناؤ کرتا ہے اور کن سے احتیاط برتتا ہے۔ خیال یا آئیڈیا ذہنِ انسانی کو متعدد زاویوں سے متاثر کرتا ہے لیکن درپیش معاشرتی ماحول ہمیشہ ایک جاندار نفسیاتی مفروضہ قائم رکھتا ہے جس سے کاملاً انحراف یا اجتناب آسان نہیں اور انسان اسی بنے بنائے سانچے یا ضابطے میں ڈھل کر زندگی گزارنا آسان سمجھتا ہے اور یہی سبب کہ ہر مذہب و مسلک کو ماننے والے لاکھوں، کروڑوں میں ہیں اور نسل در نسل وہ اپنے عقائد و نظریات سینے سے لگائے دنیا سے چلے جاتے ہیں اور قریباً اپنے ہی جیسے ماننے والوں کو چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ بیک وقت انسانی المیہ بھی ہے اور آسودگی بھی۔ انسانی معاشروں میں موجود انتشار وافتراق کو یہی طرزِ عمل جہاں سمیٹتا ہے وہیں ہٹ پر یا ایک ڈگر پر قائم رہنے کے سبب ایک گدلے پانی کی طرح باس بھی مارتا ہے۔ ایک مسلک سے دوسرے مسلک یا ایک مذہب سے دوسرے مذہب کو منتقلی کی مثالیں کم و بیش موجود رہتی ہیں لیکن مجموعی طور پر معاشرے کا ثقافتی کینڈا برقرار رہتا ہے اور یوں بھی اب عقائد و نظریات کے مابین اس قدر خلیج واقع ہو چکی ہے کہ حق و نصرت کے بہت سے اکناف دھندلا چکے ہیں اور لوگ تذبذب کی حالت میں رہنے کی بجائے اپنے جدی اور موروثی تصورات کو اختیار کرنے میں عافیت محسوس کرتے ہیں۔ شمل کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے نہ صرف اپنے عقیدے سے مخلصی برتی بلکہ دینِ اسلام کی اصل روح کو پانے کی ہر ممکن جستجو کی اور اس مساعی کاملہ میں وہ جن فکری زخرفات کو پیش کرتی ہیں ان کا مثیل تلاش کرنا سہل نہیں، اور اس کا ایک بڑا سبب ان اساتذہ کی رفاقت بھی ہے جن کی معیت اور رہنمائی میں شمل کا فکری جغرافیہ کسی ایک خطے اور علاقے تک محدود نہیں رہتا۔ مشرق اور اسلام سے قربت کی ایک وجہ اساتذہ کی علمی تربیت تھی جس کا اعتراف شمل کچھ یوں کرتی ہیں:

"As a child however, I also admired figures like Krishnamurti, and the mystical piety of Islam began to fascinate me through Friedrich Ruckert's translations of Rumi."5

فریدرچ روکرت(Friedrich Rucket) کا حوالہ شمل کی تحریر و تقریر میں تواتر سے موجود ہے اور وہ ان کے لیے مثالی شخصیت تھے:

"If Friedrich Ruckert (1788-1866) were still alive he would certainly deserve the Peace Prize, as his motto was: "Weltpoesie (global poetry) alone is Weltversohnung (leading to the reconciliation of worlds)."During his lifetime, he produced thousands of masterly poetical translations from dozens of languages and knew that poetry, "the mother tongue of the human race," connects people as it is part of all civilizations."6

فریدرچ روکرت کون تھے ؟ اور کیوں کر شمل کے لیے اہمیت رکھتے تھے اور ہندوستان سے ان کا تعلق کس نوع کا تھا اس بابت کسی قدر صراحت سے اکرام چغتائی کچھ یوں گویا ہیں:

"As a student of Josef von Hammer-Purgstall (1774-1856), Rückert's talents were employed in translating the poetic treasures of Arabic and Persian languages. On the recommendation of Hammer he also translated the seventh part of Haft Qulzum (Seven Seas), a voluminous dictionary of Persian language that was compiled by Ghaziuddin Haydar (1819-1827), King of Awadh, and published from Lucknow in 1822."7

اور روکرت ہی ان کے پسندیدہ ترین شاعروں میں سے ایک شاعر ہیں۔ اپنے عہد کا ایک نابغہ خاور شناس، جس کے فارسی اور عربی تراجم سے شمل انتہائی متاثر تھیں۔۸

شمل جس کا بچپن عیسوی مذہبی تربیت سے جڑا ہے اور باوجود اس کے کہ اسلام جسے مغرب میں عموماً منفی زاویوں سے پرکھا جاتا ہے، سے ایک خاص نوع کا تعلق قائم کرنا، یہ معاملہ ذہنِ انسانی کو متحیر کرتا ہے۔ شمل کو صوفی کہلانا پسند تھا۔ اسلام سے اک گونہ انسیت کے باوجود آخری سانس تک، اپنے موروثی عقیدے اور مسلک سے وابستہ رہیں اور اس کی بڑی وجہ ان کی وہ مذہبی نشوونما تھی جس کا ذکر ان کی خود نوشت ORIENT AND OCCIDENT(MY LIFE IN EAST AND WEST) میں موجود ہے اور دوسرے، ان کا اپنے مذہب اور مسلک سے وابستہ رہنے کا جواز یہ تھا کہ وہ خود کو اپنی والدہ کا عقیدہ ترک کرنے پر آمادہ نہ کر سکیں۔ مذہبی تربیت کی بابت ذیل کا اقتباس اہم ہے:

> "We were well versed in the Bible. We mastered the words and figures of the Old Testament; after all, they were a part of our cultural heritage. How could one otherwise, understand European painting and the innumerable mentions of Old Testament figures and events in literature?....We- from grandma down to me- knew the New Testament by heart; we used its words in common word games. It was Lutheran translation which was dear and near to our hearts."9

والدہ، اینا(ANNA) زندگی کے نشیب و فراز میں ہر طرح سے معاون رہیں اور اس کی بڑی وجہ ان کا شمل کی بابت حساس ہونا اور ایک طویل عمر پانا تھا۔ وہ بہت سے مواقعوں پر شمل کو نہ صرف رہنمائی فراہم کرتی تھیں بلکہ گاہے گاہے ان کی جملہ وابستگیوں کا امتحان بھی لیتی تھیں اور یہ چاہتی تھیں کہ شمل کا معروضی انداز فکر متاثر نہ ہونے پائے۔ وہ شمل کے ساتھ مختلف جگہوں پر ساتھ رہیں، بہت سے سفر اکھٹے کیے اور اس بے حد قربت کا ایک بڑا سبب دونوں کا مجرد زندگی گزارنا تھا کہ شمل کے والد کی ابتدائی موت کے بعد اینا دوسری شادی نہیں کرتی اور خود شمل کے ہاں بھی شادی کا لفظ بھولا بسرا ہی رہا۔ اس بابت گفتگو کے بیشتر پیرائے تشنگی رکھتے ہیں البتہ شمل کے والد پال(PAUL) دوسری جنگِ عظیم کے اواخر میں جرمن سرکار کی جانب سے جنگ میں زبردستی جھونک دیے جاتے ہیں اور نتیجتاً پال کسی ہتھیار کو تھامے بغیر روسی فوجیوں کے ہاتھوں ہلاک ہو جاتے ہیں۔ ایسی محبت کرنے والے والد جن کی یادوں کو شمل نے تمام عمر سینے سے لگائے رکھا اور جن کی بابت گفتگو کرتے ہوئے شمل کی تحریر کھل اٹھتی

ہے؛ایک اندوہناک عسکری مہم میں جاں گنوا بیٹھتے ہیں اور شمل کو عمر بھر ان کی بے مقصد موت دکھ دیتی ہے۔ اپنے والد کی زبانی وہ کچھ یوں بیان کرتی ہیں:

"We (schimmel father and others) are twenty –six men with tree rifles and they tell us: 'you are the main line of defense.' He died as a soldier on 4th May 1945 near Ketzin."10

شمل کا استشراق کی جانب جھکاؤ اور کم عمری میں عربی زبان سیکھنا یہ ایسے معاملات ہیں جو ان کے قاری کو متعجب رکھتے ہیں کہ کیسے جرمنی کے ایک قصبہ میں رہنے والی مذہبی فیملی کی اکلوتی اولاد، اسلام اور مشرق کی طرف راغب ہوئی، وقیع مطالعات پیش کیے اور دنیا بھر سے خراجِ تحسین وصول کیا۔ آخر وہ کیا اسباب تھے کہ مغرب میں رہنے والی ایک عام سی لڑکی اس قدر ذوقِ جمال رکھتی تھی کہ اس نے بے حد اشتیاق سے نہ صرف اسلام اور مشرق کا مطالعہ کیا بلکہ اس مذہب کی بابت، مغرب میں پائی جانے والی بہت سی غلطیوں اور کجیوں کو رفع کرنے کی جستجو بھی کی۔ اسٹیفن وائیڈنر کی یہ رائے اہمیت کی حامل ہے:

"Even though she constantly emphasized that she was a Protestant, she mediated Islamic culture with the conviction of a dedicated Muslim."11

اس ذوق و شوق کے پس منظر میں جہاں شمل کے ذاتی میلان کو براہِ راست دخل ہے اور جس کی بابت مناسب پیرائے میں گفتگو ناگزیر ہے تاہم چند دیگر وجوہات میں ایک اہم وجہ اس وقت کا سیاسی اور سماجی اختلاط تھا۔ سلطنتِ عثمانیہ، جنگِ عظیم اول میں مرکزی قوتوں جرمنی، آسٹریا اور ہنگری کی معاون تھی اور اس کی پاداش میں خلافت اور سلطنت کو تیاگ چکی تھی۔ اسلام اور ترکوں سے اک گونہ انسیت کا سماجی رویہ پنپ رہا تھا اور یہ بات پہلے کی جا چکی ہے کہ مشرق میں جرمنی کی ایک بھی کالونی (COLONY) موجود نہ تھی اور یوں بھی مشرق سے وابستگی کا ایک رومانوی احساس، انیسویں صدی کے آغاز ہی سے جڑ پکڑ چکا تھا۔ ہیگل، نطشے اس ضمن میں بہت سا اہم کام کر چکے تھے اور یوں سماجی تحرک انسانی معاشرے کے لیے ناگزیر عنصر کی حیثیت سے جڑ پکڑنے لگا۔ جرمن فکر، مغرب سے بیزار، اپنی نشاۃِ ثانیہ کے لیے مشرق کو دیکھ رہی تھی اور مشرق میں خاص طور سے مسلم خلافت سیاسی اور عسکری رفاقت میں

اپنی رہی سہی ساکھ بھی ختم کر چکی تھی، ایسے میں جرمن قوم کے ہاں مسلمانوں کے لیے ایک نوع کا جذبہ انسیت موجود تھا، غرض معاشرتی، سیاسی، علمی اور ادبی سطح پر جرمنی اور ترکی کے مابین بہت سے عوامل کارفرما تھے۔ ایسے میں شمل کا عربی زبان وادب اور اسلام کی طرف راغب ہونے کے امکانات بہر طور موجود تھے اور پھر یہ کہ شمل کے فسٹ کزن الفریڈ (ALFRED) کی پوتیوں نے نہ صرف عربوں سے شادی کی بلکہ اسلام بھی قبول کیا:

"My father never learnt that Alfred named his son after him, Paul; the war cut the connection for years; Paul became an internationally known microbiologist. It was one of the most astounding things that we found each other again in Harvard, that we were accepted on the same day to the American Academy of Arts and Sciences and that both Paul's daughters married Arabs and became Muslims. It was really not my doing. 'it just runs in the genes', Paul used to say laughingly."12

شمل کا کم عمری میں عربی زبان کی طرف راغب ہونا اور پھر ایک عبارت سے اس قدر متاثر ہونا کہ بانیٔ اسلامؐ اور انؐ کے لائے ہوئے دین سے ان کی ایک خاص نوع کی وابستگی قائم ہو جاتی ہے؛ گو کہ آغاز میں انھیں اس شے کا علم نہ تھا کہ عبارت کے اصل معنیٰ کیا ہیں تاہم سنِ شعور پا لینے پر یہ معلوم ہوا کہ عبارت حدیثِ مبارکہ ہے اور معنوی اعتبار سے اس کے ابعاد پھیلے ہوئے ہیں؛ خصوصاً اہلِ معرفت کے ہاں اس ضمن میں باقاعدہ ایک فکری ضابطہ موجود ہے:

"People are asleep, and when they die they awake." Ten years later, when the little girl was 18, she realized that this was a hadith, a word ascribed to the Prophet Muhammad and dearly loved by the mystics and poets in the Islamic world."13

مشرقی زبان سیکھنے کا شوق پندرہ سال کی عمر سے ہوا اور جب یہ معلوم ہوا کہ ینا (JENA) یونیورسٹی میں ایک صحافی ایلن بیک (ELLENBERG) جنھیں افندی (EFFENDI) کے نام سے پکارا جاتا ہے موجود ہیں تو فوراً رابطہ کیا اور ان سے تدریس کا آغاز ہوا:

"Effendi was just the right teacher that an enthusiastic, fifteen years old girl could dream of. He was of the school of Georg Jacob who was more concerned about realities and less about grammar hairsplitting or about theological or

philosophical problems.....Each week there was not only a lesson in grammar but also an introduction into Islamic studies and history; every week he allowed me to take home one or two specialist books, which my parents likewise read with great interest."14

یعنی یہ ایک نوع کی مشترک کاوش تھی جو شمل کے علمی نکھار کے لیے ناگزیر جانی گئی، اور اس کے لیے وہ اپنے والدین اور اساتذہ کا عمر بھر احسان مند رہیں۔ شمل کی موسیقی سے دلچسپی بھی والدین کے سبب تھی۔ گھر پر معروف شعراء کو پڑھا جاتا تھا اور والد کا گنگنانا اور جدید شاعری کو بہ آوازِ بلند پڑھنا یہ سب شمل کے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ عربی زبان سے ان کی انسیت کا معاملہ اتنا غیر معمولی تھا کہ جب قومی خدمت کے ضمن میں انھیں موڈوف(MOORDORF) میں جبری مشقت کا بار اٹھانا پڑ رہا تھا تو ایسے میں ان کے توشہ خانہ سے عربی گرائمر کو غائب کر دیا گیا اس صورتحال کو شمل کچھ یوں بیان کرتی ہیں:

"How can a German girl study Arabic? I immediately asked my parents to send me another Arabic book. In a moment of despair I wrote a letter to Imam of the Berlin mosque who came from Lahore, if he could help me in getting to Lahore and into a Muslim family where I would for one year, improve my Arabic and learn more about Indian Islam."15

اس جبری مشقت کے دوران شمل کو متعدد بار ناخوشگوار صورتحال سے گزرنا پڑا، تاہم عربی زبان اور اسلام سے انسیت کا تعلق برقرار رہا؛ اور جب جبری مشقت کے عوض میں کچھ مشاہرہ ملنے کی صورت بنی تو مولانا رومؒ کی مثنوی خریدی گئی۔

شمل اپنے اساتذہ کی بابت بہت زیادہ محبت اور شیفتگی کا مظاہرہ کرتی ہیں اور یوں لگتا ہے کہ وہ جو کچھ بھی تھیں اپنے اساتذہ کے سبب تھیں۔ شمل کی زندگی، ان کا معاش اور علمی و ادبی سفر یہ سب اساتذہ کی دین معلوم ہوتا ہے اور اس حوالہ سے وہ خالصتاً مشرقی طالبہ معلوم ہوتی ہیں جو استاد کے مقام اور مرتبہ سے بخوبی آگاہ ہو، اور یہ بھی کہ اساتذہ بھی ایسے دستیاب ہوئے جو شمل کو ایک لازوال زندگی دے گئے۔ انسٹ کوہنل(ERNST KUHNEL)، رچرڈ ہاٹ مان(RICHARD HARTMANN)، ہائین غش شیڈر(HEINRICH SCHADER)، فرانز کینل(FRANZ KUHNEL) اور آنیماری فوں گیبیاں(ANNEMARIE VON GABIAN)

ایسی شخصیات جن کی رہنمائی اور نگرانی میں شمل نے تحصیل علم کا درخشاں سفر جاری رکھا۔ ان اساتذہ سے شمل نے اسلام، تصوف، مولانا رومؒ، تُرک معاشرت اور زبان، اسلامی تہذیب و ثقافت اور تاریخ کے مبادی اور گہری رمزیت کے حامل اسباق حاصل کیے۔ ان سب اساتذہ کا تعارف طویل بیانیے کو مقتضی ہے، تاہم اختصار سے ان اساتذہ کا بیان کچھ یوں ہے:

"My entire love, however I bestowed on the lectures of Ernst Kuhnel on Islamic Art. During the winter trimester 1939, shortly before Christmas, I dared approach him and requested his advice....Kuhnel smiled at the seventeen year old: 'Miss Schimmel, forget about the nonsense of sciences! Register for Arabic, Persian and Turkish and for my lectures, and after your Ph.D you will be my assistant'! This sealed my fate."16

انسٹ کوہنل کی اصل پہچان مسلمانوں کے تخلیقی آرٹ سے جڑی ہوئی ہے اور اس ضمن میں خطاطی اور منی ایچرنگ پر انھیں غیر معمولی مہارت حاصل تھی۔ شمل کی خطاطی میں دلچسپی کا صلہ انسٹ کوہنل کو ملنا چاہیے:

"Richard Hartmann who came from the tradition of Tubingen Foundation was an exquisite expert in Islamic history and geography. His publication of The Religion of Islam which appeared as late as 1944 (published again in 1987) is still one of the best introductions, sober and thoughtful."17

اکرام چغتائی کے ہاں ہارٹ مان کی بابت مزید صراحت کچھ یوں ملتی ہے:

"Richard Hartmann (1881-1965), a reputed Orientalist whose works on al-Qushayri, on the early history of Sufism and on some important periods of the political and cultural history of Islam made him widely - known among the scholars."18

ہائین غش شیڈر جنھوں نے گوئٹے پر خاصا وقیع کام کیا، انھیں شمل کچھ یوں خراجِ تحسین پیش کرتی ہیں:

"Hans Heinrich Schader...His tutorials in modern Persian were fascinating; it was not only Persian history from its beginning, which he sometimes unfolded before the rapt listeners from a single word or a grammatical form; no, suddenly we were

with Plato, then in to Chinese poetics, later with medieval music. Many years later he introduced me to T.S.Eliot and the Metaphysical poets. He was much do demanding for normal students: 'Miss Schimmel, close your manuscripts- I want to hear what you know and know not, what you have written." In this way he taught me to speak freely."19

صوفیاء کرام اور بزرگانِ دین کے علاوہ شمل ان ہستیوں کی بھی معترف ہیں جن کے وسیلہ سے وہ تصوف اور اہلِ تصوف کی جانب مائل ہوئیں۔ جن دیگر خاور شناسوں کے نام ان کی تحریروں میں احتراماً لیے جاتے ہیں ان میں فید غشِ ہائلے(Friedrich Heiler)جے۔ایم۔ایس بالیوں(J.M.S Baljon)، فرٹز میاخ(Fritz Meier)، ولیم چٹک(William Chittick)ان کی زوجہ ساچیکو مراتا(Sachico Murata)، مرسیا ایلیاد(Mircea Eliades)اور سوئیڈن نژاد، لتھورین بشپ، تور آندرے(Tor Andrae's) کے نام قابلِ زکر ہیں؛ تاہم وہ شخصیت جن سے شمل کا تعلق عقیدت و مودّت کا ہے اور جن کو وہ ایک صوفی، بزرگ کا درجہ دیتی ہیں اور جنھیں وہ ایڈورسعید کی زبان میں اسلام کا ایک بڑا محافظ سمجھتی ہیں وہ فرانس کے معروف خاور شناس لوئی میسی یوں (Massignon)ہیں جن کا حلاجؒ کی بابت تحقیقی کام ہمیشہ وقیع جانا گیا اور شمل کا حلاجؒ کے بارے میں انتہائی مثبت نقطہ نظر بھی انھی کے پیش کردہ خیالات کے سبب ہے۔ شمل اس عالمِ بے مثل کو کچھ یوں یاد کرتی ہیں:

"Massignon was not only a scientific exponent of Islamic Mysticism but also and always, even under danger, stood for the suppressed (like the Algerians). He founded prayer groups and organized pilgrimages to places which are holy to both Muslims and Christians. Later, I sent him poetic text in which Hallaj continued to live, particularly from the Subcontinent.....Our last discussion took place in an overcrowded lift in a Tokyo Hotel. It was about the Rosa mystica, the rose as a symbol of divine beauty and glory, as it appeared in the works of the Shiraz mystic Ruzbihan-e-Baqli, whom Massignon made known for the first time. We never felt the tightness in the lift- he lifted me into a higher, spiritual world. And thus he remained in my memory: a man like a saint, a real saint."20

ثانوی اسکول کے دو درجوں کو پاٹتے ہوئے، ۱۹۳۹ء میں، سترہ (۱۷) برس کی عمر میں، شمل برلن یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم کا آغاز کرتی ہیں اور یہاں انھیں ہائین غش شیڈر ایسے استاد کی رہنمائی حاصل ہوتی ہے انھیں جو مولانا رومؒ سے متعارف کراتے ہیں[۲۱] اور یہ تعارف عمر بھر کی سبک بار رفاقت میں بدل جاتا ہے اور یہ اتنا پھیلا ہوا باب ہے کہ اس پر ایک جدا پی۔ ایچ ڈی بہ سہولت ہو سکتی ہے، اور یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اقبالؔ سے رغبت کی سبیل بھی مولانا رومؒ بنے اور جس طرح اقبالؔ اپنے پیر و مرشد مولانا کو قرار دیتے ہیں کچھ یہی صورت شمل کے ہاں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ مولانا رومؒ، شمل کے نزدیک، مشرق و مغرب کے درمیان ایک ایسی مضبوط روحانی کڑی ہے جسے کسی بھی صورت نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ ان کی مولانا سے وابستگی کا دورانیہ قریباً نصف صدی کو محیط ہے اور یہ جذب و اشتیاق جو انھیں مولانا کی صوفیانہ شاعری سے تھا، پھیلتے ہوئے اسلام کے روحانی اسرار کی صوفیانہ اقلیم کو جالیتا ہے اور پھر Mystical Dimensions ایسی کتب سامنے آتی ہیں جس میں نہ صرف تصوف بلکہ اسلام کے قریباً تمام روحانی سلسلوں کو بہ اعتبار سنین و اسناد پیش کیا گیا ہے اور ان کے مآخذ کی بابت سیر حاصل گفتگو مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔ مولانا رومؒ سے کب اور کیسے ان کی رغبت اور عقیدت کا آغاز ہوا اور سب سے پہلے کب انھوں نے، اس ضمن میں، اپنی کارگزاری پیش کی، ذیل کا یہ اقتباس اس امر کی بخوبی وضاحت کرتا ہے:

"Schimmel's interest in Maulana's work began in her early schooldays when, for the first time, she read some of Rückert's excellent verse translations in German from the Diwan of Maulana. Later, when she was a very young student of Islamic languages in war-time Berlin, the moment that her professor H.H. Schaeder recited the first lines from the Masnawi proved decisive for the development of this old love, and it took only a few weeks until her first verse- translations from the Diwan-e-Shams Tabriz were ready; R.A. Nicholson's edition of the Diwan, carefully copied by hand, became a faithful companion for many years, and the first money earned in compulsory work in a factory during the semester vacations was immediately transformed into the eight volumes of Nicholson's edition of the Masnawi that was one of the few items she took out of Berlin in April 1945, when an exodus began – an exodus which ended, eventually, in an American internment camp in Marburg. Here, the Masnawi served as a soothing balm

during the long days of waiting and preparation for a new chapter in her life........... Prof. Schimmel submitted her first study to Maulana's metaphorical language in 1949; a topic containing fabulous store of similes and images in his work."22

دوسری جنگِ عظیم کے دوران شمل کو جہاں تکلیف دہ جبری مشقت کا بار اٹھانا پڑا وہیں ان کے ہاں خاور شناسی کا رجحان تسلسل سے فروغ پاتا رہا، اور دورانِ مشقت ہی وہ اپنے مقالے کی تزئین وترتیب میں منہمک رہیں، اور یوں ۱۹۴۱ء میں محض انیس سال کی عمر میں، برلن یونیورسٹی سے ، رچرڈ ہارٹ مان کی رہنمائی میں، شمل اپنی پہلی ڈاکٹریٹ بعنوانCALIPH AND QADI IN LATE MEDIEVAL EGYPTحاصل کرنے میں کامیاب ہوتی ہیں۔ان کا یہ مختصر مقالہ، جریدہTHE WORLD OF ISLAMمیں ۱۹۴۳ء کو شائع ہوا۲۳ گو کہ اس مقالے کی بابت ان کی ذاتی رائے کچھ اس قدر وقیع نہیں تاہم اس قلمی اور فکری مشقت نے آگے چل کر ایک ایسی عمارت کی بنیاد رکھی جس کا شکوہ آج لائقِ دیدنی ہے۔ ۱۹۴۱ء ہی وہ سال ہے جب انھیں جرمن وزارتِ خارجہ میں ترکی سے موصول ہونے والے ٹیلی گرام کو سمجھانا تھا یعنی ایک طرح سے ڈی کوڈ کرنا تھا۔۲۴ اسی ملازمت کے دوران، وقت کو پس انداز کرتے ہوئے انھوں نے جہاں اور بہت سی علمی مصروفیات کو جاری رکھا وہیں ۳۱ مارچ ۱۹۴۵ء کو بعد از پی۔ ایچ۔ڈی مقالہ(Habilitationsschrift) کو جمع کرایا۔۲۵ بنیادی طور پر یہ مقالہ یونیورسٹی میں سینئر لیکچرر کی اہلیت کے لیے تھا؛ اور اس سے ایک ماہ قبل شمل کو ماربوک(MARBURG)یونیورسٹی سے دعوت نامہ ملتا ہے کہ وہ مذکورہ ادارے سے وابستہ ہو جائیں اور یہیں جنوری ۱۹۴۶ء سے قبل وہ اپنا تمہیدی خطاب پیش کرتی ہیں۔ شمل بطور اسسٹنٹ پروفیسر (اسلامک اسٹڈیز) ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۱ء تک اس ادارے سے وابستہ رہیں۲۶ ؛اور ۱۹۵۱ء میں فید غش ہائیلے(Friedrich Heiler) کی رہنمائی میں اپنی دوسری ڈاکٹریٹ 'تاریخِ مذاہب' کے عنوان سے حاصل کرتی ہیں۔۲۷ شمل کی زندگی کا یہ دورانیہ بھی سرسبز وشاداب رہا۔ یہاں اختصار سے فید غش ہائیلا کا تعارف ناگزیر محسوس ہوتا ہے:

"Heiler was a pioneering theologian to whom she dedicated her book 'Deciphering the Signs of God: A Phenomenological Approach to Islam' (1994). This book was based on the Gifford Lectures delivered in 1992 at Edinburgh: a signal distinction in Religious Studies."28

مابوک میں اپنے قیام کی بابت شمل کی رائے کچھ حوصلہ افزاء نہیں۔ ایک خاتون کو بطور مستشرق کے اہمیت دینا، شعبہ کے دیگر اساتذہ کے لیے خوشگوار معاملہ نہ تھا اور ہمیں رواجی معاصرانہ چشمک کا رنگ وہاں، اس دور میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب شمل کو ترکی میں، انقرہ یونیورسٹی میں، پڑھانے کی پیش کش ہوئی تو وہ بڑی فراخی سے اسلام اور تُرکوں کی بابت یہ کہتی ہیں:

"The fact that I was not a Muslim woman seemed to be a non-issue. (Would a Protestant Theological Faculty have ever invited a Muslim Colleague?) During the subsequent months the plan matured and I accepted most happily when it was proposed to me to start on first November, 1954 in this faculty. For me, it seemed to be ideal opportunities to not only teach in my beloved Turkey, but also to learn a lot more about practical Islam."29

ترکی، شمل کے خوابوں کی تعبیر۔ جہاں صحیح معنوں میں وہ تصوف اور اہلِ تصوف سے آشنائی کا فیض اٹھاتی ہیں۔ مولانا رومؒ، شمس تبریزؒ اور دیگر اہم صوفیا سے والہانہ وابستگی کا براہِ راست آغاز ہوتا ہے۔ شمل متعدد بار مولانا کے مزار پر حاضری دیتی ہیں۔ صوفی رقص سے محظوظ ہوتی ہیں اور ان کی بابت مزید کھوج اور دریافت میں مشغول رہتی ہیں۔ مولانا رومؒ کے مزار پر حاضری دیتے ہوئے دورانِ سفر کے تجربات اور خوبصورت مناظر کے بیان میں حد درجہ لطف اٹھاتی ہیں اور مخطوطات، خطاطی، معاشرت اور سیاحت کے ساتھ ساتھ مشاہیر سے ملنے کا شرف بھی حاصل کرتی ہیں ۔شمل ترکی کی مسلم ثقافت کے ہر پہلو سے خود کو بہرہ مند رکھنا ایک بڑا اعزاز گردانتی ہیں اور استنبول سے ان کی محبت کا یہ عالم کا تھا کہ انھیں نہ صرف شہر کے چپے چپے سے آگاہی تھی بلکہ انھیں یہاں تک معلوم تھا کہ شہر کے کس مقام پر کھڑے ہوں تو ہوا کی سمت اور رفتار کیا ہو گی؛ اور مزید یہ کہ پڑھاتے ہوئے شمل نے ترکی اور ہاورڈ کے طلبا کا تقابل کچھ یوں پیش کیا کہ ترکی کے طلبا حد درجہ مؤدب اور مہذب تھے جبکہ ہاورڈ میں طلبا ڈیسک پر رکھی کتب کے ساتھ پاؤں پسار کر لیکچر سنتے تھے۔

شمل کو کئی اہم صوفی شخصیات سے بالمشافہ ملنے کا موقع ملا؛ کہیں بہت زیادہ پر مغز گفتگو ہوئی اور براہِ راست فیض اٹھانے کا موقع ملا تو کہیں تصوف کے نام پر محض شعبدہ بازی اور ہوس پرستی نظر آئی۔ دیگر صوفی شعراء میں عہدِ وسطیٰ اور اناطولیہ کے یونس ایمری کی بابت گفتگو متعدد حوالوں سے موجود ہے اور شمل کو یہ صوفی بزرگ حد درجہ متاثر کرتے ہیں:

"I have brought along a thick volume of Turkish verses of the medieval Sufi Yunus Emre, and I utilized the many hours that I was free from bathing and massaging to translate some more verses of the Anatolian singer who earlier in Anatolia, had brought me so much consolation. When, ten days later I flew back to Bonn, my new book was ready; I called it Wanderungen mit Yunus Emre (walking with Yunus Emre)."30

ترکی ہی وہ مقام ہے جہاں سے پاکستان اور اقبالؔ کے حوالہ سے ایک نئے اقلیمی سفر کا آغاز ہوتا ہے؛ گو کہ شمل کی اقبالؔ شناسی کا مرحلہ کہیں پہلے گزر چکا تھا جب تاراچند رائے جو بقول شمل کے اردو کے کلاسیکی ادب سے بخوبی آگاہ تھے اور ان کا جرمن مطالعہ بھی لائقِ ستائش تھا، پہلی جنگِ عظیم سے قبل لاہور کو خیر آباد کہہ کر جرمنی میں مستقل سکونت اختیار کر چکے تھے۔انھوں نے اقبالؔ کی نظم "پرندے کی فریاد" پڑھائی اور اسی دوران برطانوی مستشرق رینالڈ اے نکلسن جو مولانا رومؒ کے حوالہ سے شمل کو پہلے ہی مرعوب کیے ہوئے تھے کے ایک تجزیاتی مضمون جو اقبالؔ کی پیامِ مشرق سے متعلق تھا اور جس میں گوئٹے اور رومیؒ کو جنت میں کچھ اس طرح سے دکھایا گیا ہے کہ عقل کا تعلق شیطنیت سے جبکہ محبت کا تعلق آدم سے جوڑا گیا ہے، غرض یہی وہ مرحلۂ فکر ہے جب پہلی بار شمل، یہ محسوس کرتی ہیں کہ انھیں مستقبل میں کیا کرنا ہے؛ ۳۱ اور اقبالؔ شناسی کا یہ دورانیہ ۱۹۴۷ء سے قبل کا ہے جبکہ ڈاکٹر اکرام چغتائی ہانس مینک (HANNS MEINKE) کے اقبالؔ سے براہِ راست تعلق اور پھر ان کا شمل کو کتابوں کا تحفہ دینے کو اقبالؔ شناسائی کے ضمن میں ایک اہم سنگِ میل قرار دیتے ہیں:

"After some years, in 1952, she received a gift from a German poet who was a great admirer of Iqbal. It was Hanns Meinke (1884-1972) who was a retired school teacher and had deep love and veneration for both Maulana and Iqbal. Again inspired by the afore-mentioned article of Nicholson, Meinke translated after some English version some of Iqbal's verses in German, prepared a beautifully calligraphed manuscript and sent it to Iqbal before 1930. This autograph illuminated copy is now housed in the Iqbal Museum, Lahore. In exchange, Iqbal sent to him both the Payam-i-Mashriq and the

Javidnama and now these are in the possession of Prof. Schimmel who used them as the true working copies."32

شمل ہانس مینک سے موصول ہونے والی کتب کا سال، اواخر ۱۹۵۱ء قرار دیتی ہیں۳۳ اور اس پر قدرے اطمینان کا اظہار بھی کرتی ہیں۔ شمل نے کب اقبالؔ پر باقاعدہ کام کا آغاز کیا؟ اس ضمن میں ۱۹۵۱ء کا سال اہمیت کا حامل ہے جب وہ ایسکونا(ASCONA) سوئٹزرلینڈ میں معروف جرمن فلاسفر رودولف پان وٹز(RUDOLF PANNWITZ) سے ملتی ہیں اور ہانس مینک کی طرح انھیں بھی اقبالؔ کے بڑے مداحوں میں سے ایک پاتی ہیں اور پان وٹز کے اس خیال کو کہ اقبالؔ مغرب کے بہت سے اہم دانشوروں کے مقابلہ پر نطشے کو کہیں اچھے انداز پر سمجھے ہیں کو سراہتی ہیں۔۳۴ غرض تاراچند رائے، رینالڈ اے نکلسن، ہانس مینک اور پان وٹز سے پروان چڑھتا اقبالؔ شناسی کا یہ سفر جاوید نامہ اور پیامِ مشرق کے جرمن اور ترکی تراجم سے بڑھتے ہوئے ان کے پاکستان کے پہلے دورہ (موسمِ بہار ۱۹۵۸ء) کو جالیتا ہے۔ اس ضمن میں ذیل کا اقتباس اہمیت کا حامل ہے:

"Soon, his Javedname and large parts of the Message of the East 'Botschaft des Ostens' were translated into German verse. My lectures on Iqbal and above all, my annotated Turkish translation of the Javename...brought me the first invitation to Pakistan, which soon became a second home to me."35

شمل پاکستان سے کس قدر محبت کرتی تھیں اور انھیں یہاں کے لوگوں سے کس قدر پیار ملا اس بابت، باب کے آخر میں بات کرنا اور قیامِ ترکی کے حوالہ سے چند اور حقائق پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے؛ مثلاً نومبر ۱۹۵۴ء سے شمل کو انقرہ یونیورسٹی میں باقاعدہ پڑھانے کی پیش کش ہوئی جسے خوش دلی سے قبول کیا گیا اور اس کا سبب ان کا ترکی سے بے حد لگاؤ اور اسلام سے براہِ راست فیض اٹھانے کا وہ جذبہ تھا جو تمام عمر، اِن کو نت نئی کاوشوں میں منہمک رکھنے میں، کلیدی کردار ادا کرتا رہا۔ استنبول کا پہلا سفر بذریعہ اسٹیمر فروری ۱۹۵۲ء میں کیا۔ یہ ان کا ترکی کا پہلا سفر ہے جبکہ

۱۹۵۳ء کے موسم گرما میں وہ پہلی بار انقرہ آتی ہیں۔[۳۶] شمل ان اسفار کو بہت لطف سے یاد کرتی ہیں اور ۱۹۵۹ء تک انقرہ یونیورسٹی سے وابستہ رہتی ہیں۔ یہاں شمل قلمی نام سے بھی لکھتی رہیں اور ان کا یہ کہنا دلچسپی سے خالی نہیں:

"I got inspired by my Turkish friends and began to write articles on German Art in Turkish magazines. In the Istanbul Dergisi, in Yeditepe and great Hayat a number of sketches appeared, about German cities or country-sides, about persons that seemed important to me, all signed with the pen-name Cemile Kiratli(Kirat=Schimmel)."37

نام ہی کی بابت ایک خوبصورت صراحت کچھ یوں ہے:

"J. Christoph Bürgel, her student and an eminent Swiss Islamologist, has given a vivid picture of her stay in Turkey in the preface of the Festschrift presented to Prof. Schimmel on her seventieth birthday in 1992. He informs that her Turkish friends corrupted and meaning Schimmel to the Turkish girl's name Cemile (pronounced Jemâle beautiful) and he pays homage in German verse to Schimmel under the heading "Cemile". This name has the specific Islamic connotations and later on her friends and in her honour as Gott ist schön und colleagues preferred to have the title of Festschrift Er liebt die Schönheit,[22] a verbatim translation of an oft-quoted Hadith "All«hu jamâlun yuÁib al-jam«l"." 38

ترکی میں قیام کے دوران ان کی شادی سے متعلق قیاس آرائیاں ہوئیں تاہم حتمی طور پر ان کی شادی کا تعین نہ ہو سکا اور یہ بھی ٹھیک طور سے نہ جانا جا سکا کہ ان کے شوہر کون تھے، کچھ اسی نوع کی ازدواجی خبریں ان کے قیامِ پاکستان کے دوران بھی گردش کرتی رہیں۔ وکی پیڈیا میں ان کے ترکی آمد سے قبل شادی کا تذکرہ ملتا ہے لیکن اس ضمن میں

سند موجود نہیں تاہم ۱۹۵۰ء کا سن دیا گیا ہے۔۳۹ ڈاکٹر اکرام چغتائی ایک جدا نام "طاری" کا پتہ دیتے ہیں اور ان کی شادی کا گمان ظاہر کرتے ہیں:۴۰

"During her stay in Turkey, she edited the Persian text of Sârat Ibn Khafif ash-Shirazi and wrote a monograph in German on Friedrich Rückert. On the title page of both these publications a word "Tarı" is added to her name, not as the co-author like Abdoldjavad Falaturi or Cary Stuart Welch, but hyphenated with her real name Annemarie Schimmel. Afterwards, this Turkish name completely disappeared. She also used to write the articles under the name of R«shid al-Haydari which were mostly published in Fikrun wa Fann, an Arabic journal published from Hamburg."41

اس ضمن میں راقم نے ڈاکٹر سہیل عمر اور خلیل طوقار صاحب سے بھی رابطہ کیا تاہم موٗخر الذکر کے اس بیان سے اکرام چغتائی کے گمان کو تقویت حاصل ہوئی کہ انھوں نے دورانِ تدریس، انقرہ میں ایک ترک سے شادی کی جو طلاق پر منتج ہوئی۔42

کچھ اسی نوع کی گفتگو خواجہ حسن نظامی کے ہاں بھی ملتی ہے:

"میں نے شِمل آپا سے بھی ان کے خاندانی حالات کبھی نہیں معلوم کیے، نہ کبھی ان سے یہ سوال کیا کہ وہ مشرف بہ اسلام ہوئیں یا نہیں۔ البتہ ان کی ایک کتاب سے جس کے سرورق پر شِمل کے بعد ایک ترکی نام جڑا ہوا تھا، یہ پتہ چلا کہ ان کی شادی کسی ترک کے ساتھ اس وقت ہوئی تھی جب وہ ترکی میں ترکی زبان و ادب پڑھا رہی تھیں۔ شاید بعد میں علیحدگی ہو گئی ہو"۔۴۳

البتہ خود نوشت ORIENT AND OCCIDENT میں شمل نے سرے سے اس موضوع کو درخورِ اعتنا نہ جانا اور مطلقاً اس موضوع پر بات نہ کی، یعنی ایک طرح سے عشق و محبت اور شادی ایسے معاملات ان کے لیے چنداں اہمیت کے حامل نہ تھے جبکہ شخصی اعتبار سے وہ ایک انتہائی حساس، متحرک اور انسان دوست خاتون تھیں۔ شمل نے کیوں کر اس اہم وقوعے کو نظر انداز کیا؟ کیا یہ بہت دل دکھانے والا معاملہ تھا یا پھر ان کے نزدیک ذاتی، نجی معاملے پر بات کرنا کسی بھی طور مناسب نہ تھا۔ غرض شمل کی اس اعراض پسندی کو بہت سے لوگوں نے محسوس کیا اور ذیل کا یہ اقتباس اسی ناگفتنی کو ہدفِ ملامت بنائے ہوئے ہے:

“Equally disappointed will be those readers who search for intimate confessions and an author's "love life”. “One does not talk about the many tears, disappointments and human problems", she writes, "this is nobody's business.”44

شمل کی شادی کی بابت اور بہت سے گمان وجود رکھتے ہیں تاہم یہ طے ہے کہ اگر انھوں نے کبھی کسی سے شادی کی تو وہ ایک ترک تھا؛ تیقن سے کچھ کہنا مناسب نہیں۔ شمل ترکی اور وہاں کے لوگوں سے کس قدر متاثر تھیں اور ترکی کے لوگ ان سے کس قدر انسیت اور احترام کا رشتہ قائم کیے ہوئے تھے اس کا پر تو، ذیل کے اقتباس میں موجود ہے:

“I often met colleagues who loved the tradition as much as my friends did, among them Suheyl Unver; although he was an historian of medicine, he was our finest expert of calligraphy and miniature paintings; also Nihat Sami Banarli, who brought the great tradition back to life in his book and articles. Thus impressed, the grandson of Samiha Abla grew up, who was named after the great Turkish architect, Sinan,- who built the Suleymaniye, the Mihrima, the Rustam-Pasha Mosque and the Selimiye in Edrine. Samiha Abla herself gave lasting expression to the traditions which she loved so much, in her novel and short –stories. I used to love to listen to her when she, in long, melodious sentences, told about the old Istanbul Geceleri. These ‘Nights of Istanbul’ enchanted me every time read them.”45

شمل ۱۹۵۹ء(موسمِ خزاں) میں وطن واپس لوٹتی ہیں لیکن اپنے قیامِ ترکی میں ان کی اقبال فہمی اور پاکستان سے قلبی لگاؤ کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے قائم ہو جاتا ہے۔ ماربوک یونیورسٹی سے ایک بار پھر متعلق ہوتی ہیں لیکن قریباً ایک سال کسی بھی متحرک سرگرمی سے دور ہی رہتی ہیں اور اس یونیورسٹی میں موجود سازشی فضا کے باعث کچھ دلبرداشتہ بھی ہوتی ہیں۔ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۵ء تک وہ بحیثیت ایسوسی ایٹ پروفیسر (عربی و اسلامی مطالعات) بون(BONN) یونیورسٹی سے متعلق رہتی ہیں اور اسی دوران البرٹو تھیلے(ALBERTO THEILE) کی معیت میں عربی جریدے "فکر وفن " کا اجراء ہوتا ہے[۴۶] اور اس کے شمارہ ۳۷(۱۹۸۲ء) تک تھیلے کی شراکت میں اس جریدہ کی ادارت کی[۴۷]؛ اس جریدہ میں لکھے جانے والے مضامین اُس وقت عربی ہی میں لکھے گئے اور بعد میں شمل کا کوئی مضمون اس

میں شائع نہ ہوا۔۴۸ شمل کی اس جریدہ سے وابستگی کا یہ عالم تھا کہ جب انھیں ہاورڈ (HARVARD) میں پڑھانے کا موقع مل رہا تھا تو اس جریدہ کی خاطر پیش کش قبول کرنے میں قدرے تامل کیا۔ ہاورڈ میں پڑھانے کا موقع کیسے ملا اور کس حیثیت سے ان کو ہاورڈ سے متعلق ہونا تھا اس ضمن میں ذیل کا اقتباس دیکھا جاسکتا ہے:

"Frye was chiefly instrumental in arranging with the then Harvard President, Nathan Pusey, for the first teaching position in the world exclusively on South Asian Islamic culture, namely, the Minute Rice Bequest funded from the estate of its inventor, A.K. Ozai Durrani, which she came to hold in 1967 as Lecturer and then as full Professor of Indo-Muslim Languages and Culture (1970-92).49

ہاورڈ میں باقاعدہ پڑھانے سے قبل شمل اگست ۱۹۶۵ء میں امریکہ یاترا کر چکی تھیں اور معروف مؤرخ اور ماہرِ عربیات گستاؤ ایڈ منڈ ون گوں ناباؤں (Gustave Edmund von Grunebaum) کی مہمان نوازی کا لطف اٹھا چکی تھیں۔۵۰ ہاورڈ ایک ایسا مقام تھا جس نے شمل کو زندگی کے علمی و فکری پہلو جانچنے کی ایک نئی مہمیز عطا کی۔ یہ جگہ صحیح معنوں میں ان کی شناخت اور پہچان کا حوالہ بنی۔ دنیا بھر کے اسکالرز، دانشور، محققین اور پھیلی ہوئی اس زمین سے جڑے لوگ جو مختلف ثقافتوں اور تہذیبوں کو دامن میں سمیٹے یہاں پڑھنے پڑھانے کی غرض سے آتے تھے ان سے ملنا اور مختلف امور پر گفتگو کرنا، سیکھنا سکھانا، دنیا بھر کی سیاحت اور اسلام، اور اس کے جمالیاتی پہلو تصوف کو بہتر انداز پر سمجھنا یہ سب ہاورڈ کی دین تھا جس کا علمی پینورامک شمل کی فکر کو ہمیشہ کے لیے ایک بڑی اٹھان دے گیا۔ شمل کو دینا بھر کی یونیورسٹیوں، اداروں اور مراکز سے دعوت جاتی تھی اور ان سے اسلام اور تصوف کی بابت سننے کی خواہش کا اظہار کیا جاتا تھا یعنی ایک غیر مسلم سے اسلام کی درست صورت گری کی بابت پوچھا جاتا تھا شاید اسی لیے ہاف مان نے یہ درست کہا:

"To be sure, as a Muslima Schimmel could have done less for Islam because, strange as it is, the German public trusts Orientalists more than Muslims when wanting to learn about Islam!"51

اور پھر ان کے دیے گئے لیکچرز بعد میں کتب کی صورت ڈھل کر اکنافِ عالم سے خراجِ تحسین وصول کرتے رہے اور انھیں اسلام کو اس کی مکمل جامعیت، مکمل شکل میں دیکھنے کا ایک بھرپور موقع ملا۔ مختلف قوموں، خطوں اور تہذیبوں سے جڑے امیر، غریب مسلمان ان کے براہِ راست مشاہدے اور تجربے کا حصہ بنے اور ایک بہتر تفہیمی پس

منظر پھیلنے لگا۔ بہت سے صوفیانہ مراکز کو خود جا کر دیکھنے کا متعدد بار موقع ملا اور یوں ان کی تحریر اسلام اور اس کے ماننے والوں کی بابت پختہ ہوتی چلی گئی:

"I cannot imagine a more beautiful finale to twenty- five years of teaching in Harvard- mystical poetry as mediator between two seemingly different worlds."52

امریکہ کو الوداع کہتے ہوئے جن عوامل اور اشخاص کی بابت فرقت کا احساس شدت سے ہوا ان کے بارے میں شمل کچھ یوں کہتی ہیں:

"When I left America in 1992, what I missed most was the museum and the New York friends. New York, that includes long Island, at the end of which lies a campus of the State University of New York, where William Chittick and his wife Sachico Murata teach. Their work on Islamic mysticism has opened totally new perspectives."53

وطن لوٹنے پر شمل ایک بار پھر بون یونیورسٹی سے متعلق ہوتی ہیں اور زندگی کی پچھتر بہاریں دیکھنے پر ۱۹۹۷ء میں آنیماری شمل چیئر کی نیو رکھی جاتی ہے۔۵۴ اس دوران شمل مسلسل لکھنے اور لیکچر دینے میں منہمک رہیں اور یہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ یہ لیکچرز متعدد کتب کی تشکیل میں معاون ہوئے۔ یوں انھیں دنیا بھر سے دعوت نامے ملے، جس کا ایک بڑا فائدہ شمل کو یہ ہوا کہ اکنافِ عالم میں بکھری مسلم ثقافت کو براہِ راست دیکھنے اور سمجھنے کے بہترین مواقع میسر آئے اور تقریر و تحریر میں خود اعتمادی بڑھنے لگی۔ ان کے اعزاز میں مرتب ہونے والے جملہ مقالات اور بون شہر کی جانب سے غیر معمولی خراجِ تحسین کی بابت یہ اقتباس اہمیت کا حامل ہے:

"Earlier two festschrift, a special number of the Journal of Turkish Studies(Cambrige, Mass, 1994) and the appositely entitled Gott ist schon und Er libet die Schonheit (Berlin, 1994), consisting of 50 essays were presented to her by colleagues, students and friends. She was felicitated by the city of Bonn and her name registered in the Town's Golden Book when she turned to 80 last years, an event also celebrated in her "Zweite Heimat, Pakistan."55

لاہور کی ایک اہم شاہراہ جو نہر کے ساتھ ساتھ جیل روڈ سے مال روڈ کو جا لیتی ہے ڈاکٹر آنیماری شمل کو معنون ہوئی، لیکن ان دنوں یہ آثار نہیں ملتے۔ اسی طرح اس کے بالمقابل مال روڈ سے جیل روڈ تک کی سڑک گوئٹے کے نام معنون تھی۔

شمل کا مسلم ثقافت کے متعدد پہلوؤں پر تفکر بہت سے مطالعات کو منظرِ عام پر لایا اور اس ضمن میں خطاطی ایک ایسا گوشہ تھا جس سے انھیں خاص طور سے رغبت رہی۔ اور ان کا بڑھا ہوا اشتیاق بالآخر ایک اہم کتاب Calligraphy and Islamic Culture کی صورت دادِ تحسین پاتا ہے:

"The course on Calligraphy was my favourite subject. I believe that for the student of Islamic studies, this course is a must, to at least know a bit about the peculiarities of the manuscripts, about the parchment and paper, about types of ink and illumination."56

شمل متعدد زبانوں پر عبور رکھتی تھیں، اور اسی سبب کمپیوٹر کا استعمال نہ کرتی تھیں؛ قریباً پچیس (۲۵) زبانوں میں پڑھ سکتی تھیں اور ان میں سے سترہ (۱۷) زبانوں میں خط لکھنا ان کے لیے آسان تھا۔۵۷ وہ ایک حساس مگر عام پرشن (PRUSSIAN) لوگوں کی نسبت گرمجوش، زندگی سے عبارت رویہ رکھتی تھیں۔ یوں تو ان کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات سے متعدد بار ان کا انتہائی حساس ہونا ملتا ہے؛ لیکن ایسا نہیں کہ کسی عالمِ خشک کی مانند، علمی زعمِ فاسد میں مبتلا تھیں بلکہ ان کی حسِ مزاح انتہائی توانا و متحرک تھی اور یہی سبب ہے کہ ان کے ہاں خبطِ عظمت کے آثار ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملتے۔ ذیل میں دیے گئے اقتباسات بالترتیب ان کی حساسیت، گرمجوش رویے اور حسِ مزاح کا پتہ دیتے ہیں:

"For me, Divrigi is the place in Anatolia which has moved me most-a world, which touches very deep layers of consciousness, like a dream which stays and becomes part of the soul."58

"She was the antithesis of your average cold-blooded and icy hearted female German academic. She admitted in her autobiography that after experiencing the warmth and friendship of people in Turkey, Germany appeared cold and unfriendly to me."59

"Which queen in the world has a more beautiful grave than Shah Jehan's wife Mumtaz Mahal, who died in 1631 at the birth of her fourteenth child within sixteen years?.......My

masterpiece I delivered in Lyallpur (now Faisalabad) where, in the agriculture University, I heard the announcement: ' And now Dr.Schimmel is going to speak on Iqbal and Agriculture.'(One should speak this in the broadest form of Punjabi-English) And I did it!"60

شمل انسان دوست اور انتہائی منکسرانہ رویہ کی مالک تھیں۔ ان کی خود نوشت میں متعدد ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے ان کی عاجزی اور مثبت اندازِ فکر کا پتہ ملتا ہے؛ پھر بہت سے ایسے اعترافات بھی ملتے ہیں جن سے عموماً اہلِ مشرق میں شہرت رکھنے والے لوگ اعراض برتتے ہیں اور ان کی بابت سبکی محسوس کرتے ہیں۔ مثلاً جب اول اور آخری بار میکڈونلڈ جانے کا موقع ملا تو اس کا بھی ذکر ہوا اور اگر مے نوشی کی تو اس کے بیان میں بھی کچھ تردّد نہ کیا۔ خود نوشت میں قریباً چھ (٦) جگہوں پر مے نوشی کا ذکر ہے اور یہ ایک ایسی خاتون کی جانب سے ہے جس کی وجہ شہرت، روحانیت، اسلام اور تصوف پسندی پر انحصار کرتی ہے اور جس کے مسلمان ہونے پر اکثر گمان کیا جاتا ہے اور پھر جسے مسلم ریاستوں میں اہم غیر ملکی مہمان کی حیثیت سے پروٹوکول ملتا رہا، ایسی شخصیت کا اپنی مے نوشی کا برملا اظہار، کردار کی مضبوطی کو دال ہے؛ اور ہمیں یہاں یہ سمجھنا ہو گا کہ وہ ایک مغربی مستشرقہ تھیں اور ان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ مغرب میں گزرا۔ وہ مغربی معاشرت کی پروردہ تھیں جس میں کبھی کبھار کی مے نوشی معیوب نہیں سمجھی جاتی۔ اسے ہماری سادگی جانیے کہ ہم ایسی تمام شخصیت کو مذہب کی سان پر چڑھادیتے ہیں جو اسلام اور تصوف کی بابت مثبت رویہ یا اعتقاد رکھتی ہیں، اور انھیں کھینچ تان کر دائرہ اسلام میں لانے کی بھونڈی سی کوشش کرتے ہیں۔ شمل اپنی مے نوشی کا ذکر کچھ یوں کرتی ہیں:

"Mr. Solomon from Beirut asked us in fluent German: 'If I offer you a cognac, will you drink it'?

And he filled our water glasses with vodka...it must have been a day in November 1962, when Alberto Theile visited us for the first time.....we invited him to glass of wine.....Thus, after everybody had been sufficiently educated, we were treated to salmon and similar delicacies, last not least, with German wine."61

شمل اعلیٰ شعری ذوق رکھتی تھیں۔ کلاسیکی متون اور اہم بڑے شعراء کو رسان سے پڑھنا، پڑھانا اور پھر ان کو جرمن یا انگریزی زبان میں منتقل کرنا کچھ آسان نہ تھا اور جیسا کہ وہ خود مشرق و مغرب کے مابین ایک پل کا کردار ادا کر رہی

تھیں اسی طرح صوفیانہ شاعری کو بھی ان دو قطبین کی واحد کڑی سمجھتی تھیں۔۶۲ اس بابت خاص طور سے ان کی کتاب "برفباری میں بلبلیں" (NIGHTINGALES UNDER THE SNOW) دیکھی جاسکتی ہے جس کے موضوعات پڑھنے والے کو متحیر رکھتے ہیں۔ یہاں مولانا رومؒ جو ان کی محبت و عقیدت کا مرکزِ اول ہے سے لے کر شیریں فرہاد، یوسفؑ زلیخاؒ، دورانِ سیاحت رقم ہونے والی نظمیں، مغل شخصیات، مزارات اور مقامی فوک داستانوں کی ایک پھیلی ہوئی اقلیم موجود ہے۔ اس سے جہاں ان کے ذاتی شغف اور علمی انہماک کا پتہ چلتا ہے وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مختلف النوع موضوعات کو شعری قالب میں ڈھالنے کی ان میں کس قدر غیر معمولی صلاحیت و اہلیت موجود تھی۔ شمل کی صرف دو نظموں کو بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے:

Oh, Could We but Embrace You

Oh, could we but embrace you:
We: shore, and you the sea,
Or dwell amidst your blossoms:
We: birds, and you the tree.

But we are prints on water
And traces in the sand;
Like snowflakes or stray feathers
We are in no one's hand.

Forever separated
From our home and root–
Oh, if your breath would touch us,
We'd love to be your flute.....

Zulaykha's First letter to Yusuf

I wait for the moon

To rise on the eastern sky-

Perhaps you have looked at her

That I mirror her

In the lake of my tears

In the sea of my dreams.

Reflected in thousands of drop

Your smile sinks deep into the oyster of recollection

-pearl of all pearl-."63

شمل کی بابت ایک زور آور گمان یہ بھی ہے کہ وہ خود کو ایک شاعرہ کے طور پر شناخت کرتی تھیں۔۶۴ ان کی دیگر شعری مصروفیات جو تراجم اور مرتب کرنے سے متعلق ہیں ان میں ایک اہم کتاب AS THROUGH A VEIL: MYSTICAL POETRY IN ISLMAM جو ان کی اور بہت سی کتب کی مانند دیے گئے لیکچرز کا حاصل ہے کے حوالہ سے ذیل کا اقتباس اہمیت رکھتا ہے:

"The sole English examination to date of mystical poetry and Sufism in the vernacular mediums of the subcontinent"65

شمل کھانے پینے میں خاص مہارت رکھتی تھیں اور اپنے ہاتھ سے نت نئے پکوان، پکانے میں لطف محسوس کرتی تھیں، اور ایسی بہت سی پر لطف معلومات وہ اپنی خود نوشت میں دے چکی ہیں۔

قرآنِ حکیم اور مقدس بائبل کا مطالعہ تواتر سے ہوتا تھا؛ یہی سبب کہ ہے ان کے پیش کردہ مطالعات میں قرآنی آیات کا اندراج، موقع و محل کے مطابق، انتہائی موزوں نظر آتا ہے:

"My nerves were raw, and I was not sure whether I would be able to withstand this witch-hunt. Psalm 43 and the Quranic suras of protection were my spiritual nourishment in those weeks."66

شمل کا لیکچر دینے کا طریقہ قدرے منفرد تھا۔ وہ اپنے دیے گئے موضوع پر، آنکھیں بند کر کے گفتگو کا آغاز کرتیں اور مجوزہ وقت میں لیکچر ختم کر کے بند آنکھیں کھول دیتیں۔ اس دوران وہ مضبوطی سے اپنا پرس پکڑے رکھتیں اور ترتیب سے سنین کا شمار ہوتا۔

شمل کے لیے ان کی والدہ کا انتقال، انتہائی تکلیف دہ تجربہ تھا۔ ان کی والدہ نے جہاں افکار و خیالات کی پرداخت میں اہم کردار ادا کیا وہیں زندگی کے نشیب و فراز میں ان کا صائب مشورہ اور عملی معاونت شمل کے لیے ایک بے مثل ڈھارس تھی، اور پھر یہ کہ زندگی کی ایک طویل رفاقت کے مشفق احساس نے شمل کو ہمیشہ مسحور رکھا۔ ان کے انتقال کی بابت شمل کے جملہ جذبات و احساسات کی ترجمانی ذیل کے اقتباس سے بخوبی ہوتی ہے جو اقبالؒ کی نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" کی چند سطروں کا عکس بھی لیے ہوئے ہے:

"But then her strength failed her (She was ninety-one years old). She passed away peacefully.

To whom should I now address the daily letters which I had been writing for years? I thought of Iqbal' elegy for his mother in which he says:

Who will now wait at home for me and pray?

Who will be restless when letters reach you with delay?.....

And yet, my mother, the much beloved "Aunty Mama" of so many young friends in East and West, is always present. She is like a protective shield, wherever I am."67

شمل کی پاکستان سے محبت کے کئی زاویے، کئی چہرے ہیں۔ سرزمینِ ہند اور خاص طور سے پاکستان کو چاہنے کے اسباب میں تصوف، اقبالؒ، اسلام اور مسلم ثقافت وہ نمایاں عناصر ہیں جو ان کی تحریروں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ سندھ اور ہند کے صوفیاء کرام سے ان کی عقیدت اور شیفتگی محکم بنیادوں پر قائم تھی اور یہی سبب تھا کہ جب ان سے یہ کہا گیا کہ انھیں عقیدہ کے اعتبار سے کیا سمجھا جائے تو ان کا جواب 'صوفی' تھا۔ شمل، منصور حلاجؒ سے ایک گونہ انسیت رکھتی تھیں اور ان کی کتاب MYSTICAL DIMENSIONS میں مذکورہ ہستی کا ذکر محبت کا شیریں لمس لیے ہوئے ہے اور اس بزرگ شناسی میں وہ عیسی یوں کو خراجِ عقیدت پیش کرتی ہیں کہ جن کے سبب وہ اس عظیم مسلم صوفی سے بہتر طور پر متعارف ہوئیں۔ ہندوستان کے صوفیاء کرام میں وہ شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ سے، حضرت

خواجہ میر دردؒ، وارث شاہؒ اور بلھے شاہؒ تک کی فکری و عرفانی کاوشوں سے آگاہ تھیں اور یہ ان کا متصوفانہ مزاج تھا کہ آج ان کی پہچان کے معتبر حوالوں میں اُن کتب کا نام لیا جاتا ہے جو الٰہیات اور تصوف سے متعلق ہیں یعنی

Gabriel's Wing: A Study into the Religious Ideas of Sir Muhammad Iqbal (1963); Mystical Dimensions of Islam (1975); The Triumphal Sun: A Study of the Works of Jalaloddin Rumi (1978); Islam in the Indian Subcontinent (1980); And Muhammad is His Messenger: The Veneration of the Prophet in Islamic Piety (1985);

Pain and Grace (1976) اور

خاص طور سے نمایاں ہیں۔ غرض شمل جہاں بھی گئیں، ان کی شناخت اسلام اور تصوف کے بیانیے میں ہوئی۔ ان کی بابت یہ سچ کہا گیا:

"ان کی تحریروں میں لفظ لفظ اس طرح بولتا ہے جیسے انھوں نے تصوف کو واقعی خوب خوب برت رکھا ہو۔ دوزخ جنت کی خاطر نہ سہی اس انس و الفت کے لیے ہی سہی جو مخلوق کی طرف سے ملنے والی سب سے بڑی نعمت ہے۔ وہ اپنے خالق کے ساتھ اپنے خالق کی عارف مخلوق کی بھی واقعی عارف ہیں۔"[۶۸]

شمل کے نزدیک تصوف اور اہلِ تصوف کیا تھے اس ضمن میں ذیل کا اقتباس اہمیت کا حامل ہے:

"She emphasizes that 'Sufism reflects the different attitudes of Muslims toward the world; thus we find among the mystics anti-worldly ascetics and active fighters for the glory of their faith, austere preachers of repentance and enthusiastic hymnodists praising God's eternal loving-kindness, builders of highly sophisticated theosophical systems, and enraptured lovers of Eternal Beauty.69

یوں اسلام سے ان کی رغبت کی ایک اہم وجہ تصوف کی عملی صورت گری ہے۔ متصوفین میں منصور حلاجؒ اور مولانا رومؒ سے ان کی محبت ڈھکی چھپی نہیں، اور اقبالؔ سے شمل کی والہانہ وابستگی کے اسباب میں بھی یہی دونوں متذکرہ شخصیات ہیں جنھیں اقبالؔ اپنے افکار و نظریات میں بلند مقام دیتے ہیں۔

شمل نے اسلام کو مجموعی حیثیت یعنی ایک کلیت (TOTALITY) میں سمجھا اور جانا۔ وہ مسالک کی تفریق میں برتری اور تفضل کی قائل نہ تھیں۔ اہلِ تصوف اور ان کے جملہ سلسلے اور علاقے، اسماعیلی اور اثنائے عشری یہ سب شمل کے لیے اسلام کی جداجدا، وہ شناختیں اور راہیں تھیں جنھیں ایک بڑے پس منظر میں دیکھنا ناگزیر تھا یعنی انھوں نے یہ کبھی نہیں چاہا کہ کسی ایک مسلک یا عقیدے کے پیروکاروں کے ساتھ خود کو متعلق کرلیں یا کسی ایک خطہ کی اسلام شناسی کو، حرفِ آخر سمجھتے ہوئے، اس کی تفہیم کی جائے۔ اسلام کو ایک تکمیلی نظام جان کر اسے مختلف ثقافتوں کے پس منظر میں سمجھا تو ضرور ہے لیکن اسلامی روح کو مقید کرنے کی کوشش سے انھوں نے ہمیشہ اعراض برتا؛ اور اُن جملہ خصائص پر توجہ دی جو سب میں مشترک تھیں اور پھر مسلمانوں ہی کے جملہ مسالک کے درمیان یہ تفاعل نہ برتا بلکہ دیگر مذاہب اور خاص طور سے عیسائیت میں موجود ان عناصر کو پیش کیا جو مسلم اقدار، اور عقائد و نظریات سے مماثلت رکھتے تھے؛ اور ایک اہم بات یہ کہ اسلام کو جمالیاتی رنگ میں دیکھنے اور دکھانے کی جستجو کی۔ اللہ جمیل و یحب الجمال۔ اس خیال سے ہمیشہ لطف اٹھایا:

"From other case rosaries slipped out. They were of incomparable beauty, made of mountain crystal, a simple brown one of fine wood, another of camel teeth. Turquoise and agate were among them as well as some of subdued shining beads of mother-of pearl, others of smooth ivory or thorny fruit. I could not have enough of this sight and wondered whose hands might have moved the beads, whose lips might have murmured the ninety nine most beautiful names of God, or had counted the pharases of Fateha or of blessings for the Prophet."70

یہی سبب تھا کہ انھیں مشرق و مغرب میں ایک مسلم سفارت کار کے طور پر جانا گیا۔ ایک ایسی مؤقر اتھارٹی جس کا کوئی مثل نہ تھا۔ اپنی حیثیت اور مقام کے اعتبار سے یکتا اور یگانہ۔

شمل، نبی اکرم ﷺ سے ایک خاص نوع کی انسیت رکھتی تھیں اور ان کی یہ شدید خواہش تھی کہ وہ روضہ رسولؐ پر حاضری دیں تاہم ان کے غیر مسلم ہونے کے سبب یہ ممکن نہ ہوا جس کا انھیں شدید قلق تھا:

"At times I recall this first visit to Riyadh, at the end of which a photo-journalist asked me whether I would care to come back some day. I, without wearing a headscarf, said: 'Yes, if I were given a chance to visit the Grave of the Prophet in Medina.' I was sure that this

would not be aired. But four weeks later, a Pakistani colleague, who teaches at the Umm al-Qura University in Mecca, wrote to me: 'we were so pleased to see you here in Mecca on TV, and to hear, that you wish to visit the grave of our beloved Prophet.' So, at least my TV image had visited the sites of the Hejaz, I had done a virtual pilgrimage. But no real visit to Medina materialized to this date."71

نبی محترم حضرت محمد ﷺ سے شیفتگی اور وابستگی کا ایک خوبصورت رنگ AND MUHAMMAD IS HIS MESSENGER کی صورت میں سامنے آتا ہے، جو ان کے لیکچرز کا حاصل ہے اور ان کی ایک دوسری اہم کتاب MYSTICAL DIMENSIONS کے باب چہارم کا حصہ ہے۔ اسلام اور داعیؐ اسلام سے ان کی بڑھی ہوئی محبت متعدد بار تنقید کا ہدف بنی اور وائیڈنر نے یہاں تک کہا:

"I don't think we are doing Annemarie Schimmel an injustice if we emphasise that for her the Orient was always this 'Orient of mystical wisdom'. Now, this mystical wisdom is certainly much more present in the Orient than in the West; but it is also clear that viewing the Orient as a bastion of mystical wisdom avoids placing emphasis on the real Orient with all of its problems."72

شمل کو اس وقت شدید ہدف و ملامت کا نشانہ بنایا گیا جب شاتمِ رسولؐ سلمان رشدی نے "آیاتِ شیطنیت" (STANIC VERSES) میں ہرزہ سرائی کی اور جواباً جب سخت مسلم موقف سامنے آیا تو اہلِ مغرب میں سے بعض دانشور حضرات کی جانب سے یہ توقع کی جانے لگی کہ شمل آزادی اظہار کا علم اٹھائے رشدی کی حمایت کریں لیکن ان کی توقعات کے مطابق ایسا کچھ نہ ہوا اور نتیجتاً شمل کے افکار و خیالات کے بخیے ادھیڑے گئے اور ایک موقع پر شمل کو یہ لگا کہ جیسے ان کی زندگی کی تمام علمی کاوشیں رائیگاں چلی جائیں گی۔ وقت کا یہ دورانیہ شمل کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا، جب اطراف سے سب و شتم جاری تھا اور ہیبر ماس (HABERMAS) ایسی شخصیات غیر صحت مند رویہ اپنائے ہوئے تھیں اور شمل کی جب جرمنی کے انتہائی اہم ایوارڈ برائے امن، جرمن بک ٹریڈ ایسوسی ایشن (۱۵ اکتوبر ۱۹۹۵ء) کے لیے نامزدگی ہوئی تو بہت شور و غوغا ہوا اور انھیں خوب زِچ کیا گیا۔ یہ تو اس وقت کے جرمن صدر رومان ہیرزوگ (ROMAN HERZOG) کی ذاتی دلچسپی تھی کہ وہ اپنے سرکاری دورۂ پاکستان (موسمِ بہار ۱۹۹۵ء) کے موقع پر نہ صرف شمل کو اپنے ساتھ لے گئے؁۷۳ بلکہ مذکورہ ایوارڈ کی بابت شمل کی خاص

طور سے پذیرائی کی اور ان کے لیے منعقدہ تقریب میں تعریفی کلمات کہے۔ شمل اس سارے قضیے کو کچھ یوں بیان کرتی ہیں:

"Then the fifteenth of October was there! At breakfast the gentlemen from the stock exchange gave me good advice, how to react when the foul eggs and stinking tomatoes would come flying, and I entered the Pauls-church as if I were going to my own execution, which, at that moment, seemed quite preferable to me. But strange: the further the ceremony progressed, the more the dull fog, which had filled the big hall, began to dissolve; the large space became airy and shining, and when I began my speech, everything looked very bright. To me it appeared as if the hall was filled with angels, which surrounded me. It was truly a mystical experience."74

شمل کا تاریخی شعور پختگی اور راستی لیے ہوئے تھا۔ مسئلہ کشمیر پر ان کا موقف اس لیے ہمدردانہ یا، پاکستان جھکاؤ نہ رکھتا تھا کہ وہ پاکستان کو اپنا دوسرا گھر کہتی تھیں یا پھر انھیں پاکستان کے اعلیٰ سرکاری اعزازات سے نوازا گیا تھا بلکہ ان کی کشمیر کی بابت رائے ان کی پختہ تاریخ شناسی اور غیر جانبدارانہ رویے کے باعث تھی ورنہ ہندوستان ان کا آنا جانا لگا رہا اور قریباً اکتوبر ۱۹۶۶ء سے وہ ہندوستان دیکھ رہی تھیں، اور اس میں کوئی شائبہ نہیں کہ وہاں بھی انھیں بہت احترام دیا گیا:

> "آپا شمل نے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی طرف سے کئی لیکچر دیے۔ جب انسٹی ٹیوٹ کا اپنا کوئی حال نہ تھا تو ان کے لیکچر غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدینؒ میں ہوا کرتے تھے۔ جب یہ انسٹی ٹیوٹ ہمدرد نگر منتقل ہو گیا اور اس کا اپنا شاندار لیکچر ہال تیار ہوا تو آپا شمل وہاں آنے لگیں۔"۷۵

یعنی پاکستان کی طرح ہندوستان بھی انھیں متعدد حوالوں سے عزیز تھا؛ آخر کروڑوں مسلمان بھرپور تہذیبی و ثقافتی تشخص لیے اُس خطہ ارضی کو اپنا مسکن بنائے ہوئے ہیں، ایسے میں کشمیر کی بابت ایک اصولی موقف قائم کرنا، اور یہ جانتے ہوئے کہ ہندوستان کی ایک بڑی آبادی اسے ناپسند کرے گی، آسان نہ تھا۔ نیلسن منڈیلا کی طرح وہ اس مسئلہ پر کسی مصلحت کا شکار نہ ہوئی اور جذبہ حریت اور عالمگیر انسانی اخوت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار بے باکانہ کیا:

"To me, it seemed like tears, which the saint shed over the division of Kashmir from its actual destination, Pakistan. Not only geographically, but also on the basis of its religious affinity this place, at time of partition, should have been made part of Pakistan, because eighty percent of its population were Muslims. Only the family of the rulers were Hindus, on the basis of a strange 'deal', made with the British in the middle of the nineteenth century."76

شمل کے جملہ اختصاصات اور اعزازات کی بابت واغمر نے اہم معلومات بہم پہنچائی ہیں؛ اور ڈاکٹر اکرام چغتائی کی معیت میں شمل کی کتب کی فہارس بھی مرتب کی ہیں اور اس ضمن میں وہ بہت فکر مند رہے۔ جہاں تک شمل کے لیکچرز کا تعلق ہے تو یہ بات پہلے کی جاچکی ہے کہ ان کی بیشتر تصانیف کے منصہ شہود پر آنے کا سبب ان کے یہی لیکچرز تھے جو انھوں نے گاہے گاہے دنیا بھر میں دیے:

"Each year she visited London to teach or deliver lectures to the Al-Furqan Foundation, Cambridge University, Institute of Ismaili Studies, the Indo-Muslim Federation, Iran Heritage Foundation, Nehru Centre, Oxford Centre for Islamic Studies, the Royal Asiatic Society, School of Oriental and African Studies, Search Committee (UK) where hundreds of people flocked to hear her."77

اور بہت سی جگہیں جہاں انھیں لیکچرز کے بلایا گیا ان کی بابت تفصیلات خود نوشت (ORIENT AND OCCIDENT) میں موجود ہیں اور کچھ اختصار سے ان کا ذکر بحوالہ واغمر کچھ یوں ہے:

"She was also invited to present the Committee on the History of Religions Lectures at sixteen Canadian and American universities - a record - in 1980 as well as the Kevorkian Lectures, New York University (1982) and, a decade later, the Bampton Lecture at Columbia University."78

شمل کی مخلصانہ علمی اور فکری کاوشوں کا اعتراف ہر جگہ ہوا اور انھیں بہ نگاہِ تحسین دیکھا گیا؛ اس ضمن میں بین الاقوامی برادری نے ہر نوع کے تعصب سے بالا ہو کر ان کو مختلف مواقعوں پر یاد رکھا۔ سندھ، اسلام آباد اور پشاور یونیورسٹیز نے انھیں اعزازی ڈاکٹریٹ سے تو نوازا ہی تھا، سوئیڈن میں اپسالہ (UPPSALA)، ترکی میں قونیہ،

ایران میں تہران اور مصر میں الازہر یونیورسٹی بھی اس امتیاز رسائی میں پیچھے نہ رہی اورانھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دینے میں افتخار محسوس کیا۔

شمل کو پاکستان میں ملنے والے ایوارڈز میں ستارۂ قائدِ اعظم (۱۹۶۵)، ہلالِ امتیاز (۱۹۸۳) اور پہلا بین الاقوامی اقبال ایوارڈ (۱۹۹۸) قابلِ ذکر ہیں۔۷۹ مزید صراحت ذیل کے اقتباس میں ہے جو ان کے عالمی اعزازت واختصاصات کی بابت معلومات فراہم کرتا ہے:

"Schimmel was the first female President of the International Association of the Study of Religion (1980); honorary member of the American Academy of Arts and Sciences, Royal Asiatic Society, Deutsche Morgenlandische Gesellschaft, Royal Dutch Academy of Letters and Middle East Studies Association of North America. Among numerous accolades she also received UCLA's Giorgio Levi della Vida Medal (1987); her nation's highest civil award, the Grosses Bundesverdientskreuz (1989); the Organisation of Islamic Conference's IRCICA Gold medal (1990); the first female recipient of Tubingen University's Dr. Leopold Lucas Prize towards Christian, Jewish and Muslim understanding (1992); Egypt's Order of Science and Art (1996); Arts and Sciences Award of the Turkish Republic (1996); and the Uzbek Order of Friendship Award (2002)."80

مزید براں کئی ایک جگہیں ان کے نام سے معنون ہوئیں، شاہراہوں کے نام اور لسانی و ثقافتی مراکز ان کے نام پر رکھے گئے۔ غرض ان کو یاد رکھتے ہوئے ٹھٹھہ کے ماکلی قبرستان میں ایک فرضی قبر کی تعمیر ہوئی اور اسکا پس منظر کچھ یوں ہے:

"پیر حسام الدین راشدی سے آپا شمل کے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ ان کی وفات کے بعد وہ بہت دنوں تک مغموم رہیں اور مجھ سے کہا کہ وہ مرنے کے بعد ٹھٹھہ میں پیر حسام الدین کی قبر کے برابر میں دفن ہوں گی۔"۸۱

پیر حسام الدین راشدی جن کی پہچان کے متعدد اہم حوالہ ہیں کا انتقال اپریل ۱۹۸۲ء میں ہوا بعض امور میں شمل کے راہ نما تھے اور ان کا نام، شمل کی خودنوشت میں انتہائی احترام سے لیا گیا۔ شمل ایشیا کے سب سے بڑے قبرستان (ماکلی قبرستان) جسے یونیسکو عالمی ثقافتی ورثہ قرار دے چکا ہے میں دفن ہونا چاہتی تھیں لیکن والدہ کے انتقال کے بعد ان کا

ارادہ بدل گیا اور جیسا کہ وہ اپنی والدہ کے مذہب کو چھوڑنے پر خود کو آمادہ نہ کر سکیں۸۲ اسی طرح والدہ کے انتقال کے بعد انھی کے قرب میں دفن ہونا مناسب خیال کیا۔

قرۃالعین حیدر نے اپنے ناول 'آخرِ شب کے ہمسفر' میں کہا کہ والدہ کی تہذیب اولاد پر حاوی رہتی ہے کچھ یہی شمل کے حوالہ سے بھی دیکھنے کو ملا۔ اس بابت ایک انتہائی اہم صراحت ڈاکٹر علی آسانی کی جانب سے کچھ یوں سامنے آئی:

> "I am aware that she wanted to be buried in Makli Hills but in the last year or so she has mentioned to her legal executor and to me that she would rather be buried in Bonn next to her mother -- she has bought a plot there. She thought making arrangements in Makli Hills would be far too complicated. So accordingly I believe her executor will be making plans to have the funeral take place in Bonn." ۸۳

اسلام سے بے پناہ محبت کے باوجود، پروٹیسٹنٹ عیسائی کی حیثیت سے شمل اسی برس (۸۰) سے کچھ اوپر، ۲۶ جنوری ۲۰۰۳ء کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملتی ہیں اور بون (BONN) میں اپنی والدہ کی قبر کے ساتھ دفن ہوئیں۔ ماکلی قبرستان میں ان کے دفن ہونے کی خواہش کو علامتی طور پر عملی جامہ پہنایا گیا اس ضمن میں سابق ڈائریکٹر، اقبال اکیڈمی لاہور، محمد سہیل عمر صاحب کا بیان کچھ یوں ملتا ہے:

"A dignified ceremony was held in the Makhdum Muhammad Hashim Thattvi Enclave at Makli on the 7th April 2004, attended by the representatives of the Ministry, Director Iqbal Academy Pakistan, Madam Dr. Nasira Javid Iqbal, Mr.Helmut Holzheuer (the German Consul), Mr. Ghulam Rabbani Agro (DG Sindhi Adabi Board), Prince Nawab Mohsin Ali Khan (London), renowned Iqbal painter

Mr. Aslam Kamal, distinguished Pakitani scholars Mr. Ibrahim Joyo, Mr. Ikram Chagatai, Director Pakistan Academy of Letters and other dignitaries from Lahore, Karachi and Hyderabad..........The memorial plaque was unveiled. It had the inscripation of the verses of Quran, a quote from the Hadith of Prophet, dates of her birth/death and mention of her desire for burial in Makli, and two verses from Shah Latif Bhitai in her own translation."84

جرمنی میں تدفین کے موقع پر بہت سی اہم مسلم شخصیات بھی موجود تھیں اور انھوں نے باہم مل کر شمل کا غائبانہ جنازہ بھی پڑھا؛ اور یہ دورِ حاضر کا ایک منفرد وقوعہ تھا کہ اگلے وقتوں میں تو ایسا سننے ، پڑھنے کو ملا کہ فلاں درویش، قلندر کے گزر جانے پر ہندو اور مسلمانوں کے ہاں تنازعہ کھڑا ہوا کہ مرنے والا ان کا عقیدہ رکھتا تھا لیکن یہ عجب صورتحال تھی کہ شمل کی تدفین پروٹسٹنٹ طریق پر ہونے کے باوجود مسلمانوں نے انھیں اپنا سمجھا اور دعائے خیر کے ساتھ نمازِ جنازہ بھی پڑھی۔ شمل کی بابت وائیڈنر کا یہ کہنا کسی قدر درست معلوم ہوتا ہے:

"With the death of Annemarie Schimmel on the 26th of February 2003, an epoch has truly come to an end in the dialogue between Germany and the Islamic world. This doesn't mean that cultural dialogue as such will come to an end or break off, but rather that it will take on completely new, hitherto unknown forms, possibly differing greatly from our previous understanding of such involvement.

These new aspects will be outlined later after an attempt at more precise delineation of how cultural dialogue was comprehended during the epoch that has now concluded, an epoch initially shaped at the start of the 19th century with Annemarie Schimmel as its last great representative."85

حواشی:

1: Waghmar, Burzine K. "Obituary: Professor Annemarie Schimmel (April 7, 1922 to January 26, 2003)." Journal of the Royal Asiatic Society. 13.3 (2003): 377-379. Print.

2: Schimmel, Annemarie. Orient and Occident- My life in East and West.Lahore: Iqbal Academy Pakistan, 2007. p.4.Print.

3: Schimmel, Annemarie.A life of learning (Charles Homer Haskins Lecture).American Council of Learned Societies.ACLS Occasional Paper No. 21.1993. p.7. Print

4: : Schimmel, Annemarie. Orient and Occident- My life in East and West.p.3

5: Ibid p. 18

6: : Schimmel, Annemarie. "A good word is like a good tree." Periodical Islamica 6.1(1996): p. 2

(Provided by M. Sohail Umer)

7: Chagtai, M. Ikram. Prof. Annemarie Schimmel (The Scholar and the Saint). (Paper presented on the occasion of the ceremony, held in Lahore on 12th February 1998, in which the International Iqbal Award, was bestowed on Prof. A. Schimmel.) Provided by M. Sohail Umer

8: Schimmel, Annemarie.A life of learning. p.8

9: Schimmel, Annemarie. Orient and Occident- My life in East and West.p.17

10: Schimmel, Annemarie. Orient and Occident- My life in East and West.p.41

11:Weidner, Stefan. "ON THE THRESHOLD OF A NEW EPOCH" Art and Thought-Fikrun wa Fann. 42st (3rd) year 79.4(June 2004 – November 2004) p.65

12: Schimmel, Annemarie. Orient and Occident- My life in East and West.p.16

13: Schimmel, Annemarie.A life of learning. p.7,8

14: Schimmel, Annemarie. Orient and Occident- My life in East and West.p.10

15:Ibid.p.29,30

16: Ibid.p.p.32

17: Ibid.p.33

18: Chagtai, M. Ikram. Prof. Annemarie Schimmel (The Scholar and the Saint).

19: Schimmel, Annemarie. Orient and Occident- My life in East and West.p.34

20: Ibid. p.62

21: http://news.harvard.edu/gazette/story/2004/12/annemarie-schimmel/

22: Chagtai, M. Ikram. Prof. Annemarie Schimmel (The Scholar and the Saint). p.4, 5

23: Schimmel, Annemarie. Orient and Occident- My life in East and West.p.39

24: Ibid. p.39

25: http:// news.harvard.edu/gazette/story/2004/12/annemarie-schimmel/

26: Waghmar, Burzine K. "Obituary: Professor Annemarie Schimmel. p. 377,378

27: Schimmel, Annemarie. Orient and Occident- My life in East and West.p.87

28: Waghmar, Burzine K. "Obituary: Professor Annemarie Schimmel.p. 378

29: Schimmel, Annemarie. Orient and Occident- My life in East and West.p. 87

30: Ibid. p. 67

31: Ibid. p.**240**

32: Chagtai, M. Ikram. Prof. Annemarie Schimmel (The Scholar and the Saint). p.7

33: Schimmel, Annemarie. Orient and Occident- My life in East and West. P.241

34: Ibid. p. 65

35: Ibid. p.241

36: Ibid. p. 71,85

37: Ibid. p.73

38: Chagtai, M. Ikram. Prof. Annemarie Schimmel (The Scholar and the Saint). p.6

39: en.wikipedia.org/wiki/annemarie_schimmel.

۴۰: آنیماری شمل کی بابت راقم کی ڈاکٹر اکرام چغتائی سے متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ پہلی بار ۶ جنوری ۲۰۱۶ء کو (پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس کی مرکزی لائبریری میں) قریباً اڑھائی بجے دوپہر ملاقات ہوئی اور یہ نشست چار (۴) بجے تک جاری رہی۔ دوسری بار ۱۱ جنوری ۲۰۱۶ء کو غالباً اولڈ کیمپس کی مرکزی لائبریری میں ملنا ہوا۔ دورانِ گفتگو جہاں اور بہت سے اہم معاملات موضوعِ بحث بنے، وہیں شمل کی شادی کے معاملہ پر بھی حقائق کا تبادلہ ہوا۔

41: Chagtai, M. Ikram. Prof. Annemarie Schimmel (The Scholar and the Saint). p.6

۴۲: استنبول یونیورسٹی کے خلیل طوقار صاحب سے رابطہ کیا اور ان سے شمل کی شادی کے بارے میں دریافت کیا۔ جواباً ان کی ای میل بتاریخ ۳ مئی ۲۰۱۶ء کو موصول ہوئی اور اس کا متن یہ تھا:

As far as I know, Annemarie Shimmel's husband was a Turk when she worked for Ankara University in Ankara. After that they got divorced and she went back to Germany.

۴۳: اختر الواسع اور فرحت اللہ خان (مرتبین) دانائے راز، این میری شمل۔ نیو دہلی: مکتبہ جامعہ نئی دہلی لمیٹڈ، ۲۰۰۳ء ص ۱۸، ۱۷

44: Hofmann, Murad W. "Book Review: Morgenland Und Abendland: Mein West-Östliches Leben ("orient and Occident: My West-Eastern Life")." Islamic Studies. 41.4 (2002): P. 737. Print.

45: Schimmel, Annemarie. Orient and Occident- My life in East and West. P.82

46: Waghmar, Burzine K. "Obituary: Professor Annemarie Schimmel.p. 378

47: Weidner, Stefan. “ON THE THRESHOLD OF A NEW EPOCH” P.

۴۸: اسٹیفن وائیڈنر جو اس وقت مؤقر جرمن جریدے "فکرو فن" کے ایڈیٹر ہیں سے رابطہ ہونے پر (۲۳ مئی ۲۰۱۶ء کو ای میل اور آرٹیکل موصول ہوا) مندرج متن کی بابت آگاہی ہوئی۔

49: Waghmar, Burzine K. "Obituary: Professor Annemarie Schimmel.p. 378

50: Schimmel, Annemarie. Orient and Occident- My life in East and West. P.151

51: Hofmann, Murad W. "Book Review: Morgenland Und Abendland: Mein West-Östliches Leben.p.739

52: Schimmel, Annemarie. Orient and Occident- My life in East and West. P.161

53: Ibid. 180

54: Waghmar, Burzine K. "Obituary: Professor Annemarie Schimmel.p.378

55: Ibid p. 378

56: Schimmel, Annemarie. Orient and Occident- My life in East and West. P.174

57: Saeed A.Durrani, Professor. Ed. Remembering the Scholar-Hermit, Proceedings of the Annemarie Schimmel Commemorative Seminar.Lahore: Iqbal Academy Pakistan, 2005. P.40

58: Schimmel, Annemarie. Orient and Occident- My life in East and West. P.132

59: Saeed A.Durrani, Professor. Ed. Remembering the Scholar-Hermit. P.40

60: Schimmel, Annemarie. Orient and Occident- My life in East and West. P.250,251

61: Ibid. P.121,143,205

62: Ibid.P.161.

63: Schimmel, Annemarie. Nightingales Under the Snow.London, Newyork: Khaniqahi Nimatullahi Publications, 2d.ed.1997. p.18.

64: Interfaith Thanksgiving for the life of Anne-Marie Schimmel. London: ames's Church, Piccadilly, 8U1.66N74 Eng. INT-S 2003.(available at Iqbal Academy).

65: Saeed A.Durrani, Professor. Ed. Remembering the Scholar-Hermit. P. 71

66: Schimmel, Annemarie. Orient and Occident- My life in East and West. P.287

67: Ibid.P.157

۶۸:اختر الواسع اور فرحت اللہ خان (مرتبین) دانائے راز، این میری شمل۔ ص ۱۰

69: Saeed A.Durrani, Professor. Ed. Remembering the Scholar-Hermit. P.52

70: Schimmel, Annemarie. Orient and Occident- My life in East and West. P.113

71: Ibid. 211,212

72: Weidner, Stefan. "ON THE THRESHOLD OF A NEW EPOCH"P. 62

73: Schimmel, Annemarie. Orient and Occident- My life in East and West. P. 284

74: Ibid. P.287

۷۵:اختر الواسع اور فرحت اللہ خان(مرتبین)دانائے راز،این میری شمل۔ص ۱۹

76: Schimmel, Annemarie. Orient and Occident- My life in East and West. P.261

77: Interfaith Thanksgiving for the life of Anne-Marie Schimmel.

78: Waghmar, Burzine K. "Obituary: Professor Annemarie Schimmel.P.378

79: Ibid.

80: Ibid.

۸۱:اختر الواسع اور فرحت اللہ خان(مرتبین)دانائے راز،این میری شمل۔ص ۱۸

۸۲:ایضاً

۸۳:مذکورہ متن ڈاکٹر علی آسانی کی ای میل کا ہے جو انھوں نے محترمہ ناصرہ اقبال کو ۲۷ جنوری ۲۰۰۳ء کو ارسال کی۔

(ای میل کا عکس ڈاکٹر سہیل عمر صاحب کے توسط سے وصول ہوا)

84: Umar, M. Suheyl. DR. ANNEMARIE SCHIMMEL DESIRED TO BE BURIED IN MAKLI GRAVEYARD, THATTA. ENG. 8U1.66N74. UMA-D 2010.38342.

85: Weidner, Stefan. "ON THE THRESHOLD OF A NEW EPOCH"P.61

بابِ سوم

حصہ اوّل: دردؔ اور شکوہ

اس باب میں شمل کے ان تحقیقی و تنقیدی مطالعات کی جانچ کی گئی ہے جو وقتاً فوقتاً کتب کی صورت شائع ہوئے۔ اس ضمن میں اردو ادب کی وقوعاتی، زمانی ترتیب کو ملحوظ رکھا ہے اور کوشش کی ہے کہ جملہ اہم کاوشوں کو نشان زد کیا جائے اور اردو سے ان کی وابستگی پورے طور پر سامنے لائی جائے۔ یہاں اس امر کا بھی خیال رکھا گیا ہے کہ صرف ان شخصیات کو گفتگو کا حصہ بنایا جائے جو اردو سے براہِ راست متعلق ہیں اور جن کی کدو کاوش ادبِ مذکور میں مسلّمہ ہے۔

PAIN AND GRACE –A Study of Two Mystical Writers of Eighteenth-Century Muslim India ایک اہم تحقیقی مطالعہ ہے جس میں شمل اپنے تفحص کو بڑے شاندار انداز پر پیش کرتی ہیں۔ یہ کتاب اٹھارہویں صدی عیسوی کی دو اہم صوفی شخصیات حضرت خواجہ میر دردؔ اور حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کو مرکزِ نگاہ بناتی ہے جن کا تعلق ہمارے اِس خطہ سے ہے جہاں تصوف علمی و عملی رجحان لیے ہمیشہ لوگوں میں مقبول رہا اور صوفی احترام کی ایک معاشرت، فروغ دینے میں کامیاب رہا۔ PAIN یعنی 'درد' کا تعلق معنوی اعتبار سے حضرت خواجہ میر دردؔ اور GRACE یعنی 'شُکُوہ' کا لفظ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے لیے مخصص ہے۔ قریباً تین سو دس (۳۱۰) صفحات کو محیط یہ کتاب پہلی بار ۱۹۷۶ء میں لیڈن سے E.J.Brill نے شائع کی اور پاکستان سے ۲۰۰۳ء میں (سنگِ میل کی جانب سے) شائع ہوئی۔ کتاب کا بیشتر حصہ میر دردؔ، ان کی زندگی، تحصیل علم، واردات و کیفیات اور تعلیمات سے متعلق ہے۔ کتاب کے آغاز میں اٹھارہویں صدی عیسوی کے جملہ سیاسی، تہذیبی اور مذہبی معاملات کو ژرف بینی سے پیش کیا گیا ہے۔

سندھ، پنجاب اور ہندوستان کا شمالی و جنوبی حصہ صدیوں ایسی بزرگ ہستیوں کو متعارف کراتا رہا جو اسلام اور باہمی رواداری کے پھیلاؤ اور نسلِ انسانی کے دکھوں اور غموں کو بانٹنے میں بڑی حد تک مددگار رہیں۔ غرض ہندوستان میں

پے در پے وارد ہونے والی بزرگ ہستیاں اپنے افکار و خیالات کے مع یہاں مقامی ثقافتوں پر اثرانداز ہوئیں اور بتدریج عوام الناس میں گھل مل گئیں اور یوں مقامی، قدیمی تہذیب کا نقشہ تک بدل گیا۔ برصغیر میں صوفیاء کا ورود اسلام کے جمالی چہرے کا ایک ایسا عکس تھا جو آج بھی تابندہ و روشن ہے، اور شمل اس بابت اپنی کتاب MYSTICAL DIMENTIONS میں سیر حاصل بحث کر چکی ہیں۔

حضرت خواجہ میر دردؔ نہ صرف اردو ادب میں متصوفانہ شاعری بلکہ سلسلہ نقشبندیہ کے ایسے صوفی بزرگ ہیں جو اپنے افکار و خیالات اور کرداری اوصاف کے سبب اٹھارہویں صدی عیسوی کی قابلِ قدر شخصیت قرار دیے گئے۔ انتیس برس کی عمر میں درویشی اختیار کرنے والی ہستی ا جنھیں ڈاکٹر سیّد عبداللہ صاحبِ حال اور صاحبِ قال کے علاوہ اردو کے پہلے باقاعدہ صوفی شاعر قرار دیتے ہیں کے شکوہ کا یہ عالم تھا کہ وقت کے حاکم بھی ان کے در پر حاضری ایک بڑی سعادت جانتے تھے۔ اردو، فارسی شعر و ادب، اور موسیقی میں بھی یگانہ رُوزگار تھے اور تصوف کی بہت سی قابلِ ذکر کتابوں کے مؤلف تھے جن میں اسرارالصلٰوۃ، واردات، علم الکتاب، نالۂ درد، آہِ سرد، شمعِ محفل اور دردِ دل شامل ہیں اور چند کتابیں (سوزِ دل، واقعاتِ درد اور حرمتِ غنا) غلط فہمی کے سبب ان سے منسوب ہوئیں اور جنھیں بہت سے جگادر محققین ان کی کتب بتاتے ہیں۲

یہ کتاب "درد اور شُکُوہ" جہاں اٹھارہویں صدی عیسوی کے جملہ سیاسی اتار چڑھاؤ اور بہت سے صوفیا کرام کا تعارف پیش کرتی ہے وہیں فارسی زبان کے پہلے باقاعدہ صوفی تعارف کے سلسلہ میں "کشف المحجوب" کا ذکر خاص طور سے کرتی ہیں۔ سلسلۂ چشت کی بابت اِن کی یہ رائے متاثر کن ہے:

"The most influential among them is Khwaja Muinuddin Chisti (d. 1236) from Eastern Iran, who settled in Ajmer in the heart of Rajasthan that had just been conquered by the Delhi kings. His strong personality, his preaching of love of the one God and love of the Prophet, reflected in love of mankind, won over considerable numbers of Hindus to Islam.

His disciples and later members of the order wandered through the whole of India, from the Punjab (Fariduddin Shakarganj of Pak-pattan, d. 1265) to the Deccan (Gisudaraz of Gulbarga, d. 1422). One of the centers of the Chishtiyya was Delhi, where Nizamuddin Auliya (d. 1325) spiritually guided the population during the reign of seven rulers."3

بات کو آگے بڑھاتے ہوئے شمل اس نتیجہ تک پہنچتی ہیں کہ یہ نقشبندی سلسلہ کی جملہ کاوشوں کا حاصل ہے کہ ۱۷۰۰ء کے قریب، اورنگزیب کی وفات کے بعد لسان کا ایک اور میڈیم، مذہبی افکار کی ترسیل کے لیے تلاش کیا گیا اور یہ فارسی پر غلبہ پاتے ہوئے زبانِ اردو کی صورت متشکل ہوا۔[۴]

اردو زبان کے پس منظر میں جن دیگر افرادو شخصیات کا حوالہ ملتا ہے، شمل نے ان کے تعارف میں فراخی کا مظاہرہ کیا یعنی سعد اللہ گلشن، دردؔ کے والدِ محترم حضرت خواجہ ناصر عندلیبؔ، میر حسن اور شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی کے ساتھ مرزا مظہر جانجاناں کا ذکر خاص طور سے موجود ہے، غرض شمل نے بڑی صراحت کے ساتھ اردو کی وقوع پذیری کو پیش کیا اور ایک ایسے موضوع سے مغرب کو شناسا کرنے کی کوشش کی جس سے عموماً اعراض ہی برتا گیا۔ مغرب میں حضرت خواجہ میر دردؔ کی شخصیت اور ان کے افکار کو بہت کم جاننے کی کوشش ہوئی، اس اعتبار سے یہ ایک ایسا شاندار تعارفی اظہار ہے جس نے نہ صرف شمل کی تحقیقی جستجو کو وقار بخشا بلکہ میر دردؔ کی صوفیانہ شناخت میں خاطر خواہ اضافہ بھی کیا۔ ان کے اِس تفحص کی بابت ذیل کی عبارت اہم ہے:

"Schimmel's study points out that the Sufis, by stressing unity and the greatness of the Prophet Muhammad and his family in their mystical poems, were more effective in spreading Islam in India than the theologians' lawyers. The themes of unity and love are explored with great sensitivity to the nuances of Sufism, Islam, India, and poetry. Pain and Grace is a valuable contribution study of religion that focuses on a poignant moment in the turbulent relation Islam and Hinduism in northern India."5

خواجہ میر دردؔ پر بات کرتے ہوئے شمل نے حتی الامکان کوشش کی کہ کسی زاویہ سے کوئی پہلو تشنہ نہ رہے۔ میر دردؔ کی پیدائش، ان کی تعلیم وتربیت، والد خواجہ ناصر عندلیب کی خاص توجہ اور پھر میر دردؔ کی ان سے والہانہ وابستگی، سرّی صوفی مکاشفات و تجربات، غرض وارداتِ قلبی سے مملو کیفیات کی تفصیل سے لے کر اپنے شعری مجموعے 'بر فباری میں بلبلیں' (NITINGHALES UNDER THE SNOW) کی وجہ تسمیہ تک کے حوالے موجود ہیں۔ دردؔ فہمی میں شمل کی آراء متعدد مواقعوں پر قاری کو متاثر کرتی ہے:

“He became the undisputed master of Mystical Urdu poetry, and is probably the only poet who has achieved a complete blending of Mysticism and verse. His poems are short, often composed in short meters, too, and their imagery, though following traditional love-lyrics, reflects the loneliness of the great mystic.”6

دردؔ کی امیجری خاص طور سے کتاب کا موضوع بنتی ہے اور بین السطور شمل کی تنقیدی و تحقیقی احتیاط کا اندازہ کیا جاسکتا ہے اور ہمیں وہی حقائق دیکھنے، پڑھنے کو ملتے ہیں جو دردؔ کی بابت مستند کتابوں میں موجود ہیں۔ بنیادی طور پر کتاب جہاں مصنفہ کے لیے خود آگاہی کا ایک وسیلہ ہے وہیں یہ اہلِ مغرب کو ہندوستان اور خاص طور سے شمالی ہندوستان اور سندھ کی شاندار صوفی روایت سے بہرہ مند کرتی ہے۔ کتاب کے وہ حصے خاص طور سے دیکھے جانے کے لائق ہیں جہاں کئی زاویوں سے صوفیانہ رموز کی گرہ کشائی کی گئی ہے۔ کلاسیکل شاعری کا عمق تلاش کرنے اور شعری روایت سے آشنائی کی مہارت ہر ورق پر متاثر کرتی ہے:

“We find a great number of verses with this imagery in Dard’s Persian and Urdu lyrics and he has commented upon this imagery in a long-winded paragraph...; the morning, bearing the shirt of night is like the poet’s breast out of which the heart comes sun-like...; but the longer the more he sees in the whiteness of dawn a reminder of the shroud.”7

تصوف شمل کا پسندیدہ موضوع ہے جس پر بات کرتے ہوئے وہ کِھل اٹھتی ہیں اور اس پر بے تکان معنی خیز گفتگو کر سکتی ہیں۔ میر دردؔ کی بابت جب وہ اپنا تفحص پیش کرتی ہیں تو اس کے پس منظر میں مسلم متصوفانہ روایت عموداً کھڑی نظر آتی ہے اور روایت کی یہ عمارت اس قدر پر شکوہ ہے کہ ہمیں بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ شمل کا اصل طنطنہ یا رزم گاہ یہی متصوفانہ آگاہی ہے جسے بنیاد بنا کر اسلام کا نہ صرف عشق اساس جمالیاتی روپ نکھارا بلکہ اسے ڈھنگ سے متعارف بھی کرایا:

"The Mystics of Islam summarized during the Middle Ages in two well-known sentences. 'He who knows God becomes silent' (= 'his tongue becomes short') and 'He who knows God becomes talkative' (= 'his tongue becomes long'). In the last bewilderment of union, or in the amazement of him who recognizes himself as the mirror of the radiant and ineffable Divine beauty, speech is no longer possible, and the mystic remains 'breathless with adoration' or 'drowned in the sweat of bewilderment like a mirror' without opening his mouth."8

ہم سب جانتے ہیں کہ میر دردؔ کے ہاں شمع کی علامت بکثرت استعمال ہوئی ہے اور اس سیاق میں اس صوفیانہ تہذیب کو دیکھا سکتا ہے جس کا ایک رنگ مذکورہ بالا اقتباس میں موجود ہے۔ دردؔ کے ان متعدد شعروں کے حوالہ دیے جا سکتے ہیں جن میں شمع کی علامت ان کی ذات سے جڑ کر ایک جدا تفہیم کا سبب بنتی ہے۔

؎ رات جب پہنچا میں اس کے روبرو

جوں زبانِ شمع گم تھا مدعا

یا

؎ شمع کے مانند ہم اس بزم میں

چشمِ نم آئے تھے، دامن تر چلے

شمل نے دردؔ کے اس زور آور استعاراتی بیانیے کو کمال مہارت سے منکشف کیا ہے۔ مولانا رومؒ، غالبؔ، اردو اور فارسی متصوفانہ روایت، ان سب کا بیان اس قدر صراحت لیے ہوئے ہے کہ ان کے عمیق مطالعے پر رشک آتا ہے:

"He is like the candle, not only as the radiant light of the assembly but also in his constant melting from the fire of love, weeping with his eyes widely open..., and the reed of his pen is changed under the flow of inspiration, into a complaining reed flute- a reminiscence of the immortal introductory poem of Jalaluddin Rumi's Mathnawi, the 'Song of the Reed,' which has furnished innumerable poets with symbols....But it is only those who have an eye to see with whom such a candle can speak-it is silent for those with blind hearts. By shining for them, the candle Dard has become an affliction and consuming pain for himself. But that means that he needs no longer candles for his meetings: he brings the burnt scars of his heart which will unfold into fireworks, as Ghalib would say a century later."9

اردو زبان میں حضرت خواجہ میر دردؔ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ان کی شخصیت اور ان کے افکار کی بابت بہت سے پر مغز مقالات دیکھنے کو ملتے ہیں اور متعدد زاویوں سے آپؒ کی شخصیت کو سمجھنے اور جاننے کی کوشش ہوئی، لیکن ایک خاتون مستشرق کا ان کی بابت گراں قدر مطالعہ پیش کرنا، اردو کے قاری کے لیے کئی حیرتوں کا موجب ہے اور یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ایک مغربی خاتون ہمارے کلاسیکل صوفی ادب کا بار کس تندہی سے اٹھائے ہوئے ہے۔ میر دردؔ کا مطالعہ ایک مکمل صوفی پس منظر کے ساتھ قاری سے مکالمہ کرتا ہے۔ سنین میں کہیں تفاوت ہو سکتی ہے، ناموں کے بیان میں کہیں کوئی فروگزاشت ہو سکتی ہے لیکن صوفی ڈسپلن اور ان میں موجود فکری ضابطوں کی بابت معلومات کی فراہمی پر انگشت نمائی ممکن نہیں۔ ہر سری و جلی فکری گوشہ کی وضاحت اور تفصیل میں موجود اعتماد یہ ثابت کرتا

ہے کہ مؤلفہ نے اس موضوع پر قلم اٹھانے سے قبل مسلم صوفی تاریخ اور ان میں موجود نظری اختلافات کو ہر رخ سے سمجھ کر بات آگے بڑھائی ہے۔ اسی لیے D.J.MATHEW کا یہ کہنا درست ہے:

"The innumerable cross-references to the Arabic and Persian works of those who preceded and influenced the two poets under discussion, which are often outside the grasp of many scholars who attempt such studies, but which are essential to a complete understanding of their works, form the most valuable part of this book."10

شمل کے صوفی تبحر اور لائقِ ذکر تفحص پر ذیل کی عبارت دال ہے:

"Uninformed people think that only the immature Sufis talk too much and open their lips to show the Divine-mysteries, whereas those ' with mature brains' are silent. This is however, according to Dard's opinion, not correct; for those who are spiritually enlightened are always prone to explain their experiences with the purpose of guiding people the right path....In short, each limb, each hair of his is a witness of God's creative power and God's Unity.........the expression for index-finger is angusht-i- shahadat, containing the expression shahadat, 'profession of faith'; ' tune of tauhid' contains a pun on maqam, which means not only 'tune' but likewise 'mystical station.' Thus, not only his words, but his whole state, 'Hal', speaks of God and witnesses His Unity."11

اس نوع کے متعدد علمی مکاشفات کتاب کی فکری تزئین میں معاون ہیں۔ آپ کتاب پڑھتے چلے جائیں گے، اور پُر اثر نِکات، آپ کے خیالات کو ایک بلند سطح پر برابر آگے بڑھائیں گے؛ کئی ایسی نئے امور بھی سامنے آئیں گے جو بہت کم رقم ہوئے یا پڑھنے کو ملے، مثلاً میر دردؔ کے حوالہ سے شفاعت کا معاملہ ایک نئی فکری بنت لیے ہوئے ہے۔ ہم مسلمان بہ حیثیت مجموعی نبی اکرم ﷺ کو شفیعِ محشر بطور عقیدہ، تسلیم کرتے ہیں اور آپؐ کی ذاتِ اقدس ہی کو اپنے

لیے نجات و برأت کا وسیلہ مانتے ہیں جبکہ میر دردؔ اس ضمن میں مذکورہ مسلم عقیدہ رکھنے کے باوجود اپنے والدِ محترم کو بھی اپنے لیے نجات کا سبب قرار دیتے ہیں۔ شمل نے کمال مہارت سے اس ایقانِ دردؔ کو نشان زد کیا ہے:

" In Dard's case, the problem of intercession becomes slightly complicated because he usually adds the hope for his father's help to normal expressions about intercession: he takes refuge not only in the Prophet but also in the ' Prince of the Muhammadans' ....and hopes that God will not leave him with blackened face in the presence of the lightful personality of his father, whose grace and help is implored......As much as Dard trusts in God's absolute forgiveness as much does he repeat his relation with his father-."12

شمل کی دردؔ فہمی کا ایک اور علمی زاویہ ان کا شعری مطالعہ اور پھر اس کا انگریزی ترجمہ ہے۔ اس ضمن میں ہم صرف اردو کے چنیدہ اشعار ہی کا انتخاب کریں گے کہ فارسی اشعار پر نقد و تحقیق راقم کے شعبہ جاتی ابعاد سے باہر کا معاملہ ہے اور اس پر معیاری علمی اہلیت کا اظہار فارسی کے اساتذہ و محققین ہی کر سکتے ہیں اور یوں بھی اردو و فارسی اب جدا ڈسپلن کے طور پر اپنی مخصوص شناخت رکھتے ہیں اور دونوں کے اہداف و مقتضیات کا تفاوت بھی اہلِ علم کی نظر میں ہے۔ چنانچہ راقم اپنے تخصص کی حدبندی بابت پر اعتماد ہے اوراس لیے دیگر علمی و ادبی اور لسانی شعبوں سے بے جا تعارض سے اجتناب کو اہمیت دیتا ہے۔ ذیل میں بیشتر اُن اشعار کا انتخاب کیا گیا ہے جنھیں شمل نے خود انگریزی میں ترجمہ کیا اور جو دردؔ کے اہم اور نمائندہ اشعار کہے جاسکتے ہیں۔

تجھی کو جو یاں جلوہ فرمانہ دیکھا

برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا ۱۳

شمل اس شعر کا ترجمہ کچھ یوں کرتی ہیں۔

If we not see Thee in Thy manifestation,

It is alike whether we see the world or not. 14

راقم کو اس شعر کے پہلے مترجَم مصرعہ میں سقم کا احساس ہوا، اور وہ یہ کہ دردؔ نے لفظ 'یاں' کو اس دنیا، کائنات کے معنیٰ میں برتا ہے اور یہ لفظ ان کی شاعری میں متعدد مواقعوں پر مذکور ہے۔ دردؔ اس سے ایک خاص نوع کا پیغام دیتے ہیں اور یہاں شمل اس مخصوص فکری زاویہ کو ٹھیک طور سے سامنے لانے میں ناکام نظر آتی ہیں۔ انگریزی زبان کا لفظ "Manifestation" جو ایک بھرپور جامع لفظ ہے کے معنیٰ 'اعلان'، 'وضاحت' یا 'تصریح' یہاں دردؔ کی فکر کو کاملاً نمایاں کرنے میں ناکام رہتا ہے اور وہ اس لیے بھی کہ شعر کا مقتضا کچھ اور ہے اور اس انگریزی لفظ کا مدعا کچھ اور ہے:

"An event, action, or object that clearly shows or embodies something abstract or theoretical."15

ایک حد تک لفظِ مذکور 'جلوہ فرمائی' کو نمایاں کرنے میں معاون ہے تاہم مصرعے کی معنویت کا ایک حصہ محذوف ہے۔

راقم فنِ ترجمہ نگاری کو ایک انتہائی مشکل اور پیچیدہ وقوع جانتا ہے۔ دنیا کی ہر بڑی زبان اپنے دامن میں ایک بھرپور ثقافت اور تمدن کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اُس زبان کو بولنے والے اور بہت سی قومیں، بہت سے علاقوں اور جغرافیائی خطوں میں منقسم ہو سکتے ہیں۔ ان کے عقائد و نظریات، طرزِ بودوباش اور رویے تک مختلف ہو سکتے ہیں۔ انسانی خواب، خوف اور امید کے اسباب اور امکانات یہ سب ایک زبان میں چھپ جاتے ہیں اور انھیں ٹھیک طور سے وہی لوگ جانتے ہیں جو اسے برتتے ہیں اور اسے اوڑھنا بچھونا بناتے ہیں، اس لیے کاملاً ایک زبان کے مفاہیم دوسری زبان میں منتقل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں، اور بعض اوقات ایسا ممکن بھی نہیں ہوتا؛ یہی سبب تھا کہ جب ہندوستان یا دنیا کے دیگر علاقوں کو مغربی طاقتوں نے اپنے زیرِ تسلّط لانا چاہا تو سب سے پہلے لسان کو اہمیت دی گئی کہ وہی ایک وسیلہ تھا جس کے سبب قومِ مخصوص کے باطن میں اترا جا سکتا تھا، اور اس امر میں وہ لوگ کامیاب ہوئے۔ راقم اس بابت تفصیل سے بابِ اوّل میں ان مباحث کو رقم چکا ہے لہٰذا نئے سرے سے ان کا بیان تضیعِ اوقات کے سوا کچھ

نہیں۔ شمل کے ہاں اگر تسامحات کی نوعیت معمولی ہے تو ان سے ایک حد تک صرفِ نظر کیا جا سکتا ہے اور وہ اس لیے کہ ان کا تعلق ایک بدیسی تہذیب و معاشرت سے ہے لیکن اگر شعر فہمی میں سرے ہی سے تفہیم و تعبیر کا سقم موجود ہے تو پھر اس پر گرفت ہونا بھی ناگزیر ہے۔

ایک اور زبان زدِ عام شعر دیکھیے:

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انساں کو

ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں ۱۶

شمل کا انگریزی ترجمہ کچھ یوں ہے۔

"Man Thou createdst for the pain of love-

Thou has Thy angels for obedience!" 17

ترجمہ بڑی حد تک مناسب ہے البتہ پہلے مصرعے میں موجود 'دردِ دل' کی ترکیب کا ترجمہ ' PAIN OF LOVE ' محلّ نظر ہے۔ اور پھر مذکورہ دونوں اشعار میں ذاتِ برحق کے لیے استعمال ہونے والے قدیمی کلاسیکی الفاظ انتہائی موزوں معلوم ہوتے ہیں۔ معروف برطانوی مستشرق محمد مارماڈیوک پکھتل

MUHAMMAD MARMADUKE PICKTHALL(1875-1936) نے بھی جب قرآنِ مجید کا انگریزی ترجمہ کیا تو احتراماً ذاتِ برحق اورآپؐ کے لیے THOU, THY اور YE ایسے قدیمی الفاظ استعمال کیے۔ شمل بھی احترام کے ان مقامات سے بخوبی آگاہ تھیں اور یوں بھی بہت سے مستشرقین کا کام ان کے سامنے تھا ایسے میں احتیاط کا معاملہ کچھ اور بڑھ گیا یہاں تک کہ تفاسیری القابات شعری تراجم میں در آئے اور یہاں بھی ان کا بیان لطف سے خالی نہیں۔ البتہ قاری کا ان الفاظ کے پس مناظر سے آگاہ ہونا ضروری ہے مثلاً لفظ "ye" ماضی کے

مختلف ادوار میں واحد اور جمع دونوں حیثیتوں میں مستعمل رہا۔ اس ضمن میں ذیل کا یہ اقتباس قابلِ قدر معلومات فراہم کرتا ہے:

"The history of the use of ye is complex. In the earliest period it was used only as the plural subjective form. In the 13th century it came to be used in the singular, equivalent to thou. In the 15th century, when you had become the dominant subjective form, ye came to be used as an objective singular and plural (equivalent to thee and you). Various uses survive in modern dialects."18

حضرتِ دردؔ کا ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیے۔

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بت خانہ تھا

ہم سبھی مہمان تھے واں، تو ہی صاحبِ خانہ تھا۱۹

شمل کا مترجَم اقتباس کچھ یوں ہے۔

Whether madrasa or monastery, whether Ka'ba or idol-temple

They were all guest houses, but you are the owner of the house.20

یہاں مترجم انگریزی، جدیدیت کا کچھ رنگ لیے ہوئے ہے اور ہمیں ذاتِ برحق کے لیے اب کلاسیکی الفاظ Thou یا Ye دیکھنے کو نہیں ملتے اور سادگی سے 'you' کا استعمال نظر آرہا ہے، اب یہ سمجھ سے بالا ہے کہ کیوں کر ایک ہی مترجم ضابطہ اس امر میں مخصوص نہ ہو سکا اور کہیں Thou ہے تو پھر کہیں You۔ اور یہ کتابت کی غلطی ہر گز نہیں۔ دونوں لفظوں کے اصوات و اشکال میں تفاوت ہے۔ اس شعر میں دوسرا مصرعہ معنٰی کے اعتبار سے کچھ جدا معلوم ہوتا ہے۔ مصرعے کا پہلا حصہ 'ہم سبھی مہمان تھے واں' کا ترجمہ 'They were all guest houses' کھٹکتا محسوس ہوتا ہے گو معنوی تفہیم میں کوئی بڑا خلا نظر نہیں آتا لیکن ترجمہ شدہ انگریزی الفاظ، شعر کے اس حصے سے مختلف ہیں۔ اور اس کا کریڈٹ ایک حد تک مترجِم کو جاتا ہے جو الفاظ کے چناؤ میں اپنی صوابدید پر عمل پیرا ہے اور

شعر کے ترجمہ سے منصفی بھی کر رہا ہے۔ اسی طرح ہم دردؔ کے ایک دو مزید اشعار دیکھ سکتے ہیں جن کا ترجمہ ایک حد تک موزوں معلوم ہوتا ہے۔

سر تا قدم زبان ہیں جوں شمع گو کہ ہم
پر یہ کہاں مجال جو کچھ گفتگو کریں۲۱

We are all tongues from head to feet, like candles,

But where would it be possible to talk? 22

شعر کا ترجمہ لفظی معلوم ہو رہا ہے۔ اور دردؔ کے شعر کا پہلا مصرعہ اور اس کی ایک ترکیب "شمع گو" کی تفہیم ترجمہ میں مفقود ہے۔ صنعتِ ایہام کا اگر ذکر نہ بھی کیا جائے تو کم از کم ایک سے زائد صراحت کا محل، بہر حال موجود تھا۔ ایک اور شعر لائقِ توجہ ہے۔

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۲۳

Woe, ignorant man, at the time of death this truth will be proved

A dream was, whatever we saw, whatever we heard, was a tale. 24

اس شعر میں تسامحات واضح طور پر کھٹک رہے ہیں۔ اول یہ کہ ignorant man کا اردو بدل شعر میں سرے سے ہی موجود نہیں اور پھر ماضی اور مستقبل کو اکھٹا کر دیا گیا ہے جو شعر کا مقصود ہر گز نہیں۔ پہلے مصرعے کا تعلق حال وقتِ موجود سے ہے جسے شمل مستقبل سے جوڑ رہی ہیں؛ لیکن اس کے باوجود ہمیں اس امر کا اعتراف ہے کہ شمل کی دردؔ فہمی صرف اشعار کے ترجمہ ہی تک محدود نہیں اور یوں بھی ترجمہ نگاری کسی شاعر، ادیب کے فن کو جاننے کی مجرّد سبیل نہیں۔ شمل کی دردؔ فہمی ہر طرح کے شک و شبہ سے بالا ہے اور ہم اس ضمن میں مختلف نِکات سے متعارض ہو چکے ہیں؛ البتہ جو انگریزی شمل نے اس کتاب میں برتی یا جو اسلوب برتا گیا اس پر ناقدین جز بز ہیں:

"Although the material will be of great interest to all who read the book, the most obvious defect is the style in which it is written. Many of the sentences are so laboriously and clumsily constructed that they have to be read several times before their meaning becomes clear, and in some cases the grammar and syntax of the English is vitiated to the extent of giving the text a comical appearance. A few random examples will suffice."25

شمل کی انگریزی لکھت سے ان کی فارسی تفہیم تک بہت سے اعتراض سامنے آئے اور شاید اس کی ایک بڑی وجہ ان کا مختلف النوع زبانوں میں لکھنا پڑھنا اور پھر ان میں متعدد موضوعات پر مطالعات پیش کرنا تھا جو یقیناً اہلِ علم کو بعض امور میں زیادہ متاثر نہ کر سکے۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ شمل نے خود کو کسی ایک موضوع سے متعلق نہ رکھا۔ بات اگر تصوف اور الٰہیات تک موقوف رہتی تو گنجائش نکل آتی لیکن ان کی مختلف ابعاد میں تحقیقی و تنقیدی کاوشیں اور ادبی جہاں گردی نے ان کو خلطِ مبحث میں الجھایا اور ان پر گرفت بھی ہوئی۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنے شارے 'مباحث' میں بعنوان "این میری شمل بحیثیت غالب شناس۔ چند معروضات" میں شمل کی فارسی دانی کی خوب خبر لی اور جس کا اجمالاً ذکر آئندہ صفحات میں ہو گا خصوصاً جب ان کی کتاب A DANCE OF SPARKS- Imagery of Fire in Ghalib's Poetry زیرِ نقد لائی جائے گی۔ یہاں ہم صرف شمل کے اردو زبان وادب سے جڑے تضحص کو پیشِ نظر رکھیں گے ورنہ موضوع کے پھیلنے اور اس سے باہر نکل جانے کے امکانات واضح ہیں۔ اس کتاب کے بعض دیگر تسامحات کی نشاندہی ڈی۔ جے متھیو نے کچھ یوں کی ہے:

"One may wonder, for instance, why the Hasan Dihlavi ' sweeter and more tender ' than Amir Khusraw, or in what way the Persian poems of Gesu Daraz are thought to have been ' exuberant '. Moreover, the popular theory presented without question in the argument that the latter was 'the author of one of the first works in Dakhni Urdu' has long since been disproved."26

اس کتاب کادوسرا حصہ "شِکُوہ" ایک سو اکاون (۱۵۱) سے دو سو چھتیس (۲۳۶) صفحات کو محیط ہے۔ اِس کے تین ذیلی باب ہیں جن میں شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کے صوفیانہ افکار کو مبحث کو حصہ بنایا ہے اور بابِ چہارم جو در حقیقت بابِ ہفتم ہے میں گفتگو کا حاصل پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کے اس حصہ کو اگر اجمالاً دیکھا جائے تو بابِ پنجم جو اس حصے کا پہلا باب ہے شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کی زندگی اور تعلیمات سے متعلق ہے لیکن اس باب میں ممدوح کی زندگی بابت بہت کم معلومات بہم پہنچائی گئیں ہیں اور باب کا بیشتر حصہ بھٹائیؒ کے 'شاہ جو رسالو' کو مرکزِ نقد بناتا ہے۔ اس شہرہ آفاق صوفیانہ کلام کے مختلف 'سُر' یعنی باب اور ان میں موجود صوفیانہ رموز کی بہتر انداز پر گرہ کشائی ملتی ہے۔ اور پھر ان کا تقابلی جائزہ بھی دیدنی ہے کہ شمل نے ادیان، لسان اور فوک کہانیوں کے پس مناظر میں بہت سی بحثوں کو سمیٹتے ہوئے گرانقدر معلومات فراہم کیں اور پھیلے ہوئے مسلم تصوف کو، خصوصاً وحدت الوجودی افکار کو بھٹائیؒ کے مکاشفے 'شاہ جو رسالو' میں، مبادی حیثیت میں کار فرما دیکھا۔ یہ تمام مباحث اس باب میں پڑھنے کو ملتے ہیں تاہم بھٹائیؒ کی زندگی کی بابت گفتگو تشنہ ہی رہتی ہے تاہم کہیں کہیں ایسے اقتباسات نظر سے گزرتے ہیں:

"Shah Abdul Latif's great-grandfather Shah Abdul Karim of Blurri (1536-1623) is the most important figure in the next century; in his Persian malfuzat 93 verses in Sindhi are preserved, which contain all the ingredients of later mystical poetry. He seems to be the first one to use allusions to Sindhi folk tales in his verses."27

معروف جرمن مستشرق ارنسٹ ٹرمپ جنھوں نے بھٹائی اور ان کے کلام 'شاہ جو رسالو' پر خاص طور سے کام کیا اور ۱۸۶۰ء میں متعدد مطالعات پیش کیے ان کی بابت شمل کی رائے انتہائی مثبت ہے کہ ان کے سبب بھٹائیؒ کا کام بین الاقوامی سطح پر متعارف ہوا اور جرمنی (Leipzig) سے 'شاہ جو رسالو' کی اشاعت ۱۸۶۶ء میں ممکن ہوئی۲۸ اگرچہ ٹرمپ اپنی مذہبی شدت پسندی کے سبب بھٹائی کے صوفیانہ کلام کے ناقد تھے لیکن انھیں بھی یہ اعتراف کرنا پڑا:

"Reader will find many verses which amply repay him for the difficult labor of going through the whole text."29

'سُر سوراٹھی' جس کے ارنسٹ ٹرمپ مرتب اور مترجِم ہیں اور جو گجرات (ہندوستان) کے ایک مقدس پہاڑی سلسلے (گنار جسے گری نگر بھی کہا جاتا ہے) سے متعلق ہے پر بات کرتے ہوئے ٹرمپ مسلم اور ہندو تہذیب کی بابت بہت سی تلخ باتیں بھی کر جاتے ہیں۔ اور یہاں 'نفی ذات' کی بابت بھی ایک بحث موجود ہے یوں دیکھیں تو ٹرمپ اس ضمن میں اقبالؒ کے پیش رو ہیں کہ اردو ادب میں پہلی بار نفی ذات سے اثبات ذات کی بابت گفتگو، فلسفیانہ سطح پر ڈاکٹر صاحب ہی نے کی۔ ان مباحث کے جملہ مضمرات اور پس منظر کی بابت ٹرمپ کی گفتگو اہمیت کی حامل ہے:

"It is barely necessary to say a word about this black aspect of Indian life, which can find certain consolation only in individual extinction. Those local tales are for us important in so far as we learn from them something about Indian thinking and life style at a time when there are barely any historical reports available. The outlines which this tale offers us are indeed melancholy enough and show us Hinduism in its complete decomposition and deepest moral decline; it is a picture of crime and absolute obtusity, nothing else. We can very well recognize from the Muslim elaboration of an originally Hindu tale how much even the strong monotheistic deism of Islam has become modified and corrupted in Sindh, as in other parts of India, by its contact with Hinduism."30

اس حصہ میں بھکر کے قاضی قادن (متوفی ۱۵۵۱ء) کا خاص طور سے ذکر ملتا ہے جو سندھی زبان کے پہلے بڑے شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں اور جو سید محمد جونپوری (متوفی ۱۵۰۵ء) کے متعقدِ خاص تھے اور اس ضمن میں دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں کہ کیسے قاضی قادن کے افکار ابوالفضل اور فیضی کے وسیلہ سے اکبر کو متاثر کرتے رہے۔ سید محمد جونپوری تاریخ میں ادّعائے مہدیؑ کے حوالہ سے شہرت رکھتے ہیں جنھوں نے ۱۴۹۶ء (۹۰۱ھ) میں کعبہ کا طواف کرتے ہوئے خود کو مہدیؑ موعود قرار دیا۔ ۳۱

شاہ عبدالکریمؒ جو بھٹائیؒ کے اجداد کے اہم بزرگ ہیں نے پہلی بار سندھی لوک کہانیوں کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا اور شمل نے کمال مہارت سے بھٹائی کے کلام میں ان کا کھوج لگاتے ہوئے ایک خوبصورت مثال کچھ یوں پیش کی:

Like a jar poised on woman water-carrier,

And a bird on the water,

Our beloved in the same way

Has been close to our Soul.32

موضوع سے ہٹ کر بھی شمل نے بعض مواقعوں پر بہت سے گرانقدر تاریخی حقائق پڑھنے والوں تک بہم پہنچائے مثلاً یہ بتانا کہ ۱۵ء صدی کے آغاز میں ہندو برہمن مشرقی بنگال میں مولانا رومؒ کی مثنوی باقاعدگی سے پڑھتا تھا اور اس کی شرحیں نہ صرف فارسی زبان میں دستیاب تھیں بلکہ اس 'قرآن در زبانِ پہلوی' کے مزّین نُسخ سلاطینِ دہلی کے عہد میں تیار ہوئے اور اس کے ساتھ ساتھ مقامی زبانوں میں بھی جزوی اور مکمل تراجم پیش کیے گئے۔

شمل کے مطالعات میں دو ہستیاں ضرور ایسی ملتی ہیں جو ہر پھر کر شمل کو ہانٹ(HAUNT) کرتی ہیں ان میں مولانا رومؒ جو شمل کا عشق بھی ہیں اور حاصلِ عشق بھی اور دوسرے حسین بن منصورؒ حلاج جو شمل کو کئی زاویوں سے متاثر کرتے ہیں۔ یہ ہستیاں شمل کی فکر کو مہمیز دیتی ہیں اور نئے جہانِ معنیٰ سے آشنا بھی رکھتی ہیں۔ ان سے شمل کے افکار میں تموج بھی ہے، اور ہر بار شمل ان کا ذکر کر کے ایک گونہ تسکین حاصل کرتی ہیں۔ شمل نے بھٹائی کو مذکورہ شخصیات سے جوڑنے میں بھی اپنی فکری بصیرت کا اظہار کیا۔ یعنی مولانا رومؒ اور بھٹائی کے ہاں کون سی تہذیبی اور متصوفانہ قدریں مشترک ہیں اور وہ کون سے زاویہ ہائے نظر ہیں جو ان ہستیوں کے مابین شراکت کا درجہ رکھتے ہیں؟ اس بابت ان کی کھوج لائقِ ستائش ہے:

"The most touching, for most unexpected, quotation is that in Sassui's story....where one of the deepest lines from the Mathnawi is translated in simple Sindhi:

Not only the thirsty seeks the water,

The water as well seeks the thirsty.

......One may ask to what extent Shah Abdul Latif's musical imagery was influenced by Rumi. The expression that all veins have become rabab...on which pain and grief play their tunes, is not rare in traditional Sufi poetry."33

اسی طرح منصور حلاجؒ بھی بھٹائیؒ کے افکار پر حاوی رہتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ بقول شمل، حسین بن منصورؒ سندھ دھرتی پر ۹۰۵ء میں موجود تھے۔ یہاں کی مقامی آبادی ان سے کس قدر متاثر ہوئی اس کا اظہار سندھ دھرتی کے صوفی شعراء کے کلام میں بخوبی ہوا تاہم منصور حلاجؒ اس خطے کی تہذیب و معاشرت اور عقائد و نظریات سے کس قدر محظوظ ہوئے اور کیا اثرات لیے اس کا کھوج لگاتے ہوئے ناقدین کا بیانیہ ہندو مظاہر پرستی (PANTHEISM) کو جالیتا ہے جبکہ شمل کے ہاں وحدت الوجود کے اولیں مسلم صوفی دانشور اور شارح شیخ محی الدین ابنِ عربی (متوفی: ۱۶ نومبر ۱۲۴۰ء) ہیں جنھوں نے اسلام اور پیغمبرِ خدا ﷺ کی سیرت کا مطالعہ جمالیاتی رنگ میں کیا۔ منصور حلاجؒ کا مذہبی ایقان بھی وحدت الوجودی اثرات لیے ہوئے ہے اور ان کا 'انا الحق' کہنا اس امر کو شاہد ہے کہ وہ واصل بالحق ہونے کے عملاً قائل تھے۔ اگرچہ بغداد کی بعض مقتدر صوفی شخصیات کے ہاں یہ امر ناپسندیدہ ٹھہرا اور منصور کا انا الحق کہنا ناگوار جانا گیا۔ غالبؔ کے شوخ رنگِ شاعری بھی کچھ اس نوع کا مضمون ملتا ہے۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن

ہم کو تقلیدِ تنک ظرفی منصور نہیں

حضرت جنیدِ بغدادی جن سے منصور کو شرفِ تلمذ تھا کو منصور کے اس قول پر رنج تھا اور اسی لیے جب اِن سے منصور کے قتل کی بابت رائے لی گئی تو انھوں نے ظاہراً منصور کے قتل کو مناسب جانا؛ لیکن ہندوستان میں اور خاص طور سے سر زمینِ سندھ کے رہنے والوں کے ہاں منصور سے ایک گونہ انسیت ہمیشہ رہی۔ اس لیے خواہ سچل سرمستؒ ہوں یا پھر بھٹائیؒ ان ہستیوں کے لیے منصور ایک بڑے اور مثالی روایت شکن (ICONOCLAST) ہیں اور لوئی میسیوں تو اس سے بھی آگے گئے ہیں، اور وہ انھیں اسلام کے سب سے بڑے روایت شکن قرار دیتے ہیں۔ غرض وحدت الوجودی افکار سے سندھ دھرتی صدیوں سے جڑی ہوئی ہے، جبھی تو بھٹائی کمال وارفتگی سے یہ کہتے ہیں:

Water earth stream–one cry;

Tree bush: one call. 'I am the Truth!'

The whole country is filled with Mansurs–

How many of them whilst Thou have executed (Sohni ix 1-2)34

یہاں ملک (COUNTRY) سے مراد سندھ دھرتی ہے اور یہی وہ اشعار ہیں جو سیاسی طور پر شہید ذوالفقار علی بھٹو کے لیے مستعمل ہیں یعنی 'تم کتنے بھٹو مارو گے۔۔۔۔'

شمل نے بھٹائیؒ اور منصورؒ کے مابین مشترک اقدار نمایاں کرنے کی جستجو کی ہے۔ اور اس ضمن میں شاہ جو رسالو کے دکھی اور بے کس و مجبور نسوانی کرداروں کے حوالہ سے یہ دکھایا کہ عشق کا حاصل خود سے برتر ذات میں گم ہو جانا ہے اور اپنی نفی ہی میں وصل ہے جسے اگرچہ فکرِ اقبالؒ نے رد کیا۔ یعنی ان نسوانی کرداروں کے نزدیک منتہائے عشق یہ ہے کہ اس راہ میں ہر طرح کی صعوبت ایک نوع کا اکرام ہے اور یہ منزل کے حصول کی ایک دائمی سند ہے:

"In fact, the Hallajian image of iblis was taken up by Shah Latif. Even more pertinent to the general mystical symbolism of the Risalo and its emphasis on sacrifice is Shibli's

dream about Hallaj's death in which God proclaimed that He, or His beauty, would be the blood money for those martyred on his path: Sassui is consoled with these words.....The fate of the Martyr mystic of Baghdad becomes a model for Shah's heroines who pray, as he did, that God might take away the 'I' that stands as a veil between the lover and the beloved. 35

سندھ، پنجاب اور جنوبی ہندوستان کی شعری صوفیانہ تہذیب میں مرکزی نسوانی کردار عاشق کی صورت، گریہ زاری کرتے رہے، اور محبوبِ حقیقی ہمیشہ ایک مردانہ رنگ میں متحرک نظر آیا۔ مرد جو محبوب ہے در حقیقت حق کا ایسا پرتو ہے جس سے وصل، غایتِ عشق ہے اسی لیے کووں کو اڑاتی، پیغام دیتی، سندھ دھرتی کی خواتین اور پنجاب میں چرخہ کاتتی، پانی بھرتی کڑی اپنی علامتی حیثیت میں عشاق کا تفاعل رکھتی ہیں، اور زندگی کا مقصد محبوب کو ہمیشہ خوش رکھنا اور اس کا قرب حاصل کرنا ہے۔ اس ضمن میں ولی دکنی، بلھے شاہؒ، میاں محمد بخشؒ اور بھٹائیؒ کے متعدد اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں۔ شمل کے نزدیک محبت کا یہ عرفانی تعلق مردانہ تفضّل لیے ہوئے ہے، یعنی اس میں مردانہ کردار، سماجی اعتبار سے، برتر سطح پر نظر آتے ہیں اور اس سبب یہ ہے کہ علامتی حیثیت میں یہ حق تعالیٰ کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ شاہ جو رسالو کے نسوانی کردار بھی کچھ اسی نوع کے ہیں جو اپنے محبوب کے لیے شدید تڑپ اور شیفتگی کا جذبہ رکھتے ہیں اور ان کے حصول میں خود کو مٹا دینا ان کے لیے سہل ہے:

"His male heroes are of noble origin: Punhun is a Bloch knight, while Sassui is only a washerman's (adopted) daughter. He is used to musk, she is stained with soap. Rano is a Rajput, member of the warrior class, who is attracted by the courtesan Mumal; Tamachi is the ruler of Sindh who elects a fisher- maid as his consort. Even Mehar, who temporarily serves as a buffalo keeper, is of higher social standing than Sohni, the potter's daughter. In a few places the heroines feel like being burned on the funeral pyre after losing their

beloved. The lot of the deserted woman is touchingly described in various chapters of the Risalo..."36

مسلم تصوف پر بات کرتے ہوئے شمل ہمیشہ اپنے انتہائی عمیق اور متنوع ابعاد کے حامل مشاہدے اور مطالعے کو پیشِ نظر رکھتی ہیں۔ یہ وہ انفرادی خصوصیت ہے جو مستشرقین کے ہاں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے اور بہت سوں کے ہاں تو یہ ایک پیچیدہ اور تجربے سے عاری احوال ہیں جن کو کبھی ڈھنگ سے سمجھا نہیں جا سکتا۔ شمل کا یہ اختصاص ہے کہ وہ تصوف اور اس کی جملہ اقدار کی بابت جب بات کرتی ہیں تو ہر زاویہ سے ان کی تفہیم ممکن بناتی ہیں اور پھر ایک بسیط پس منظر کی معیت میں پیش منظر نکھر کر سامنے آتا ہے جبھی تو صوفی عشق کے بیان میں وہ کسی ایک فکری جغرافیہ تک محدود نہیں رہتیں، یوں لگتا ہے کہ ادب اور الٰہیات ایک دوسرے کے معاون ہیں اور عشق کی تعبیر و تشریح میں تمام متعلقہ اہم شخصیات و افراد ایک جا، یک آواز، صدا بلند کر رہے ہیں؛ اس سے یہ جاننے میں دشواری نہیں ہوتی کہ شمل کا مطالعہ کس قدر فطری جوہر لیے ہوئے ہے۔ انھوں نے کس مہارت سے سارے میں پھیلے ہوئے عشق کے بیانیے کو سمجھا اور اس حوالہ سے ایک مکمل تہذیب شمل کے ہاں آن کھڑی ہوتی ہے اور پھر مقتدر شخصیات کے ہاں عشق کے مفاہیم کتنے مشترک معلوم ہوتے ہیں! گرچہ صوفی عشق کا بیانیہ کٹھن، دشوار سہی لیکن ضابطہ ایک ہی ہے یعنی واصل بالحق ہونا اور بقا بعد از فنا، تاہم غیر صوفی شخصیات کس طرح سے عشق کی معنویت کو آشکار کرتے ہیں ان پر شمل کا تفحص دیدنی ہے۔ بھٹائی کے حوالہ سے ایک اہم اقتباس:

"For while beloved is only 'in the eyes' in the moment of union, he occupies the whole heart and mind during the separation and is, hence, even more 'real' than in union....With such words, Shah Abdul Latif is close to a feeling that was expressed, time and again, by the great representatives of 'personal mysticism' who knew the secret of:

The endless torment

Of love unfulfilled,

The greater torment

Of love fulfilled.

As T.S. Eliot has put it, and as Muhammad Iqbal, following Ghazzali's interpretation of infinite longing, has proclaimed in our day in the Indo-Muslim world."37

شمل کا قرآن وحدیث کا مطالعہ لائقِ ستائش ہے۔ وہ جب کسی متصوفانہ امر کو مذہبی حوالوں سے بیان کرتی ہیں تو دلیل کے طور پر قرآن کی معاون آیت یا حدیث پیش کرتی ہیں اور مذکورہ آیت اور حدیث اس قدر جامعیت لیے ہوتی ہے کہ ان کے مطالعہ پر رشک آتا ہے۔ اس ضمن میں MYSTICAL DIMENSION OF ISLAM اور AND MUHAMMAD IS HIS MESSANGER یا DECIPHERING THE SIGNS OF GOD کو خاص طور سے دیکھا جا سکتا ہے۔ کتاب کے اس حصہ میں جہاں اور بہت سے مخفی وعیاں افکار کی تازہ کاری نظر آتی ہے وہیں تقابلِ ادیان بالتخصیص تصوف اور بھٹائی کے قصوں میں نسوانی کرداروں کے انفاس کو قرآنی حوالوں سے پیش کیا گیا ہے۔

بھٹائیؒ کے فکری حاصل کو شمل نے کبھی نہ ختم ہونے والے عشق کی صورت بیان کیا ہے۔ عشق کا یہ سفر نا مختتم ہے اور یہی اس کا حاصل بھی۔ عشق کی یہ روایت صدیاں گزر جانے پر بھی روشن و تابندہ ہے۔ ایک نا ختم ہونے والا سفر اور عاشق کی نا ختم ہونے والی تشنگی۔۔۔ یہی صوفی عشق کا حاصل ہے جو واصل بالحق ہونے سے قبل برقرار رہتی ہے:

"Indeed, the major part of Shah Jo Risalo consists of praise of the path, and of the never ending travelling of the lovers. The Sindhi poet stands here in the line of Attar's successors-similar to the birds in Mantiq ut tair, Sassui crosses deserts, mountains and valleys: and the seeker who was enchanted by the Yogis, the true saints, tries to follow

them to the inaccessible heights of Mount Hinglaj. The heat is restless like a camel; Sur Khanbhat is a perfect description of the Journey of the soul toward the friend..........His (Bhattiy) mysticism is individualistic, and has as its center only one story: that of the return of the loving soul to her lord."38

حواشی

حصہ اوّل، بابِ سوم:

ا:عبادت بریلوی، ڈاکٹر (مرتّب)۔ نالۂ درد۔ میر دردؔ، خواجہ (مؤلف)۔ لاہور: اِدارہ ادب و تنقید، ۱۹۸۰ء ص ۱۱۵

۲: نسیم احمد، ڈاکٹر۔ دیوانِ دردؔ۔ دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۲۰۰۳ء ص ۲۷

3: **Schimmel, Annemarie. Pain and Grace**- A STUDY OF TWO MYSTICAL WRITERS OF EIGHTEENTH-CENTURY MUSLIM INDIA. Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2003.P.4

4: Ibid

5: Martin, Richard C. "Journal of the American Academy of Religion." Journal of the American Academy of Religion, vol. 46, no. 3, 1978, pp. 391–391., www.jstor.org/stable/1463833.

6: Schimmel, Annemarie. Pain and Grace- A STUDY OF TWO MYSTICAL WRITERS OF EIGHTEENTH-CENTURY MUSLIM INDIA.P.57

7: Ibid. P.93

8: Ibid. P.103

9: Ibid. P.116

10: Matthews, D. J. "Bulletin of the School of Oriental and African Studies, University of London." Bulletin of the School of Oriental and African Studies, University of London, vol. 41, no. 2, 1978, P.391

11: Schimmel, Annemarie. Pain and Grace. P.107, 117

12: Ibid. P. 136

۱۳: خلیل الرّحمٰن داؤدی۔ دیوانِ دردؔ از خواجہ میر دردؔ دہلوی۔ لاہور: مجلسِ ترقیٔ ادب، ۲۰۱۰ ص ۱۵۷

14: Schimmel, Annemarie. Pain and Grace. P.145

15: http: // en.oxforddictionaries.com/definition/manifestation.

۱۶: خلیل الرّحمٰن داؤدی۔ دیوانِ درد۔ ص ۱۸۴

17: Schimmel, Annemarie. Pain and Grace. P.140

18: https://en.oxforddictionaries.com/definition/ye

۱۹: خلیل الرّحمٰن داؤدی۔ دیوانِ درد۔ ص ۱۴۹

20: Schimmel, Annemarie. Pain and Grace. P. 139

۲۱: خلیل الرّحمٰن داؤدی۔ دیوانِ درد۔ ص ۱۷۸

22: Schimmel, Annemarie. Pain and Grace. P.110

۲۳: خلیل الرّحمٰن داؤدی۔ دیوانِ درد۔ ۱۴۹

24: Schimmel, Annemarie. Pain and Grace. P. 101

25: Matthews, D. J. "Bulletin of the School of Oriental and African Studies, University of London." P. 391

26: Ibid

27: Schimmel, Annemarie. Pain and Grace. P.161

28: Ibid P. 152

29: Ibid

30: Ibid P. 158

31: https://en. Wikipedia.org/wiki/Muhammad_Jaunpuri

32: Schimmel, Annemarie. Pain and Grace. P.162

33: Ibid P.166

34: Ibid P.184

35: Ibid P.185

36: Ibid P.174

37: Ibid P.178,179

38: Ibid P.177,178,187

حصہ دوم: رقصِ شرّار۔ غالبؔ کی شاعری میں تمثالِ آتش

اردو ادب میں زمانی اعتبار سے جو اہم، مربوط کام شمل کی جانب سے کتابی شکل میں سامنے آیا، اس کا عنوان A DANCE OF SPARKS- Imagery of Fire in Ghalib's Poetry ہے اور جس کا ترجمہ راقم نے مذکورہ بالا عنوان کی صورت مناسب جانا۔ یہ کتاب غالبؔ کے فارسی اور اردو کلام میں موجود تمثالِ آتش سے متعلق ہے اور اپنی بعض حیثیتوں میں شمل کی چند بہترین ادبی کاوشوں میں سے ایک متصور ہو سکتی ہے۔ اس کی پہلی اشاعت ۱۹۷۹ء میں وکاس پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، غالب اکیڈمی کی جانب سے ہوئی اور راقم کے ہاں بھی یہی اشاعت زیرِ مطالعہ رہی۔ غالبؔ سے شمل کی رغبت اور اس مذکورہ کتاب کی بابت ڈاکٹر تحسین فراقی کچھ یوں رقم طراز ہیں:

"غالبؔ پر شمل کے باضابطہ مضامین کا آغاز پاکستان کواٹرلی جلد ۱۷، شمارہ اول میں ان کے شائع کردہ ایک مقالے poetry and calligraphy سے ہوا جس کا ذیلی عنوان تھا Some Aspects of the work of Mirza Ghalib یہ مقالہ ۱۹۶۹ء کے سرمائی شمارے میں شائع ہوا۔ صادقین کی مصوری سے جا بجا مزین اس مضمون کے بعد انھوں نے Woge der Rose Woge des Weins (موجِ گل، موجِ شراب) کے عنوان سے غالبؔ کی اردو اور فارسی کی منتخب شاعری کے جرمن تراجم ۱۹۷۱ء میں کتابی صورت میں شائع کیے۔۔۔ اس کے بعد ۱۹۷۴ء میں غالبؔ پر ان کی انگریزی کتاب A Dance of Sparks کے عنوان اور Imagery of Fire in Ghalib's poetry کے ذیلی عنوان سے دہلی سے شائع ہوئی اور دوبارہ وہیں سے ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی۔"[۱]

راقم کو ۱۹۷۹ء سے قبل کی اشاعت کا کوئی اور حوالہ نہ مل سکا۔ کتاب پر بات کرنے سے قبل یہ بتانا مناسب ہو گا کہ شمل کی غالبؔ فہمی ایک بسیط تہذیبی، ثقافتی اور علمی ورثے پر انحصار کرتی ہے۔ انھوں نے غالبؔ کو محض ایک شاعر کے طور پر نہیں پڑھا بلکہ وہ جو رشید احمد صدیقی صاحب نے کہا کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے تین چیزیں عطا کیں؛ تاج محل، اردو زبان اور اسد اللہ خاں غالبؔ۔ شمل کے ہاں ہندوستان، مغل تہذیب اور اس خطے کی مجموعی سیاسی و

ادبی اور بالخصوص مسلم وصوفی تاریخ ہر لمحہ موجود و متحرک رہی۔ شمل نے ہندوستان پر لکھتے ہوئے کسی ایک عہد یا زمانہ کو مطالعہ کے لیے مخصوص نہ کیا بلکہ فنونِ لطیفہ کے جملہ عناصر بھی مرکزِ نگاہ رہے اسی لیے رقص سے خطاطی تک کتنے ہی ایسے مطالعات نظر سے گزرتے ہیں جو شمل کے تبحرِ کا پتہ دیتے ہیں، چنانچہ غالبؔ پر بات کرتے ہوئے ان کا یہ کہنا درست ہے:

"Behind his lines lie the wisdom, the charm, and the imagery of nearly a thousand years of Persian poetry and 800 years of Muslim rule in the northwest of the subcontinent. It is therefore, impossible to know Ghalib without a thorough knowledge of Persian poetical imagery, the strict rules of meter and rhyme, the numberless rhetorical devices and of course, the religious background of a mystically tinged Islam as it has lived in the hearts of millions of people since the middle ages."2

کتاب کے آغاز میں یعنی تعارفی حصہ میں شمل، غالبؔ، اردو اور فارسی شاعری کے جملہ اختصاصات کے ساتھ ساتھ کتاب لکھنے کے اسباب و مقاصد بھی نمایاں کرتی ہیں تاہم غالبؔ کی بابت ان کی معلومات زیادہ نپی تلی نہیں اور کہیں کہیں کوئی کمی رہ جاتی ہے۔ان تسامحات کی نشاندھی ڈاکٹر تحسین فراقی اپنے ایک عالمانہ مقالے 'این میری شمل بحیثیت غالبؔ شناس۔چند معروضات' میں کر چکے ہیں مثلاً شمل کا یہ کہنا:

"During his (Ghalib) early teens, the boy Asadullah indulged in an intense study of Persian under the guidance of a certain Abdus Samad who hailed from Iran and therefore introduced him into the genuine Persian way of expression."3

درست نہیں، ہم جانتے ہیں کہ غالبؔ کے ہاں استادی، شاگردی کا معاملہ زیبِ داستاں کے لیے تھا اور غالبؔ 'بے استاد' کہلانے سے خائف تھے۔

"جہاں تک شعر و شاعری کا تعلق ہے، میرزا صاحب نے کسی شخص کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا۔ ۔۔۔ سراج الدین احمد کے خط میں بھی صراحت کی ہے کہ در سخن از پرورش یافتگانِ مبدأ فیاضم، و سوادِ معنی رابفروغِ گوھر خویش روشن کردہ ام۔ از ھیچ آفریدہ حقِ آموز گاریم بگردن و بارِ منتِ رھنمایئم بر دوش نیست۔"[۴]

شمل کا اصل جوہر اس لمحے کھلتا ہے جب وہ فارسی اور اردو ادب کی بابت اپنے خیالات ایک بھرپور شعری ضابطے اور تہذیبی مرقع میں پیش کرتی ہیں۔ ایسے میں ان کا قلم بے دریغ فنی نزاکتوں اور لطیف پیرایوں کا احاطہ کرتا ہے اور پڑھنے والے کو جہاں بہت سی گرانقدر معلومات حاصل ہوتی ہیں وہیں دو مختلف تہذیبوں سے جڑی، مذکورہ زبانوں کی شعریات بھی قاری کو مسحور رکھتی ہیں۔ مثلاً اردو و فارسی ادب پر بات کرتے ہوئے وہ جن پیچیدہ شعری رموز کی تفہیم کرتی ہیں ان پر قاری حیران ہوتا ہے کہ جملہ شعری پیرایوں پر دسترس حاصل کرنے کے لیے، کتنے جوکھم انھوں نے اٹھائے۔ ذیل کا اقتباس اس ضمن میں دیکھا جانا چاہیے:

"Persian poems therefore demand from the student an extensive study of the numerous rhetorical figures and a careful interpretation of each symbol and metaphor, and perhaps their most interesting aspect for the reader is to observe the poet in his artistic performance. He has to find out how he uses the device of harmonically selecting the motifs or that of fantastic aetiology in an unusual way; whether he is able to allude to three parts of the body in one hemistich, or to combine four allusions to religious items in two lines, whether he finds a new rhyme word in a sequence of rhymes, or conceals a witty amphibology in an innocent phrase.......5

مذکورہ گفتگو اگر فارسی زبان کے کسی بڑے ناقد کی جانب سے ہو تو شاید تخصیص نہ رکھے لیکن یہ گفتگو ایک ایسی مستشرقہ کی جانب سے ہے جس کے علمی، فکری میلانات مختلف رنگوں کے ابعاد سمیٹے ہوئے ہیں۔ شمل نے تعارفی

حصہ میں غالبؔ کے مختلف اشعار کی توضیح کی ہے لیکن ان پر بات کرنے سے قبل شمل نے کتاب لکھنے کا جو مقصد بتایا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی علمی بے بضاعتی کا جو اعتراف کیا، وہ لائقِ توجہ ہے اور اس ضمن میں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ شمل آکسفورڈ میں جس نشست کے لیے بحیثیت لیکچرر مقرر ہوئیں وہ افغان نژاد اے۔ کے۔ اوزئی درّانی (متوفی: ۱۹۶۴) جو امریکہ میں MINUTE RICE کے موجد تھے کی وصیت اور مالی تعاون کے سبب معرض میں آئی اور اس کا بنیادی مقصد غالبؔ اور میرؔ کی شاعری پر کام کرنا تھا؛ اور یوں شمل جنوبی ایشیا کے اسلامک کلچر پر اپنی نوع کی واحد سکالر پروفیسر خاتون تھیں:

"We want to introduce the Western reader into the complex imagery of Ghalib's poetry and to facilitate his access to a literary field which has still to be discovered by the lovers of comparative literature......but completeness was not intended and would be impossible as long as large parts of Persian poetry still remain unknown to us; besides, such an attempt would by far transgress a single scholar's capacity. Still, we hope that we can convey at least a certain idea as to what extent Ghalib was indebted to his predecessors, and how far he surpasses them with his ingenious ideas.6

تعارفی حصہ میں شمل نے غالبؔ کے جن اشعار کی تفہیم و تشریح کی، ان کو دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ان کی غالبؔ فہمی بہتر سطح پر فعال ہے اور انھوں نے غالبؔ کو بہتر انداز پر سمجھا، تاہم کہیں کہیں اُن سے فروگزاشتیں بھی ہوئیں مثلاً غالبؔ کے اس شعر کی تفہیم کچھ یوں کرتی ہیں:

بوسہ نہیں، نہ دیجیے، دشنام ہی سہی

آخر زباں تو رکھتے ہو تم، گر دھاں نہیں

(امتیاز علی خاں عرشی۔ دیوانِ غالبؔ۔ لاہور: مجلسِ ترقیٔ ادب، ص ۲۳۳)

“And Ghalib, in turn, consoles himself when his beloved refuses to kiss him and scolds him instead– how could she kiss him at all since she has no mouth?”7

ترجمہ کو دیکھیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ شعر کا مدعا کچھ اور ہے اور غالبؔ اس شعر

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے

کچھ نہیں ہے، تو عداوت ہی سہی

(امتیاز علی خاں عرشی۔ دیوانِ غالبؔ۔ ص۲۸۵)

کے مصداق محبوب سے کچھ نہ کچھ ملنے، لینے، حاصل کرنے کے متمنی ہیں یعنی بوسہ نہ سہی، دشنام ہی سہی؛ اور اس ضمن میں غالبؔ کا ایک اور شعر بر محل معلوم ہوتا ہے:

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں

کاش! پوچھو کہ، مدعا کیا ہے؟

(امتیاز علی خاں عرشی۔ دیوانِ غالبؔ۔ ص۳۱۵)

شمل کے انھیں تسامحات پر ڈاکٹر تحسین فراقی نے خاص طور سے گرفت کی اور کہیں کہیں یہ قدرے سخت معلوم ہوتی ہے:

"غالبؔ پر ان کی تحریریں بعض جہتوں سے فکر افروز ہونے کے باوجود بحیثیتِ مجموعی اطمینان بخش نہیں، خصوصاً بعض اردو وفارسی اشعار کے ترجمے میں انھوں نے متعدد جگہ ٹھوکریں کھائی ہیں۔ کہیں کہیں یہ ترجمے مضحکہ خیز حد تک غلط ہیں۔"۸

اور پھر فراقی صاحب غالبؔ کے زبان زدِ عام شعر کو پیش کرتے ہوئے دورانِ مقالہ کچھ یوں کہتے ہیں:

"غالبؔ کا ایک مشہور ظریفانہ شعر ہے:

؎ مگر لکھوائے کوئی اس کو خط، تو ہم سے لکھواوے ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

(امتیاز علی خاں عرشی۔ دیوانِ غالبؔ۔ ص ۳۳۴)

اس شعر کے باب میں شمل کا یہ کہنا ہے:

'Our poet leaves his house early in the morning to ask a scribe to write a letter to the sweetheart.'

گویا شمل کی دانست میں شاعر خود خط لکھنا نہیں جانتا تھا، یا بوجوہ اس سے قاصر تھا لہٰذا محبوب کو خط لکھوانے کے لیے کسی کاتب یا منشی کا متلاشی اور محتاج تھا۔ حیرت ہے کہ شمل اس سادہ سے شعر کے سامنے کے مفہوم کو بھی نہ سمجھ پائیں۔"۹

لیکن ترجمے کا یہ معاملہ ہر جگہ درست نہیں۔ شمل نے غالبؔ کے بعض مشکل اشعار کی گرہ کشائی میں اپنی مہارتوں کا اظہار کیا اور غالبؔ فہمی کی بابت اپنے وسیع مطالعے سے قاری کو محظوظ بھی کیا۔ مثلاً ان کے ہاں غالبؔ کے ایک قدرے مشکل شعر کی تعبیر کچھ یوں ہے:

؎ نہ پوچھ نسخۂ مرحم جراحتِ دل کا کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

(امتیاز علی خاں عرشی۔ دیوانِ غالبؔ۔ ص ۳۰۰)

"The main ingredient is the salve for the wounds of his heart is pulverized diamond….the hardest element conceivable–which adds to the gall."10

اس طرح غالبؔ کا ایک اور شعر بھی دیکھا جا سکتا ہے اور یہاں بھی مترجم شمل نے اپنے اعلیٰ علمی ذوق کا ثبوت فراہم کیا۔ شعر ملاحظہ کیجئے:

؎ حاصلِ الفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو دل بہ دل پیوستہ، گویا، یک لبِ افسوس تھا

(امتیاز علی خاں عرشی۔ دیوانِ غالبؔ۔ ص۱۷۹)

شمل کی تفہیم کچھ یوں ہے:

"Heart pressed unto heart were so-to-speak a 'lip of regret' ...that means lips pressed together in regret and sorrow"11

غرض ایسے متعدد اشعار کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جہاں شمل کی فراست اپنی داد خود وصول کرتی ہے اور کئی مواقعوں پر ان کی اردو کلاسیکی شاعری سے آشنائی، لطف دیتی ہے۔ غالبؔ کا ایک اہم اور معروف شعر:

؎ عشرتِ قتل گہ اہلِ تمنا مت پوچھ　　　عیدِ نظارہ ہے، شمشیر کا عریاں ہونا

(امتیاز علی خاں عرشی۔ دیوانِ غالبؔ۔ ص۱۷۳)

کے نہ صرف ترجمہ میں فنی مہارتوں کا احساس ہوتا ہے بلکہ اس کے پس منظر میں پیش کردہ تفحص بھی اہمیت کا حامل ہے:

"Don't ask how happy the yearning ones are when

They see the place for execution!

It is the 'Eid of expectation (that) the

Sword should become naked

The crescent which announces the Eid al Fitr, e.g. the Festival at the end of the fasting period, is compared in a traditional image to a scimitar; and as much as people long for the sight of the new moon which brings to an end the month of fasting as much do the

lovers enjoy the sight of the scimitar drawn from the scabbard at the place of where they shall be sacrificed........12

شمل غالب کی نشاطیہ فارسی غزل جس کی ردیف "بر قص" ہے اور جس پر ترجمہ نگاری کے حوالہ سے ڈاکٹر تحسین فراقی نے خاص طور سے گرفت کی ہے کے ضمن میں رقص کی تہذیبی، ارضی شناخت کو ایک بسیط پس منظر کے ساتھ بیان کرنے کی منفرد کوشش کرتی ہیں۔ یہاں رقص کسی ایک خطے یا معاشرت سے میل نہیں کھاتا بلکہ رقص کی ثقافت اپنے مختلف النوع رنگ بکھیرتی ہے اور یوں اقوامِ عالم میں یہ انسانی فعل، ایک لسان کی حیثیت سے اپنا تفاعل پیش کرتا ہے اور اس کا بدلتا روپ، نئے معانی و مفاہیم کا مظہر بن جاتا ہے۔ مثلاً ایک صوفی اور طوائف کا رقص، خوشی سے جھومتی چھوٹی بچی اور کسی بزرگ کا بچوں کے لیے ناچنا جدا معنویت کا حامل ہے؛ اور پھر یہ رقص صرف انسانی جبلت یا فطرت ہی سے مشخص نہیں بلکہ جانوروں، پرندوں اور درختوں کی جھومتی شاخوں میں بھی اس کی صورت مشاہدہ ہوتی ہے جبھی غالب خود سپردگی میں، خس و خاشاک کو بھی حالتِ رقص میں دیکھتے ہیں:

سر سبز بودہ و بہ چمنہا چمیدہ ایم   ای شعلہ در گداز خس و خار ما بر قص

فرسودہ رسمہای عزیزان فرو گزار   در سور نوحہ خوان و بہ بزمِ عزا بر قص ۱۳

رقص سے متعلق شمل کا بیان قدرے طوالت لیے ہوئے ہے اور اس قدر زخار ہے کہ اس کا ترجمہ ہونا یا پڑھا جانا راقم کے نزدیک بصیرت افروز ہے:

"Indeed, dancing occupies a special place in almost every religion. One has called dance the 'absolute play', for, as the catholic theologian Karl Rahner once remarked: every play is, in its deepest meaning a dance, a Reigen (round dance) which revolves around Reality. It takes man away from the world, from the gravity and density of our earthly existence, and imbues him with a sense of closeness to heaven.

And it is well-known from ancient Greek tradition; two deities were connected with dance: they are Dionysus who enraptures and Skopz considered dancing as a means of elevation into higher spheres.14

شمل رقص کے ضمن میں متعدد کلاسیکی تلازمات بروئے کار لاتی ہیں۔ شمع و پروانہ، حرمتِ سماع غرض ان سب کے مابین نہ صرف مشترک اقدار کی ترتیب سامنے لاتی ہیں بلکہ تاریخی حقائق بھی پیش کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک 'سماع' کی نیو، نویں صدی عیسوی میں رکھی گئی اور یہ حضرت یحییٰ بن معاذؒ رازی (متوفی: ۸۷۲ء) تھے جنھوں نے مختصر اور دل کو چھو لینے والی شاعری میں یہ بتایا کہ انسان، عشق خدا میں ذاتِ حق کے گرد رقصاں ہے اور یہ وجودی صوفی منصور حلاجؒ تھے جنھوں نے پہلی بار پروانے کے رقص اور شمع کے گرد منڈلاتے، جل جانے کو حیاتِ ابدی سے تعبیر کیا۔ ۱۳ منصور حلاجؒ شمل کی تحریروں میں اکثر مذکور ہوتے ہیں اور ان کا شخصی و فکری اثر، شمل کی اپنی شخصیت پر بہت گہرا ہے اور اس موضوع پر ایک جدا مقالے کی تسوید مناسب معلوم ہوتی ہے۔ غالبؔ اور حلاجؒ کے موازنہ میں شمل کا یہ کہنا دلچسپی کا حامل ہے:

"Since Ghalib stands in a line with Bedil, Nasir Ali, and the Delhi tradition of poetry and, to a certain extent, mysticism, it is small wonder that he has taken up the Hallajian imagery to apply it in a most ingenious way. The idea that the lover must delight in his afflictions constitutes one of his main topics. By means of an expressions employed frequently by the folk poets, he speaks of the ' goblet of Mansur'- a word which reminds the reader of 'intoxication' by the wine of love, and he knows that to speak the truth-or to utter the word haqq, 'Divine Truth'-will indispensably lead man to the gallows...15

کتاب کا بیشتر حصہ غالبؔ کے فارسی، اردو اشعار کی تعبیر و تشریح اور ان دونوں زبانوں کے کلاسیکل پس مناظر اور تہذیب و ثقافت سے جڑا ہے۔ شمل اردو کے کلاسیکل ورثے کی شناور ہیں۔ کلاسیکی رموز اور فنی محاسن سے بخوبی آگاہ

ہیں اور اس بیانیے میں شعری، تمثیلی اور علامتی پیرائے بھی ان کی تحریر کا موضوع بنتے ہیں۔ بعض مواقعوں پر مخصوص تلازمات و استعارات گراں محسوس ہوتے ہیں اور جس سے طبیعت اوبنے لگتی ہے تاہم جا بجا نذ کور ادبی وشعری تفحصات قاری کو متحیر رکھتے ہیں۔ راقم نے خاص طور سے اردو سے جڑے ان کے پیش کردہ مطالعے کو سامنے رکھا اور یہ جاننا مشکل نہیں کہ ان کا شعری ذوق اعلیٰ پائے کا ہے اور پھر تہذیبی عوامل کی تسہیل میں ان کا بیان، انتہائی خلّاق اور وجدانی ہے۔ شمل نے تمثالِ آتش کو مرکزِ فکر بناتے ہوئے رقصِ شرر کو نمایاں کرنے کی جستجو کی ہے ان کی پیش کردہ تمثیلیں مخصوص ثقافتی تناظر لیے ہوئے ہیں اور موضوع صرف شاعری نہیں رہتا بلکہ فنونِ لطیفہ کی کچھ اور سمتوں کو جالیتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں شمل اوروں سے منفرد ہیں کہ ان کا مطالعہ کسی ایک صورتِ واقعہ کا مرہونِ منت نہیں؛ بات پھیلتی ہے تو تعبیرات کا سلسلہ بھی بڑھتا ہے اور نئے معانی بھی منکشف ہوتے ہیں:

"But Ghalib was likewise well versed in the art of comparing single letters to other objects, as thorough the centuries, the alif had stood for the slim stature of the beloved and had been the symbol of Divine Unity and incomparability; the Ji`m, the Da`l or the la`m had signified curls and tresses, the si`n teeth, the mi`m the small mouth- unless it was connected with the name of Muhammad and speculation about his high rank. This trend to play with the letters of the Arabic alphabet, so typical of Islamic poetry, is not lacking in Ghalib's verse.16

اور تمثالِ آتش کی بابت شمل کا یہ بیان بھی توجہ کا حامل ہے:

"Notwithstanding its destructive force, fire definitely enjoys a positive evaluation in Ghalib's poetic language, as it associated with the power of love and is the sensuous symbol for the domination of the Beloved when he reveals Himself in his Cruel and wrathful aspects of 'consuming fire', a fire which destroys everything besides itself. This

positive evaluation becomes particularly vivid when Ghalib evokes the image of lightning, which was, in traditional Persian poetry, often associated with the smile or the laughter, in contrast to the 'weeping of the cloud'.17

حواشی

حصہ دوم: بابِ سوم

ا: تحسین فراقی، ڈاکٹر۔" این میری شمل بحیثیت غالبؔ شناس۔۔۔چند معروضات"مباحث۔لاہور: جلد ا، شمارہ ا، جنوری تا جون ۲۰۱۲ء ص ۱۱۸

2: Schimmel, Annemarie (foreword). Urdu Letters of Mirza Asadu' llah Khan Ghalib by Daud Rahbar. Translated and annotated. Albany: State University of New York Press, 1987. P.xi

3: Schimmel, Annemarie. A Dance of Sparks- Imagery of Fire in Ghalib's poetry.New Delhi: Vikas Publishing House PVT Limited, 1979. P.4. Print

۴:امتیاز علی خاں عرشی۔ دیوانِ غالبؔ۔لاہور: مجلسِ ترقیٔ ادب، ۱۹۹۲ص ۱۴

5: Schimmel, Annemarie. A Dance of Sparks- Imagery of Fire in Ghalib's poetry. P.13

6: Ibid. P.18,19

7: Ibid. P.14

۸:مباحث۔ ص ۱۱۴

۹:ایضاً۔ ص ۱۳۶

10: Schimmel, Annemarie. A Dance of Sparks. P.14

11: Ibid. P.14

12: Ibid. P.15

13: Ibid. P.22,23

14: Ibid. P.28

15: Ibid. P.104

16: Ibid. P.125

17: Ibid. P.73

حصہ سوم: باب سوم

شمل کی اقبال ؔ فہمی

باب کے اس حصہ میں جہاں شمل کی معروف کتاب ”Gabriel's Wing“ کو مبحث کا حصہ بنایا جائے گا وہیں اس مذکور کتاب اور اقبالؔ سے جڑے چند اہم تحقیقی و تنقیدی مضامین کی جانچ بھی ہو گی جو شمل اور دیگر ناقدین کی جانب سے معرض میں آئے۔

شمل کی یہ کتاب پہلی بار ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی (اقبالؔ اکیڈمی سے شائع ہونے والے دوسرے ایڈیشن میں مندرج سن کے مطابق) اور اس کی دوسری اشاعت اقبالؔ اکیڈمی پاکستان (لاہور) کی جانب سے ۱۹۸۹ء میں ممکن ہوئی تاہم ڈاکٹر علی الانا کے نزدیک اس کی اشاعت کا سال ۱۹۶۲ء ہے اور یہ نیدرلینڈ (NETHERLAND) سے شائع ہوئی[1] جبکہ اسی کتاب میں جہاں سالِ طباعت مذکور ہے یہ واضح طور پر مندرج ہے کہ اس کی پہلی اشاعت، نیدرلینڈ کے معروف اشاعتی ادارے E.J.Brill Leiden کی جانب سے ۱۹۶۳ء میں ہی ہوئی۔ غرض یہ وہ علمی تحقیقی کاوش ہے جو شمل کو پاکستان میں متعارف کرانے کی اہم سبیل بنی۔ اس سے قبل، اقبالؔ سے متعلق، ان کے مقالات شائع ہو چکے تھے لیکن یہ پہلی مربوط کوشش ہے جس نے نہ صرف اقبالیات کے ذخیرہ میں اضافہ بلکہ اس سے، ان کی پاکستان سے نامختتم وابستگی نے بھی جنم لیا۔ اقبالؔ اور پاکستان سے تعلق کو شمل نے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا اور ان امور کی صراحت باب دوم میں ہو چکی ہے۔ راقم نے اس کتاب کے علاوہ، اقبالؔ کی بابت ان دستیاب اور اہم مقالات کو خاص طور سے پیشِ نظر رکھا جو ۱۹۶۳ء کے بعد لکھے گئے اور اس کا سبب یہ ہے کہ شمل کی اقبالؔ سے متعلق اہم گفتگو مذکورہ کتاب میں فطری طور پر سمٹ آئی ہے، مثلاً اقبالؔ کا گوئٹے، منصور حلاجؒ، مولانا رومؒ اور نطشے سے تعلقِ خاص کی

وضاحت، تصورِ وقت اور ان کے افکار پر اسلامی عقیدہ کی چھاپ یہ تمام مباحث GABRIEL'S WING میں موجود ہیں۔ کتاب مذکور کا ترجمہ "شہپرِ جبریل" کے عنوان سے ہوا، تاہم فاضل مصنف یہ اعتراف کرتے ہیں:

> "ترجمے کے سلسلے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ میں متن کو سامنے رکھ کر قلم برداشتہ ترجمہ لکھتا گیا، نہ عبارت آرائی کی ہے نہ پاک نویسی۔ جرمن اور فرانسیسی زبانوں کی کتابوں اور رسالوں کے حوالے حذف کر دیئے اور کہیں کہیں حواشی متن میں آگئے اور کہیں اس کے برعکس متن حاشیے میں چلا گیا۔ پھر بعض حاشیئے لکھنے مترجم کو بے جواز نظر آئے جبکہ بعض توضیحی حواشی کا اضافہ کرنا پڑا۔"۲

اس اقبالی بیان سے کتاب کی افادیت بہت حد تک کم ہو جاتی ہے اور یوں بھی راقم نے ماخذِ اوّل یعنی انگریزی میں دستیاب ۱۹۸۹ء کے ایڈیشن کو زیرِ مطالعہ لانا موزوں خیال کیا۔ فکری حوالوں سے شمل نے اقبال تک رسائی کیسے حاصل کی؟ یہاں چند اور ذرائع، پہلے سے موجود توضیح کی توثیق کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ذیل کے یہ دو اقتباسات اہمیت کے حامل ہیں جن سے نہ صرف شمل کی اقبال پسندی مترشح ہوتی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اقبال فکری سطح پر گوئٹے سے کس قدر اثر لیے ہوئے تھے:

"The first poem by Iqbal which I ever read was 'Meeting in Paradise', that lonely scene in Payam-e-Mashriq in which the poet has a vision of Goethe and Rumi, his two spiritual leaders from the West and the East, respectively. As a German and lover of German poetry, I could not help being fascinated by the idea that a Muslim poet in India had understood that aspect of German Literature which interested me most, and being an enthusiastic admirer of Maulana Rumi already during my student days, I became immediately interested in Iqbal's work; Nicholson's fine analysis of the Payam-e-Mashriq in Islamica 1 (1925) never ceased to inspire me. Thus, I found my way to Iqbal through Goethe and Rumi; but it was only many years later I discovered how immense Goethe's influence on Iqbal had been."3

"When I was young student in Berlin, I read, for the first time, the article by R. A. Nicholson, the great British Orientalist, who was the first European interpreter of Iqbal and who introduced his work into the English-speaking world. The article I am referring to is about Iqbal's Payam-Mashriq, a collection of Persian verse which is the answer of the Indo-Muslim poet to Goethe's' Westöstlicher Divan. In this collection of poetry, we find one scene which touched me deeply when I was a young girl. It is a meeting of our German poet, Goethe, the author of Faust and the Persian great Sufi, Maulana Jalaluddin Rumi, the author of the "Masnavi" which has been called rightly "Quran dar-Zab-n-e-Pehlavi" - the Quran in the Persian language. I loved both of them and I thought a poet and philosopher who brings my two ideals together is worth studying."4

شمل نے اقبالؔ پر پہلا لیکچر ۱۹۴۷ء میں دیا۔ جس میں انھوں نے گوئٹے اور اقبالؔ کا تفصیلی تقابل کیا۔۵ کتاب GABRIEL'S WING کے ابواب دیکھیں تو کسی الٰہیاتی کتاب کا التباس ہوتا ہے، اگرچہ اس میں کچھ شک نہیں کہ اقبالؔ کی شاعری کے بنیادی ماخذ قرآن اور سیرتِ رسول ﷺ کے ساتھ اسلامی تاریخ، مشرقی اور مغربی فلسفہ، ادیانِ عالم، ملکی اور بین الاقوامی سیاست، مسلم و غیر مسلم تحاریک تا ادب اور خاص طور سے جرمن مفکرین اور نابغۂ روزگار شعراء ہیں تاہم عقائد و نظریات یا مَبادیٔ اسلام کے ضمن میں فکر اقبالؔ کی توضیح میں یہ ایک انتہائی منفرد تجربہ ہے؛ یعنی ہم اقبالؔ کے افکار براہِ راست جاننے سے کچھ فاصلے پر ہیں اور درمیان میں الٰہیاتی مضامین جن کے تناظر میں فکر اقبالؔ کی تجسیم کی گئی ہے اور یہ یکسر جدا، زاویۂ نظر ہے۔ اس ضمن میں شمل نے ابواب اور ان کے ذیلی عنوانات کے وسیلہ سے نہ صرف فکرِ اقبالؔ کو جاننے کی کوشش کی بلکہ مسلم الٰہیات کو بھی مغربی قارئین کے لیے صراحت سے پیش کیا۔ بابِ دوم اور سوم خاص طور سے مسلم ایقان سے جڑے ہوئے ہیں۔ یعنی اقبالؔ کو سبیل بناتے ہوئے اسلام کے بنیادی ارکان توحید، رسالت ﷺ، عبادت، روزہ، زکوٰۃ، حج، اور جہاد کی تصریح کی گئی ہے۔ اسی طرح بابِ سوم ایمانِ مجمل کا کاملاً احاطہ کرتا ہے۔ خدا اور اس کے فرشتوں، انبیا کرامؑ، روزِ محشر، تقدیر اور خیر و شر پر یقین کو

باقاعدہ ذیلی عنوانات کے تحت باب کا حصہ بنایا گیا ہے اور یہ کلامِ اقبالؔ کا اعجاز ہے کہ جہاں الٰہیاتی موضوعات سے متعلق مواد کی وافر دستیابی ہے وہیں جمہوریت، خلافت اور پین اسلام ازم سے اشتراکیت تک کے مضامین بھی بکثرت موجود ہیں۔ غرض اس کتاب کے وسطی دو باب خاص طور سے مسلم عقیدے کی توضیح، بحوالہ اقبالؔ، مخصوص کیے گئے ہیں۔ اسلامک اسٹڈیز میں شائع اپنے ایک مقالے میں شریف الحسن کتاب کے ابواب کی بابت کچھ یوں رقم طراز ہیں:

“One wonders if this novel pattern-analogous to that of the Kenneth Cragg’s call of the Minaret or Constance Padwick’s Muslim Devotions- was a happy choice for an analysis of Iqbal’s poetry and an unavoidable discussion of his philosophical as well as social and political ideas. On the one hand, the scheme has allowed insufficient room for an examination of his views on the reconstruction of religious thought in Islam, on the other, a good deal of overlapping is inevitable, though the author has skillfully avoided repeating herself.”6

اسلام اور مسلم شخصیات کی بابت گفتگو کرتے ہوئے عموماً شمل کا قلم احتیاط کو ملحوظ رکھتا ہے تاہم کہیں کہیں روانی میں فروگزاشتیں بھی ہوئی ہیں جیسے خلفائے راشدینؓ کے بارے میں ان سے چوک ہوئی اور کم درجہ کے انگریزی الفاظ کی ترتیب، تحریر کا حصہ بن گئی:

“The theoretical basis for the role of a caliph was essentially not given; after the four so-called Khulafai Rashidin...”7

راقم انگریزی ترکیب so called پر معترض ہے۔ تاہم یہ فروگزاشتیں معدودے چند ہیں اور شمل کا عمومی رویہ، بابت اکابر شخصیات، لائقِ تحسین ہے۔ باب اوّل کے حصہ دوم میں شمل اقبالؔ کی زندگی، مبحث کا حصہ بناتے ہوئے ان کے بدیسی روابط کی تفصیل فراہم کرتی ہیں جو عام قاری کے لیے دلچسپی کا سبب ہیں۔ پیامِ مشرق پر

آر۔اے۔ نکلسن کا نوٹ جو Islamica کے والیم "1 "میں چھپا، سے اقبالؔ کا شہرہ مغربی دنیا میں ہوا اور پیامِ مشرق کو پزیرائی حاصل ہوئی۔ مسلم نشاۃ الثانیہ کے ترک شاعر محمد عاکف جن کے خیالات بڑی حد تک اقبالؔ سے مماثل ہیں نے مذکورہ کتاب خود اقبالؔ سے وصول کی جب وہ ترکی کے دورہ پر تھے۔۸ محمد عاکف کا اقبالؔ کی بابت یہ بیان دلچسپی کا حامل ہے:

"I compared the poet to myself. Iqbal who has read the whole poetry of the great Sufis which were brought up in the East and then, having gone to Germany, also digested well the Western Philosophy, is indeed a very strong poet…In the Payam-i-Mashriq there are very beautiful pieces and ghazals. One or two of his ghazals made me shout in intoxication."8

اقبالؔ کے بدیسی روابط سے متعلق شمل نے بہت سی گرانقدر معلومات فراہم کیں۔ قاری ان سے بڑی حد تک محظوظ ہوتا ہے۔ مثلاً وہ یہ بتاتی ہیں کہ اقبالؔ جامعۃ الازہر کے ترقی پسند ریکٹر مصطفیٰ مارا غی اور پروفیسر خالد خلیل جو استنبول یونیورسٹی سے متعلق تھے، سے رابطہ میں تھے اور ہندوستان کے مسلم شہزادوں کی بابت نالاں تھے کہ وہ اسلام کے لیے اپنامال خرچ کرنے کو تیار نہ ہوتے تھے۔۹

اسی طرح تیسری گول میز کانفرنس (نومبر ۱۹۳۲ء) کے اختتام پر اپنے دورہ فرانس کے دوران وہ نہ صرف ہنری برگساں سے ملے بلکہ پروفیسر میسی یوں سے بھی ملاقات کی اور ان سے منصور حلاجؒ کی بابت نطشے کی توضیح پر مکالمہ کیا۔۱۰

لوئی میسی یوں ہی وہ شخصیت ہیں جن کے توضیحی افکار کے باعث اقبالؔ منصور حلاجؒ کی بابت نہ صرف اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہوئے بلکہ 'جاوید نامہ' میں فلکِ مشتری پر، مولانا رومؒ کی معیت میں جن 'ارواحِ جلیلہ' سے ملتے ہیں ان میں ایک 'روحِ مقدسہ' منصور حلاجؒ کی بھی ہے جن سے نصیب، مقدر اور زندگی کی بابت انتہائی معنی خیز گفتگو ہوتی ہے

اور بہ زبان حلاجؒ ان کے افکار جاننے کی جستجو نظر آتی ہے۔ فرانس سے اسپین پہنچنے پر مسجدِ قرطبہ کو دیکھنے کے بعد وہ معروف کیتھولک پادری اور مستشرق ایسن پلاسی اوز (Asin placiou) کی دعوت پر دار الخلافہ میڈرڈ میں ایک لیکچر دیتے ہیں۔[11] یہ وہی ایسن پلاسی اوز ہیں جو امام غزالیؒ، شیخ محی الدین ابنِ عربیؒ اور دانتے پر اپنے عالمانہ تفحص کی بنیاد پر شہرہ رکھتے تھے۔ یوں دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اقبالؔ اپنے عہد کی نابغہ رُوزگار شخصیات سے براہِ راست تعلق قائم رکھے ہوئے تھے اور ان کی شناخت ایک عالمی مسلم شاعر، فلاسفر اور اسکالر کی حیثیت سے بتدریج تسلیم کی جارہی تھی۔ اس ضمن میں شریف الحسن کچھ یوں گویا ہیں:

"Iqbal's fame had spread far and wide, even outside the land of his birth, in his life-time. No other Muslim thinker and poet of the modern age has attracted so much attention of the West. Following the trail blazed by Nicholson, several Orientalists have rendered some of his works into the leading European Languages and produced scholarly studies of his thought and poetry. Prominent among them is Prof. A. Schimmel who has translated the Payam-i- Mashriq and the Javidnamah into German verse, published a Turkish commentary on the latter, contributed a score of well-written articles and delivered dozens of lectures on him Germany, Pakistan, Turkey, Iran and Sweden."12

شمل کی اسلام فہمی ایک جدا باب یا مقالے کی تسوید کو سزاوار ہے تاہم اس کتاب میں جہاں تہاں وہ اسلام کے بنیادی ارکان کی بابت اپنے تفحص کا اظہار کرتی ہیں وہاں ان کے عمیق مطالعے اور تخلیقیت کا قاری بہ خوبی مشاہدہ کر سکتا ہے۔ وہ اسلام کو ایک زندہ (live) مذہب کی حیثیت سے پرکھتی ہیں۔ اسلام کے بنیادی ارکان کے حوالہ سے ان کی گفتگو ایک بلند سطح پر اپنا تفاعل پیش کرتی ہے؛ مثلاً کلمہ توحید کے حوالہ سے وہ کامل مسلم ایقان بیان کرنے پر قادر ہیں۔ اقبالؔ کے وسیلہ سے وحدانیت کی توضیح ایک بھرپور علمی مکاشفے سے مملو ہے، اور پھر گفتگو محض ایک عقیدے کی سطح پر نہیں رہتی بلکہ کائناتی تعبیر کا ایک اہم وسیلہ بن جاتی ہے۔ فکرِ اقبالؔ کا یہ معنوی دروبست ان کے بسیط اور اخلاص

سے پُر مطالعے کی دین ہے جس پر جتنی بھی داد دی جائے، کم ہے؛ اور یہی وہ خاور شناسی ہے جس پر بعض مغربی ناقدین چیں بہ جبیں ہیں:

"The credo La` ilaha illa` Allah has an importance in the realms of art and also of mystic poetry which can scarcely be overestimated. In the Arabic script its alternating letters alif and la– two letters with vertical stems

لا الہ الا اللہ

From a wonderful basic pattern for every kind of decorative ornamentation of the formula which is, of course, found everywhere Muslims have reached, and both in minor arts and architectural inscriptions these weighty words have been ornated with so intricate and bewildering interlacing ornaments that an uninitiated would scarcely imagine that the essence of Muslim faith is concealed behind them."13

اقبالؔ ہی کے وسیلہ سے رمزِ توحید کے اکناف پھیلاتے ہوئے شمل، نطشے اور بالشویک انقلابِ کی بابت گفتگو کرتی ہیں اور ہم ایک نئی انقلابی فکر(PARADIGM SHIFT)کو جا لیتے ہیں۔ شمل، اقبالؔ کی معیت میں متخالف تقابلی افکار اور سماجی رویوں کو باہم آمیز کرتی ہیں اور اس کا بنیادی مقصد بہتر تصریح و توضیح ہے؛ مثلاً نطشے کی بابت یہ کہنا کہ وہ اپنے افکار کی ایک خاص سطح پر جا کر رک گیا، اور اس سے آگے نہ جا سکا۔ یہ اقبالؔ کی روشن خیالی اور وسیع المشربی تھی کی انھوں نے نطشے کو عقیدے کی بنیاد پر یک جنبشِ قلم مسترد نہ کیا اور نطشے کے انکارِ حق کی اک جدا فکری تفہیم کرتے ہوئے اسے مجذوب قرار دیا، یعنی نطشے کا 'لا' کہنا ٹھیک تھا لیکن انکار کے بعد کا اثبات 'الا اللہ' تک وہ نہ پہنچ پایا؛ اور یہی کچھ انھیں بالشویک انقلاب اور کارل مارکس کے ہاں نظر آیا اور مارکس کی بابت یہاں تک کہا:

نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب

(اقبال۔ کلیاتِ اقبال، اردو۔ لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، س۔ن، ص ۶۵۰)

شمل ان خیالات کی جمع آوری میں عیسائیت کو بھی شامل کرتی ہیں اور چونکہ اقبالؔ دینِ عیسویؑ کے مقلدین سے بہت مایوس تھے اس لیے انھیں وہ تمام سرکش بھلے معلوم ہوئے جنھوں نے زندگی کی بنیاد تحرک پر رکھی۔ اس بابت شمل کی یہ رائے اہمیت کی حامل ہے:

"The second instance in the Javidname where la and illa are confronted is the apparition of Nietzsche (v. 1373 ff.): he, the admired and pitied philosopher is also said to have remained in the state of la`, having asserted that God had died, and there is no God; Iqbal, well aware of his hard spiritual struggle, deplores that he has never attained the illa, though his heart was faithful. In both cases, that of Russia and that of Nietzsche, the poet had used the formula not as a mere play of words but displays his deep sympathy with those whom he imagines to have negated the tenets of Christian religion and Western civilization and to be very close to Islam but who have failed to make the last step and are therefore condemned to eternal spiritual death."14

اقبالؔ پر یہ نقد موجود ہے کہ اقبالؔ کا مردِ مومن نطشے کے سپر مین اور شیخ عبدالکریم الجیلیؒ کے مردِ کامل سے ماخوذ ہے اور نطشے کا سپر مین بعد از خدا، اس ذات کا متبادل ہے؛ جبکہ نطشے کے برعکس اقبالؔ کا مردِ مومن اِک جدا، الٰہیاتی تصور سے جڑا ہوا ہے یعنی جہاں نطشے نفیٔ خدا سے تکمیلِ انسان کا خواب دیکھ رہا ہے وہیں اس کی نقیض میں توحید و رسالت کے سانچے میں ڈھلے، اقبالؔ کے مردِ مومن کی تجسیم ہوتی ہے اور اس کی فکری و روحانی تربیت خودی کے اسرار سے مملو ہے۔ جبھی تو شمل یہ کہتی ہیں کہ جہاں اقبالؔ عیسائیت پر ثبت یونانی افکار و خیالات کے سبب، انسانی معراج اور نجات کی بابت مایوس ہیں وہیں وہ فکرِ اسلامی پر موجود یونانی (HELLENISED) تفکر سے بھی ناامید ہیں اور ایک متحرک اسلامی تفاعل کے ڈھے جانے پر رنجیدہ نظر آتے ہیں:

“The mard-i-mu`min is much closer related to the Insan-i-kamil of classical mysticism that to the Superman who can only appear after “ God has died”;.........His ideal can be expressed , in a certain way, by the words of the German philosopher Rudolf Pannwitz (d. 1968) who was in search of the Man par execellence.”15

شمل کے نزدیک یہ مردِ مومن الجیلیؒ کے مردِ کامل سے اپنا خمیر اٹھائے ہوئے ہے اور اپنی کتاب (GABRIEL’S WING) میں اسی موضوع پر مزید صراحت کے ساتھ اقبالؔ کے مردِ مومن اور نطشے کے سپر مین کا تقابل پیش کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ مردِ مومن جس کی تعمیر میں تربیتِ خودی مضمر ہے اطاعتِ خداوندی کا اپنا سرمایہ سمجھتا ہے جبکہ سپر مین اطاعتِ ایزدی سے مبرّا ہے اور یہی وہ بنیادی فرق ہے جو دونوں فلاسفہ کے ہاں نظر آتا ہے یعنی اقبالؔ کے ہاں یہ معاملہ اطاعتِ خداوندی سے جڑا ہوا ہے اور وہ اسے بوجھ نہیں جانتا کہ اسے معلوم ہے کہ یہ سرّی تائید اسے مزید توانا رکھتی ہے، بھٹکنے سے بچاتی ہے اور حدبست سے باہر نکلنے پر ضرب لگاتی ہے۔١٦ یا معشر الجن والانسِ ان استطعتم ان تنفذو من اقطار السمٰوات والارضِ فانفذو ط لا تنفذون الا بسلطٰن (سورہ رحمٰن:٣٣)

کتاب Gabriel’s Wing میں نطشے سے متعلق مباحث کئی اور جگہوں پر بھی موجود ہیں اور قریباً ہر موقع پر شمل نے یہ توضیح کی کہ ان کے ممدوح یعنی اقبالؔ ایک حد تک نطشے سے متاثر تھے اور اس کی اغلب وجہ یہ تھی کہ دونوں مفکرین کا بنیادی ایقان ہی بُعد رکھے ہوئے تھا۔ ایک توحید و رسالت کا داعی تھا اور ایک منکرِ خدا۔ شمل جس عہد میں زندہ تھی وہ سیاسی اور عسکری اعتبار سے نطشے کے فلسفہ سے متاثر تھا۔ نطشے کا سپر مین 'ہٹلر' کی صورت میں دنیا کو تہہ و بالا کر رہا تھا۔ ایک بڑھی ہوئی طاقت اپنے افعال و اعمال میں کسی کو بھی جوابدہ نہ تھی اور وہ اپنے معاملات میں آزادہ و خود مختار تھی۔ اخلاقیات، انسانیت اور روحانی آدرش دم توڑ رہے تھے؛ خود شمل کو جبری مشقت کا سامنا کرنا پڑا۔ کم و بیش ساٹھ لاکھ یہودی گیس چیمبرز میں ہلاک کر دیے گئے۔ غرض یہ فوق الاقوام کا وہ تصور تھا جس نے اپنے تئیں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس زمین پر سورج کے نیچے، سب سے بہتر قوم، جرمن قوم ہے۔ فلسفہ فوق البشر، فوق الاقوام سے متبدل ہوا، اور دوسری جنگِ عظیم نے بہت کچھ بدل ڈالا۔ نطشے کے فلسفہ میں موجود ابدی اعادہ (Eternal

recurrence) ہر پڑھنے، سننے والے کو متاثر کرتا ہے، گرچہ یہ فکری ماحصل نطشے ہی نے پہلی بار پیش نہ کیا تھا بلکہ اس کی گونج قدیم یونان، ہندوستان میں سنی جاتی رہی۔ تاہم قدیمی عہد کے معدوم ہو جانے اور عیسائیت کے فروغ کے سبب یہ انسانی تقویمی خیال قصہ پارینہ بن گیا اور نطشے نے اسے از سرِ نو، بھرپور فکری تفاعل کے ساتھ پیش کیا جس سے اقبالؔ متاثر ہوئے اور پیامِ مشرق میں انھیں زبردست خراجِ تحسین پیش کیا۔ شمل نے جرمن فلاسفر اور شاعر پان وٹز کی رائے بابت اعادۂ ابدی (Eternal recurrence) اور اقبالؔ کے بارے میں کسی قدر مختلف انداز پر یہ فہم پیش کیا، یعنی یہ بتایا کہ اس ضمن میں اقبالؔ سے چُوک ہوئی اور وہ نطشے کے اس فکری ضابطہ کو درست تناظر میں سمجھ نہ پائے:

"Pannwitz has however, show that, viewed from the right angle, Eternal Recurrence is meant not as a deadening repetition but should be compared to a scala with the development of its potencies, dominants, and system of dominants; it would, then, rather be a spiral than an eternal circle in which Nietzsche is confined according to Iqbal's view. Iqbal has never reached such a view, or invented a system of periodicity which would be opposed to his theory of spontaneous and unpredictable development.........17

اقبالؔ مغربی فلسفہ، سیاسیات، معاشیات اور سماجیات پر گہری نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ گردوپیش کی تحاریک اور تبدیلیوں کے براہِ راست ناظر، اور صاحب الرّائے تھے۔ نیشنل ازم اور اس کی تباہ کاریاں دیکھ چکے تھے۔ اوران اسباب کے متلاشی تھے جو انسانی تنزل، وحشت وخوں ریزی اور بے جا نسلی تفوق کے پس پردہ فعال تھے۔ وطن پرستی ایک ایسا مرکزہ ایقان بن چکا تھا جس کو اختیار کر لینے کے بعد مقابل اقوام کی حرمت، احترام کوئی معنٰی نہ رکھتا تھا۔ اقبالؔ اس جذبۂ وطنیت کے حد سے بڑھ جانے کے مضمرات سے باخبر تھے اور پہلی جنگِ عظیم کی صورت میں اس مہیب صورتحال کی جانچ کرتے رہے، اور اسی کے ساتھ ساتھ پیش آیند دوسری جنگِ عظیم کی بابت خائف تھے اور اس ضمن میں ان کی پیش گوئی حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی۔

مذہب بیزاری کے نتیجہ میں پروان چڑھنے والی بے لگام وطنیت اور قوم پرستی کے اخلاقی تنزل نے جہاں فرد کو انفرادی طور پر متاثر کیا وہیں پورا سماج اور سماجی ادارے بھی اس کی لپیٹ میں آ گئے ۔ پندرھویں صدی عیسوی سے چرچ کی بے دخلی اور اس کا ایک بڑا سبب سقوطِ قسطنطنیہ (۲۹ مئی ۱۴۵۳ء) ہے جب عثمانیوں کے ہاتھوں بازنطینی ریاست (مشرقی پاپائیت) کی علامتی حیثیت بھی ختم ہو گی۔ چرچ کے حد سے بڑھے ہوئے رسوخ نے اقوامِ مغرب کے ہاں بہت سی تحاریک کو فروغ دیا۔ لوتھر سے ڈیوڈ ہیوم تک کے مذہبی اور سماجی دانشوروں نے چرچ سے آزادی اور انسانی وقار واحترام کی جو کاوشیں کی وہ بالآخر ریاستی امور سے پاپائیت کے خاتمہ پر منتج ہوئیں۔ تاہم اس کے نتیجہ میں آگے چل کر اخلاقی اقدار کا جنازہ نکل گیا اور یوں وہ معاشرے جو برے بھلے انداز پر روحانیت سے جڑے ہوئے تھے اب کاملاً مادیت کی زد میں آ گئے۔ مغربی اقوام کے پیشِ نظر اعلیٰ انسانی آدرشوں کی چنداں اہمیت نہ رہی۔ ان کا مطمحِ نظر مال واسباب کی فراوانی اور ان کا حصول تھا اور اس میں وہ کامیاب رہے اور اس کا بیّن ثبوت سترہویں (۱۷) صدی عیسوی میں قائم ہونے والی ایسٹ انڈیا کمپنیز ہیں جو فرانس، انگلینڈ، ڈنمارک، اسپین اور پرتگال ایسے ممالک کی سرکاری سرپرستی میں قائم ہوئیں، اور جن کے پیشِ نظر اقوامِ مشرق کے وسائل پر بے دریغ قبضہ تھا۔ اقبالؔ مغرب کے اس ریاستی تنزل اور خاص طور سے عیسائیت کی بابت ایک بھرپور موٗقف رکھتے تھے۔ وہ مادیت اور روحانیت کی باہم تقسیم پر رنجیدہ تھے اور ریاست یا سیاست سے دین کی دوری پر مایوس تھے:

؎ جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی!

(اقبال۔ کلیاتِ اقبال، اردو۔ لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ص ۳۳۲)

پہلی اور دوسری جنگِ عظیم وطن پرستی، نسلی تفوق اور قوموں کے مابین شدید غلط فہمیوں کے سبب لڑی گئیں۔ اقبالؒ خاص طور سے جنگِ عظیم اول کے بعد کی بحرانی کیفیت سے رنجیدہ تھے۔ کروڑوں لوگ قتل کیے جا چکے تھے۔ لاکھوں بے گھر تھے ایسے میں انسانوں کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لیے وہ کسی ایسی حکمت پر غور کر رہے تھے جو نسلِ انسانی کی نجات و برأت اور آئندہ ادوار کے لیے مشعلِ راہ بنے۔ اس ضمن میں قرآنِ حکیم کی تعلیمات انھیں نجات دہندہ معلوم ہوئیں؛ اور اس معرفت اور حکمت کو وہ اقوامِ مغرب کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ نظم و نثر میں قرآنی تلمیحات بہ کثرت در آئی ہیں، اور شریعتِ اسلامی کو وہ مغربی معاشروں کے لیے مثالی نمونہ سمجھنے لگے:

"It is the infallible measure of everything in life which enables man to control his movements in every moment and which guides him into the right direction unless trespass occur. Just as the innate Divine law does not allow transgression in organism and balances against the overdevelopment of one part by the weakening of another part, so the Sharia, in Iqbalian interpretation, is at the same time the eternal measure of human behavior and vouchsafes the greatest possible organic development for the faculties of individual and nations."18

تہذیب مغرب کے بطن سے جنم لینے والی انسان دوستی اور عالمگیر انسانی اخوت کے دروس اقبالؒ کی نظر میں کھٹکتے رہے اور اس کا سبب روحانیت سے وہ دوری تھی جسے مغرب اپنی سیاسی اور اجتماعی زندگی سے دور پھینک چکا تھا اور رہی سہی کسر دینِ عیسوی کی وہ غلط تشریح تھی جس کے نتیجہ میں حضرت عیسیٰؑ کا پیغام ٹھیک طور سے پھیل نہ سکا۔ اسی لیے یہ تاثر قائم ہوا کہ صدیوں عیسائیت کے دامن میں زندہ رہنے کے باوجود اہلِ مغرب من حیث المجموع دینِ عیسیٰؑ سے بے خبر رہے یا حضرت عیسیٰؑ اہلِ مغرب کے ساتھ نہ رہے۔ غرض بقول اقبالؒ، اہلِ مغرب نے دین میں ثنویت پیدا کر دی۔ روحانیت اور مادیت جدا جدا خانوں میں منقسم ہو گئی۔ چرچ جو روحانیت اور اخلاقیات کا نمائندہ تھا، امورِ

ریاست سے حذف ہو گیااور شاید یہی سبب تھا کہ انیسویں صدی کے آخری عشروں میں یہ التزام ہوا کہ برطانوی شہریوں کو دانش گاہوں میں ایمانداری اور سچائی کا درس دینے کے بجائے ریاست سے وفادار رہنے کی تربیت دی جانے لگی۔ متھیو آرنلڈ اس کے ایک اہم ناقد تھے۔ شمل نے تاہم عیسائیت کی غلط توضیح کی بابت اقبالؔ کی رائے سے اختلاف کیااور یہ کہا:

"He arrived, just as Ghazzali in his refutation of Averroes' doctrine of the immortality of the active intellect, at the conclusion that a separation between body and soul is not acceptable, and "this is the position of the theologian who has drawn his inspiration from the Quran. Iqbal rejects such a separation and with it the idea of the soma sema, this favorite symbol of the mystics of all times. Yet in his rejection he is mistaken in attributing this separation to Western Christianity. Although the development of Christian theology has reached similar conclusions under the strong influence of Greek thought and Manichean systems, the original Christianity has not known the dualism of spirit and matter which was so typical of the gnostic currents but never of Prophetic religion. Iqbal, however, has regarded the dualism which he thought essential of Christianity as the weakest point of that religion, and saw it reflected also in the separation of State and Church."19

Gabriel's Wing میں شمل نے جہاں اقبالؔ کے اس عیسائی ثنویت کے فکری معاملہ پر اختلاف کیا وہیں ان کی جانب سے یہ گلہ بھی نظر آیا کہ انھوں نے حضرت عیسیٰؑ کو اپنے کلام میں وہ بلند مقام نہ دیا جو وہ حضرت ابراہیمؑ اور سیرتِ موسیٰؑ کو دیتے ہیں۔ یعنی فکرِ اقبالؔ میں عیسائیت کی بابت بہتر ذکر نہ ہو سکا بلکہ مسیحی تصور نقد و تعبیر کی زد میں آیا۔۲۰ جبکہ شریف الحسن اس معاملہ میں شمل سے جدا رائے رکھتے ہیں؛ ان کے نزدیک شمل جنابِ عیسیٰؑ کا ذکر کرتے یہ بھلا بیٹھیں کہ اُردو و فارسی شاعری میں انبیائے انجیلؑ اپنی معجز قوتوں کی معیت میں، علامتی حیثیت میں،

بکثرت حوالوں کا سبب بنتے ہیں اور یہ ایک نوع کا شعری لائسینس ہے جو بسا اوقات گستاخانہ معلوم ہوتا ہے۔"۲۱اس ضمن میں اقبالؔ اور غالبؔ کے متعدد اشعار کا حوالہ دیا جا سکتا ہے تاہم گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے راقم اس امر کی بھی تصریح بحوالہ شمل کرنا چاہے گا کہ ہر موقع پر ایسا نہیں ہے۔ اقبالؔ اپنے مذہبی مطالعہ کو سطحی انداز پر پیش نہیں کرتے۔ وہ مذہب اور فلسفہ کے مبادیات اور ان کے جملہ باہمی انسلاکات و روابط پر گہری نظر رکھے ہوئے تھے۔ اسی لیے شمل ان کے فلسفہ خودی اور عیسائیت کے بارے کچھ یوں رقم طراز ہیں:

"Iqbal has often stressed the importance of suffering for the development of Self, and he states that no religious system can ignore the moral value of suffering. The error of the builders of Christianity was that they based their religion on the fact of suffering alone, and ignored the moral value of other factors. Yet such a religious system was a necessity to the European mind in order to supplement the beautiful but one-sided Hellenic ideal. The Greek dream of life was certainly the best, as Goethe says, but it was wanting in the colour element of suffering which was supplied by Christianity."22

لیکن یہاں یونانی المیہ کیسے نظر انداز ہو سکتا ہے جو فن ڈرامہ نگاری میں کمال مہارت سے پیش ہوا، اور جس کے اثرات ہومر کی ایلیڈ سے ارسطو کی 'بوطیقا' تک میں مشاہدہ کیے جا سکتے ہیں۔ یعنی یونانی ادب یا شعریات اس فنی تلازمے کی آفاقی حیثیت سے بخوبی آگاہ تھے اور انھیں بخوبی علم تھا کہ اسے کب اور کہاں برتنا ہے۔

شمل، اقبالؔ کے فلسفہ خودی پر بات کرتے ہوئے علم الکلام کے مختلف مباحث اور تقابلی مطالعات کے دقیق پہلو سجھاتی ہیں اور بعض مواقع پر ان کا تفحص پیچیدہ صورت اختیار کیے ہوئے ہے؛ مثلاً تفاسیری ذخائر اور صوفیانہ رموز سے گزرتے ہوئے جب اقبالؔ بے تأمل یہ کہتے ہیں کہ رب العزّت اول و آخر 'خودی' ہے اور لفظ اللہ، ذاتِ حق کے اوصاف کا مظہر ہے اور سورہ اخلاص خدا کی وحدانیت کا ایک مختصر بیانیہ ہے جس کی اہمیت، اسلامی فکر، الٰہیات، اور روحانی زندگی میں مسلّم ہے اور یہ 'خودی' از خود ایک بین ثبوت ہے۔۲۳ تو ان کی فکر سلطان العارفین، حضرت

سلطان باھوؒ سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے اور یوں لگتا ہے کہ اقبالؔ کا یہ تعبیری فہم حضرت سلطان باھوؒ کے افکار سے فیض اٹھائے ہوئے ہے۔ اقبالؔ جس طرح مرشدِ رومیؒ سے ہم کلام ہو کر سوال و جواب کے وسیلہ سے ،زندگی کے اسرار جاننے کی جستجو کرتے ہیں کچھ اسی انداز پر ذیل کے اقتباسات میں گفتگو کا رنگ دیکھنے کو ملتا ہے:

"ای مردک! سعی بکن کہ از مرتبہ مردک بگزری و بمرتبہ مرد رسی۔ مرتبہ ٔمردک چیست و مرتبہ ٔمرد کیست؟ مرتبہ ٔمردک آنست کہ دوامِ محاربہ ٔکند باعداءِاللہ تعالیٰ کہ نفس و شیطان است و مرتبہ ٔمردِ غازی آنست کہ یکبارگی سرِّ اغیارِ نفس راازہوا وہوس جدا اندازد کہ از محاربہ ٔاو ایمن شود یعنی باستقامت رسد کہ مرتبہ ٔاستقامت بہ از کرامت و مقامت است۔۔۔۔۔۔۔یک نظر مرشدِ کامل بہتر است از عبادتِ ہزار سال چرا کہ در علمِ سر دردی، سر بسر قیل و قال است و در نظر صاحبِ نظر تمام معرفتِ وصال است۔"۲۴

مذکورہ اقتباس کی آخری سطریں اقبالؔ کے اس شعر کی یاد دلاتی ہیں۔

؎یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی　　　سکھائے کس نے اسمٰعیلؑ کو آدابِ فرزندی؟

(اقبالؒ۔ کلیاتِ اقبال۔ لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ص۳۰۶)

شمل تصورِ خودی کی مزید تصریح کچھ یوں کرتی ہیں:

“In Iqbal’s philosophy and theology, however, there are other egos besides God, or rather inside the all-embracing Divine Ego. The world itself is conceived as an Ego, and everything created it nothing but an ego; the unimaginative varieties of them are sustained by that comprehensive Divine Ego who holds them in his own being-not in his imagination.25

یہاں تک تو بات درست معلوم ہوتی ہے لیکن اسی اقتباس سے جڑی ذیل کی گفتگو فکرِ اقبالؔ سے متناقض معلوم ہوتی ہے؛اور شمل نجانے کیوں اس ضمن میں وحدت الوجودی افکار سے تصورِ خودی کو جوڑتی ہیں:

The existence of those numberless egos on different stages of development- from atom to man- whose existence is not obliterated by the greatest Ego, seem to be self-contradictory, for either the smaller egos have no existence of their own but are organic parts of Greatest Ego, or they exist in a sphere outside that Ego and cannot come into living and life –giving contact with him."26

خودی کا تصور یہاں کچھ گدلا سا جاتا ہے جبکہ شمل کے ہاں اور جگہوں پر یہ موضوع بہت واضح اور بہتر طور پر سامنے آیا ہے۔ اقبالؔ کا تصورِ خودی کسی صورت بھی تکثیرِ مظہریت(pantheism)کا محرک نہیں؛اور اقبالؔ نے بڑے شد و مد سے تصورِ خودی کی تعمیر،شناخت اور اس کے درست تفاعل پر زور دیا۔ جاوید نامہ میں فلک مشتری پر منصور حلاجؒ کی 'روحِ جلیلہ' سے بات کرتے ہوئے اقبالؔ تصورِ خودی کی شرح کچھ یوں کرتے ہیں:

بے خلش ہا زیستن، نا زیستن — باید آتش در تہِ پا زیستن

زیستن ایں گونہ تقدیرِ خودی است — از ہمیں تقدیرِ تعمیرِ خودی است

نار ہا پوشیدہ اندر نورِ اوست — جلوہ ہائے کائنات از طورِ اوست۲۷

خودی کے جملہ اسرار کی گرہ کشائی بعض مواقعوں پر بہت دلآویز ہے اور کلامِ اقبالؔ سے چن چن کر مضامین پیش کیے گئے ہیں:

"This ego, born in the heart of the infinite Ego, developing in Him, and yet distinct from Him, unable to exist without Him, but also unable to be non-existent in his presence (PM

199) is like a secret in the breast of the world (BJ 6) – a secret which God has revealed to the creation and which in its turn now reveals both itself and God."28

اسی طرح شمل خودی کی بابت جلال و جمال کی بحث سمیٹتے ہوئے خدائے عدم (Deus absconditus) اور خدائے حاضر (Deus revelatus) جسے Deus Ex Machina بھی کہتے ہیں کی تقابلی امثال پیش کرتی ہیں؛ اور کلامِ اقبالؔ میں یہ مضمون بہ صراحت موجود ہے:

از خودی طرحِ جہانے ریختند　دلبری با قاہری آمیختند

ہر کجا پیدا و ناپیدا خودی　بر نمی تابد نگاہِ ما خودی۲۹

الوہی مظہریت کے یہ دو رخ صوفیا کرام کی بابت بھی متعدد حوالوں سے پیش کیے جا چکے ہیں؛ اور بہت سے جلیل القدر صوفیا، شخصی اختصاص کی بنا پر انھی دو مظاہر کے حوالہ سے مشخص ہوتے ہیں۔ کسی کے ہاں جلال ہے تو کسی کے ہاں جمال۔ اور اس ضمن میں صوفیا کی ہر دل عزیز حدیثِ مبارکہ اللہ جمیل ویحب الجمال کا شمل تواتر سے ذکر کرتی ہیں۔ ان الوہی مظاہر کی بابت شمل کا یہ سوانحی بیان دلچسپی کا حامل ہے:

"I remember when I was a professor at Ankara; I tried to teach my Muslim students that our German philosopher Rudolf Otto had described God in categories of the mysterium tremendum, the tremendous, frightening mystery and the mysterium fascinans, the fascinating mystery. One of my students got up and said, "But we Muslims have known that for the last 1,000 years, we speak of God's Jalal (Majesty) and his Jamal (Beauty): these are the two aspects under which He has revealed Himself." That is an idea which Iqbal also takes up, although we have to say that in his concept of the Divine, the Jalal-side appears to be somewhat stronger than the Jamal-side." 30

شمل نے علم اور عشق کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے، صوفی تحاریک کے اثرات نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بتایا کہ عموماً اقبالؔ کے ہاں تصورِ عشق کی بابت جو تفہیمی رویہ موجود ہے وہ اصل معنٰی سے مختلف ہے۔ شمع و پروانہ کی ترکیب جو کلامِ اقبالؔ کے ابتدائی ادوار میں بکثرت استعمال ہوئی، اس کی تاریخی وقوع پذیری کے حوالہ سے بات کرتے ہوئے وہ منصور حلاجؒ کو جا لیتی ہیں اور قاری کو اس امر سے آگاہ کرتی ہیں کہ پہلی بار مسلم صوفی فکر میں یہ تلازمہ منصور کے ہاں دیکھنے کو ملتا ہے اور اقبالؔ کے ہاں تو یہ عشق کی ایک ایسی مظہریت میں ڈھلتا ہے جو انسانی جوہر کے جملہ امکانات کو تکوینی ضابطوں میں شریک کر لیتا ہے اور بے پناہ حوصلوں کا سرنامہ بن جاتا ہے۔

در دشتِ جنونِ من جبریلؑ زبوں صیدے　　یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ

(اقبال۔ کلیاتِ اقبال، فارسی۔ لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، س۔ن، ۳۳۶)

اقبالؔ کے ہاں عشق کی یہ فکری، فلسفیانہ عمل داری مولانا رومؒ کے وسیلہ سے فروغ پاتی ہے اور ان کے افکار کا ایسا تختۂ مشق بنتی ہے جو ان کے کلام کو ہر بار اٹھان دیتے ہوئے نئی معنویت سے آشکار کرتی ہے۔ اقبالؔ کے ہاں یہ مستقل موضوع کبھی عقل کے مقابل اپنے جوہر دکھاتا ہے تو کبھی علم کا حریف بنتا ہے؛ تاہم شمل کمال مہارت سے سندی اسباب کی بنیاد پر اس کی تفہیم کچھ یوں کرتی ہیں:

"He uses ʻilm mostly in the English sense of ʻscience', as natural science. ʻIshq is synthesis. ʻIlm is analysis. Both of them have to work together. In a great Persian poem in the Payam-i Mashriq, Iqbal shows that without love, without this synthetical approach, ʻilm, science, is something satanic. But if both of them co-operate they can create paradises on Earth. It is one of his finest expressions of his belief in synthetical thinking instead of a dry analytical approach."31

Gabriel's wing میں شمل نے اقبالؔ کا فکری جغرافیہ جس انداز پر تلاش کیا؛ جو علمی حدیں مرتب کیں اور جو فلسفیانہ عناصر ڈھونڈ نکالے اور باوجود یہ کہ کتاب کی تسوید الٰہیاتی تناظر میں ہوئی، اس پر رشک کیا جا سکتا ہے۔ شمل کے ان تفحصات کا دائرہ بہت سے مضامین کا احاطہ کرتا ہے اور ایسے نِکات سجھاتا ہے جس سے کلامِ اقبالؔ کی منزلت مزید بڑھتی ہے: مثلاً اقبالؔ کے حوالہ سے پیغمبرانہ مقاصد کی توضیح میں وہ اسلام کے ابدی، انسانی احترام پر گفتگو کرتے ہوئے یہ احساس دلاتی ہیں کہ محمد ﷺ کی تعلیمات کا بنیادی مقصد لوگوں کو رنگ، نسل، قومیت اور ارضی افتخار کے ساتھ ساتھ آقا و غلام میں موجود سماجی تفاوت سے باہر نکالنا تھا جبھی تو یہ تفاعل کسی بھی طور اہلِ مکہ کے لیے قابلِ قبول نہ تھا۔ اسی طرح شمل اقبالؔ کے ہاں موجود وطنیت کے تصور کو بہت واضح طور پر نمایاں کرنے میں کامیاب رہی ہیں اور جو اقبالؔ نے کہا کہ وطن ان تازہ خداؤں میں سب سے بڑا خدا ہے کی روحانی اور تاریخی صراحت کچھ یوں کرتی ہیں:

"To leave earth-rootedness and narrow patriotism, that is, for Iqbal, the meaning of Muhammad's hijra from Mecca to Madina which is indeed the moment when Islam as a socio-political ideal became visible, and which has been chosen very properly by the Muslims as the beginning of their calendar: had the Meccans at once accepted the teachings of Muhammad, the course of history would have been different. By cutting the relations with his beloved hometown the Prophet- according to Iqbal's interpretation- wanted to give an example to the generation to come."32

شہر مکہ کی قسم کھائی گئی 'لا اقسم بھذا البلد' کہ یہ نبی اکرم ﷺ کی جنم بھومی تھی اور آپ ﷺ کو ہر دلعزیز تھی۔ اس شہر کو چھوڑتے ہوئے آپؐ کی آنکھیں نم تھیں۔ اقبالؔ کی جودتِ طبع نے ہجرت سے جو معنیٰ اخذ کیے انھیں بہ کمال پیش کرنے میں شمل نے تمام مصادرِ نظم و نثر کو سامنے رکھا اور مشرق و مغرب میں اپنے قاری کو یہ بتایا کہ اقبالؔ وطن سے مریضانہ محبت کے داعی نہیں؛ اگرچہ وطن سے محبت، ایمان کی نشانیوں میں سے ہے لیکن اس کی

مجنونانہ پرستش فساد فی الارض کی صورت میں وہ مشاہدہ کر چکے تھے۔ پہلی جنگِ عظیم کے تمہیدی اسباب اسی مریضانہ محبت کے غماز تھے اور چونکہ اہلِ مشرق اور ملتِ اسلامیہ کے تنزل پر وہ دائمی رنجیدہ خاطر رہے چنانچہ ان کے ہاں ملت کسی ایک ارضی جغرافیہ کو محدود نہ رہی اور ہر ملک، ملکِ ما است کی صورت اختیار کر گیا۔

جو کرے گا امتیازِ رنگ وخوں، مٹ جائے گا   تُرکِ خرگاہی ہو یا اعرابی والا گُہر

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی   اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہ گزر

(اقبال۔ کلیاتِ اقبال، اردو۔ ص۲۶۵)

شمل مسلم الٰہیات کی تصریح میں اقبالؔ کی معاونت جابجا حاصل کرتی ہیں اور یوں لگتا ہے کہ ان کے ممدوح جن زاویوں اور وسیلوں سے الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشریح کر رہے ہیں، شمل ان سے کاملاً متفق ہیں اور ان کا اپنا دقیق مطالعہ بھی اُن نتائج تک پہنچتا ہے جو فکرِ اقبالؔ کے ماحصل ہیں؛ یعنی ملتِ اسلامیہ یا ملتِ بیضا کو اقبالؔ نے جن تناظرات میں متشکل کیا اور اس کی ایک عملی صورت گری کی سبیل نکالی وہ بیشتر شمل کی نظر میں تھے، یہی سبب ہے کہ ہم اوراق پلٹتے ہیں اور امتِ محمدی ﷺ کی نئی نئی علمی تعبیروں سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ وطنیت اور ملت کے جدلی پیرائے میں اقبالؔ کا یہ فہم ان کے کلامِ نظم ونثر میں پھیلا ہوا ہے۔ اقبالؔ کس طرح سے ملت کو وطنیت پر غالب دکھاتے ہیں اس کی ایک توضیح کچھ یوں ہے:

"The Islamic nation thus conceived as a sanctuary in which the Unity of God, the Unity of the Prophet, and the essential unity of all human beings are maintained as basis and centre of life, all the manifestation of nationalism which tried to break up this unity seemed to be for the poet nothing than new idols, new Lat and Manat-as he calls them with the name of the old pre-Islamic idols: we may translate adequately that political nationalism is Baalism.....It is the tragical destiny of the Islamic peoples, Iqbal complains, that today in

the struggle between Islam and nationalism(which is likened to the heathen town of Khyber) no Ali is found who might help the Muslims by his purity(BJ 93): nations should realize his attributes in themselves(cf. Mus. 38 ff.).33

Gabriel's Wing کے باب دُوم اور سوم میں بالترتیب اسلام کے بنیادی ارکان اور ایمانِ مجمل کو جدا جدا مبحث کا حصہ بناتے ہوئے شمل اقبالؔ کے تصورِ جہاد، عقیدۂ خیر و شر اور انبیأ کرام کو پیش کرتی ہیں اور قاری کو یہ پڑھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ ان امور کی بابت اقبالؔ کے افکار بہت زیادہ قوی و اہم نہیں؛ یعنی شمل کے نزدیک کلامِ اقبالؔ میں مذکورہ مسلم ایقانی عناصر اس قدر پھیلے ہوئے نہیں، اور لگتا ہے کہ جیسے جہاد کا پہلو بھی دب سا گیا ہے جبکہ صورتِ حال اس کے برعکس ہے۔

؎ کس کی نومیدی پہ حجت ہے یہ فرمانِ جدید　　　ہے جہاد اس دور میں مردِ مسلماں پر حرام

(اقبال۔ کلیاتِ اقبال، اردو۔ ۶۴۹)

؎ قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں　　　گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات!

؎ صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق، صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق!　　　معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق!

(اقبال۔ کلیاتِ اقبال، اردو۔ ۴۰۴)

؎ آگ ہے، اولادِ ابراہیمؑ ہے، نمرود ہے　　　کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

(اقبال۔ کلیاتِ اقبال، اردو۔ ۲۵۷)

غرض ایسی متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن میں جذبۂ حریت اور جہاد کی کارفرمائی نمایاں ہے۔ شمل کے ہاں یہ اشکال کہیں کہیں کھٹکتے ہیں اور بعض مواقعوں پر ان کا اقبالؔ سے تقاضا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے:

"In the Lectures, the problem of fasting has not been touched at all, nor has Iqbal tried to explain its deeper meaning as a spiritual purification (that would have been, in his view, probably too close to the customary interpretations of the ascetics)."34

اسی طرح شمل، اقبالؔ کے تانیثی خیالات کی بابت خاصی جِز بِز ہیں کہ ان کے ہاں آزادیٔ نسواں کے متخالف فکری عناصر موجود ہیں؛ اور شمل جو خود ایک جوکھم سے گزر کر اپنی علمی حیثیت منوانے میں کامیاب ہوئیں، انھیں اقبالؔ کے تانیثی خیالات از کار رفتہ محسوس ہوئے۔ غرض لندن میں حقِ رائے دہی کی آواز اٹھانے والی عورت ہو یا وفاقی مجلسِ قانون میں عورتوں کی مخصوص نشستوں کا معاملہ، ہر دو صورتوں میں شمل معترض ہیں۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ

روشِ مغربی ہے مدّ نظر وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ

یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین؟ پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

(اقبال۔ کلیاتِ اقبال، اردو۔ ص ۲۸۳)

تاہم شمل کا یہ پیش کردہ اقتباس کہ جس سے وہ اقبالؔ کی تانیثیت بیزاری نمایاں کر رہی ہیں اس کا سیاسی پس منظر کچھ اور ہے:

"This negative attitude towards the growing activity of women outside their homes continues throughout Iqbal's life. In a statement on the constitution in 1933, he notes that

The allocation of 9 seats to women as a 'special interest' is another undesirable feature of the Federal Legislature. The electorate for these seats will be predominantly non-Muslim and it will be impossible for Muslim women to be elected. Muslim women ought to have been considered part of their community (SS191).

This was at a time when leading Indian Muslim ladies like Begum Shahnawaz, Begum Abdul Qadir and others were already actively working in the political field."35

اس اقتباس سے یہ اخذ کرنا درست نہیں کہ اقبالؔ خواتین کی عملی سیاست سے خائف تھے یا وہ اس کے حق میں نہ تھے ۔ اقبالؔ اپنے بیان کے مطابق مسلم خواتین پر یہ واضح کر رہے ہیں کہ خواتین کی مخصوص نو(۹) نشستوں سے انھیں کچھ حاصل نہ ہو گا یعنی مسلم خواتین کا ان نشستوں پر کامیاب ہونا ممکن ہی نہیں اور اس کی بڑی وجہ مجلس رائے دہندگان (Electoral College) کا بہ کثرت غیر مسلم ہونا ہے۔ اب معلوم نہیں کہ شمل نے کیوں کر اس پیرائے سے وہ معنی لیے جو اس کا مقصود ہی نہیں۔

شریف الحسن صاحب بھی اس ضمن میں راقم کے مؤید ہیں۔ مزید براں انھوں نے Gabriel's Wing میں موجود بعض تسامحات کی بہتر انداز میں نشاندہی کی:

"To come to minor point, Dr. Schimmel has omitted to indicate the source of her statement that Iqbal had advocated continuance of British Rule over the Indians until such time as they were mature enough for Independence......Incidentally, the poem Sham'-o Shair is neither in the form nor the meter of Rumi's Mathnawi.....Her belief that Shah Waliy Allah came under the Wahhabi influence while in Arabia... or that Sayyid Ahmad Barelwi ' maintained a kind of pantheism'....seems to be highly improbable. The assertion of a leading Turkish mystic as to the existence of a third type of mysticism, the soi-disant

‘ Turkish mysticism’-as distinct from and even superior to Wahdat al-Wujud or Wahdat al-Shuhud- is more confused and confounded than profound and original.”36

شمل نے افکارِ اقبالؔ کے تفسیری ابعاد پھیلاتے ہوئے ابلیس، مساوات، وقت، حیات و ممات اور صوفیا کرام کے جملہ اثرات کی نشاندہی میں دقّت نظری کا ثبوت دیا۔ ایک بسیط بیانیے سے ان کی شناسائی جہاں انھیں درست تجزیے کا موقع فراہم کرتی ہے وہیں تقابلی مطالعات کو بھی وہ مہارت سے برتنے پر مستعد ہیں۔ اقبالؔ کا تصورِ ابلیس جو تحرک اور عمل کی صورت میں گویا ہے۔

؎میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح　　　تو فقط اللہ ھو، اللہ ھو، اللہ ھو!

(اقبالؔ۔ کلیاتِ اقبال(اردو)۔ اسلام آباد: الحمراء پبلشنگ، جولائی ۲۰۰۴ء ص ۶۰۰)

اور جس کا مکالمہ تکوینی معاملات میں ہر طرح سے دخیل ہے اِسے شمل جب مبحث کا حصہ بناتی ہیں تو گفتگو بڑھ کر گوئٹے کے فاؤسٹ کو جالیتی ہے۔ پیامِ مشرق جو گوئٹے کے دیوانِ مغرب کا ایک عاجزانہ جواب ہے، اقبالؔ پر گوئٹے کے اثرات کا خوبصورت مرقع بھی ہے۔ اقبالؔ، گوئٹے کو ہمیشہ آئیڈ لائز کرتے رہے؛ اور اس کا ایک اہم سبب المانوی شاعر کی اسلام پسندی اور مشرقی روحانیت سے وابستگی تھی، یعنی ایک حد تک دونوں عظیم شخصیات کے شعری و علمی اہداف یکسانیت رکھتے تھے:

“Goethe, he has gratefully admitted, has led him into the inside of things. Perhaps Goethean thought and poetry has influenced him more lastingly than Hegelian or Bergsonian philosophy, and he felt in the German poet a kindred soul, only, as he writes, of a much larger spiritual breadth. Iqbal was more of Prophetic spirit, Goethe more of a poet, but both went in the same direction, working in the hope of winning that immortality which is the privileged of fully developed personalities.....”37

جرمن قوم کا اپنے عظیم دانشوروں اور شعراء کی قدردانی پر اقبالؔ کو ہمیشہ رشک رہا۔ وہ سمجھتے تھے کہ گوئٹے کا مکالمہ ایک زندہ قوم سے ہے جبکہ انھیں اپنے ارد گرد بے حسی اور مایوسی نظر آئی؛ یہی سبب کہ ان کا شعری بیانیہ ہر زاویہ سے عمل، تحرک، حریت اور خود شناسی سے متعلق رہا اور یہ وہ صفات تھیں جنھیں وہ اپنی قوم اور ہندوستانی لوگوں میں مفقود دیکھ رہے تھے۔ وہ ان اوصاف سے خاص طور پر ملتِ اسلامیہ کو متصف دیکھنا چاہتے تھے، اور ان کا حصول، بے پناہ جذبے، ہمت اور اہلیت کے بغیر ممکن نہ تھا۔ چنانچہ عشق جو انسانی اہلیت اور جذبے کو ایک بڑی اٹھان دیتا ہے ان کے بیانیے کا مرکزہ بن جاتا ہے۔ اپنے شعری مقصد کو اقبالؔ بروئے کار لانا چاہتے تھے۔ وہ گوئٹے کی مانند قوم میں ایک روحانی ترفع پیدا کرنا چاہتے تھے، اسی لیے ان کی شعری داستان کا ایک مرکزی کردار ابلیس بھی المانوی اثرات لیے ہوئے ہے اور یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ فاؤسٹ پہلی بار گوئٹے کے ہاں فعال نہیں ہے بلکہ مغربی لٹریچر، فلم، تھیٹر، موسیقی اور آرٹ میں یہ کردار متعدد نسبتوں سے مذکور ہے۔یعنی اس کردار کی کوئی ایک کہانی نہیں۔ اپنے نفس کے عوض دنیاوی جاہ ومال اور علم کا سودا کرنے والا 'فاؤسٹ 'شیطنیت کے چنگل میں پھنس کر نامراد رہتا ہے اور یہ اسطورہ دنیائے مغرب میں مقبول رہا۔ گوئٹے کے علاوہ کرسٹوفر مارلو(The Tragical History of Dr. Faustus)کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ کلامِ اقبالؔ میں اس کردار کی اہمیت شمل کچھ یوں مشخص کرتی ہیں:

"More than anything else the Faust impressed him, and traces of this spiritual encounter can be found in the beginning of the Javidname, its Proem in Heaven and Proem on Earth, and the Angelic chorus."38

"The image of Faust and Mephisto looms large in Iqbal's work, and is reflected in his ideal of the perfected man who has grown, thanks to his constant struggle with the lower potencies."39

جرمن فلاسفر، شعراء اور دیگر اہم شخصیات جو اقبالؔ پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہیں ان میں کانٹ، ہیگل، مارکس، ہائنے، نطشے اور آئن اسٹائن کے نام بہ سہولت لیے جا سکتے ہیں البتہ جس جرمن شخصیت کے وہ عمر بھر معتقد رہے وہ

گوئٹے کے سوا اور کوئی نہیں۔ شمل نے اپنے ایک اہم مضمون "IQBAL AND GOETHE" میں چند اہم فکری نکات پیش کیے اور بہ سند یہ ثابت کیا کہ اقبالؔ متعدد حوالوں سے اپنے ممدوح گوئٹے کے احسان مند تھے۔ اس اہم مضمون میں جہاں بہ زبانِ اقبالؔ، گوئٹے کی اہمیت نمایاں کی گئی ہے وہیں دونوں عظیم شخصیات میں موجود فکری مماثلت کے جوہر بھی مرتب کیے گئے۔ یہ مضمون اس لیے بھی اہم ہے کہ اس سے اقبالؔ کے ممدوح کا نظریہ تمدّن احسن انداز پر سامنے آیا:

"Goethe has indeed claimed in the West-Oestlicher Divan, that a person who could not take into account 3000 years of human history was bound to remain in the darkness, living from day to day without recognizing the great fabric of human thought and activity."40

اسی مقالے میں شمل نے یہ بتایا کہ کس طرح اقبالؔ جرمن ادب میں مشرقی افکار کے جویا رہے اور متعدد اہم و غیر اہم شعراء اور ناقدینِ فن کے خیالات سے شناسا ہوتے ہوئے گوئٹے کو اپنا مربی و محسن مان کر ان کے دیوانِ مشرق و مغرب کے جواب میں 'پیامِ مشرق' کو پیش کیا۔ یہاں اقبالؔ کی جانب سے بعض غیر معروف شعراء بھی مذکور ہوئے مثلاً بوڈی سٹیڈ (Bodenstedt) جو مرزا شفیع کے قلمی نام سے نظمیں لکھتے تھے اور رکرٹ (Ruckert) ایسی شخصیت کو نظر انداز کیا۔[۴۱] شمل نے اس امر کی بھی وضاحت کی کہ گوئٹے کو مشرق میں متعارف کرانے میں ایک اہم کردار 'ہرڈر' کا رہا جس کے جذب و شوق کو دیکھ کر شلیگل نے اسے ایک نیا کٹر موحد کہہ ڈالا۔

گوئٹے سے اقبالؔ کی انسیت کی ایک اہم وجہ اُس کا اسلام دوست ہونا تھا۔ وہ اس دین اور اس سے وابستہ اہم شخصیات کا تہہِ دل سے احترام کرتا تھا اور اپنے شعری افکار میں ابتدائی مسلم ہستیوں کی بابت گفتگو کرتا رہا۔ قرآنی تعلیمات سے نہ صرف خود مستفید ہوا بلکہ اسے دوسروں کے لیے بھی موجبِ افادہ قرار دیا:

"In 1772 the first German translation of the Quran by J.F.Megerlein appeared, and Goethe, who had studied Sale's famous English translation, used this and other translations in European languages for inspiration......the second poem is even more important; it was conceived as a dialogue between Ali and Fatima and only later modelled into a poem called Mahomets Gesang. Iqbal was deeply impressed by this hymn in which the Prophetic activity is symbolized as a stream which, beginning from a small source, develops carrying with it all the rivulets, brooks and rivers and ask his, the brother's help, until he brings them back to the father, the divine ocean."42

اس اقتباس سے اقبالؔ کا اپنے لیے 'زندہ رود' کی ترکیب کے استعمال کا سبب معلوم ہوتا ہے؛ یعنی یہ بھی ایک نوع کی گوئٹے کی اثر پذیری تھی جو مستقلاً کلامِ اقبالؔ اور بالخصوص 'جاوید نامہ' میں مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔ شمل، اقبالؔ اور گوئٹے کے ہاں موجود مشترک فکری مماثلتوں کی صراحت میں تیمور لنگ، حلاجؒ اور مولانا روم کو شامل کرتی ہیں؛ یہ وہ اہم شخصیات ہیں جو اقبالؔ کے فن پر گہرے نقوش چھوڑ چکی ہیں۔ تیمور لنگ اپنی فطری صلاحیتوں کی تکمیل میں کامیاب رہا اس لیے گوئٹے کے ہاں اس کی پذیرائی ہوئی اور یہی کچھ اقبالؔ کے ہاں بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ وہ بھی انسان کی جملہ صلاحیتوں کی ممکنہ تکمیل کا خواہاں ہے اب وہ تیمور لنگ ہو یا ٹیپو سلطان ہر وہ خود شناس اقبالؔ کا ہیرو ہے جو اپنے جوہر کی قدر جانے اور اپنی اہلیت ثابت کرے۔

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول　　　لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز　　　ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول!

(اقبال۔ کلیاتِ اقبال، اردو۔ لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ص ۵۳۴،۵۳۵)

قُوائے انسانی کا منطقی اتمام گوئٹے اور اقبالؔ کے وہ فکری دوائر ہیں جو باہم ٹکراتے بھی ہیں اور ایک دوسرے میں ضم بھی ہیں؛ اور یہی وہ تکمیلِ بشری ہے جو بعد از موت، حیاتِ نو سے مشروط ہے جو فکرِ اقبالؔ کی ایک انتہائی پیچیدہ صورتحال ہے جس پر شمل نے کم گفتگو کی۔

گوئٹے، اقبالؔ کی مانند حلاجؒ کے متعقد تھے۔ وہ ان کی کتاب 'کتاب الطواسین' میں موجود شمع وپروانہ کی علامتی حیثیت سے بغوبی آگاہ تھے۔ اسی لیے بقول شمل ان کے کلام میں .Stirb und werde, 'Die and become'؎۴۳ ایسے روحانی وسرّی تلازمات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اور پھر یہی رمزِ شوق اقبالؔ کے ہاں اسرارِ خودی سے ارمغانِ حجاز تک متحرک وفعال ہے یعنی ایک ارفع وبرتر منہاج کے لیے جذب وشوق، طے شدہ ضابطہ ہے؛ اور اس میں زندگی، اندیشۂ سودوزیاں سے باہر نکل کر سرگرم ہوتی ہے۔ حلاجؒ کا یہ وارفتگیٔ شوق، اقبالؔ کو ان کے نزدیک لے آتا ہے اور وہ جاوید نامہ میں فلکِ مشتری پر متعدد بار ان سے ہم کلام ہوتے ہیں:

"The image, however, reached him through the poets of the East who has lovingly elaborated the story of the moth and the candle as it was found, for the first time, in Hallaj's Kitab at-tawasin. Iqbal, too, knows the secret of sacrificing the lower potencies in order to achieve a higher level of life; and his philosophy dwells upon the same Hallajian idea, which had found its finest expression in the poetry of Maulana Rumi. Iqbal was a great admirer of Hallaj."44

شمل نے اپنے ایک جدا مضمون "منصور حلاج۔ اقبالؔ کی نظر میں" میں بڑی صراحت سے افکارِ اقبالؔ کا جائزہ پیش کیا۔ اقبالؔ کے نزدیک یہ شیخ محی الدین ابنِ عربیؒ تھے جن کے خیالات کا فکرِ حلاج میں ادخام ہوا اور تعبیری صورت مختلف ہوگئی؛ یعنی حلاجؒ کا متصوفانہ ایقان وہ نہ تھا جس کی تشریح محی الدین ابنِ عربیؒ نے کی، اور یوں باقاعدہ وحدت الوجودی فلسفہ کی بنیاد رکھ دی گئی۔؎۴۵ شمل نے اس اہم مضمون میں حلاجؒ کے شارح روزبہان باقلی کے وسیلہ سے متعدد اہم فکری گوشوں کی نشاندہی کی ہے اور اقبالؔ کا حلاجؒ سے فیض اٹھانے کی بابت کچھ یوں کہا:

"اقبالؔ نے بھی فلکِ مشتری پر حلاج کو ایک ایسی روح قرار دیا ہے جو طیور کی طرح ہمیشہ بر سرِ پرواز رہتی ہے۔ یہ حلاج کے شارح روز بہان باقلی کے اس نہایت دلپذیر مقولے کی طرف تلمیح ہے جس میں اس نے اپنے مرشد کو "شاہِ طائرانِ عشق" قرار دیا ہے۔ اور یہ خیال کہ ملائکہ بلکہ حق تعالیٰ بھی ذوق و شوق و آرزو کا شکار ہے، اقبالؔ کی شاعری میں بار بار دکھائی دیتا ہے۔"[۴۶]

گوئٹے، نطشے اور منصور حلاجؒ کے علاوہ جو انتہائی اہم شخصیت فکرِ اقبالؔ پر گہرے نقوش مرتّب کرتی ہے وہ مولانا رومؒ ہیں۔ شمل نے اپنی تحریروں میں جہاں اس عظیم روحانی شخصیت سے اپنی والہانہ وابستگی کا اظہار جا بجا کیا وہیں اقبالؔ کے جملہ تصورات پر ثبت ہونے والے ہونے اثرات کی بھی بہتر انداز پر گرہ کشائی کی ہے۔ اس ضمن میں خاص طور سے اقبالؔ کا تصورِ عشق مرکز نگاہ بنتا ہے جو سراسر مولانا کے وسیلہ سے اقبالؔ کے ہاں ایک جاندار بیانیے کی صورت مخاطب ہے؛ اور یہ قریباً اقبالؔ کے تمام شعری مجموعوں میں ایک بڑی گونج لیے ہوئے ہے۔ یہ مشرق کی ایک ایسی مقتدر ہستی ہے جو مغرب میں بھی کم از کم دو صدیوں سے مقبول ہے اور ان کی مثنوی کے جرمن تراجم انیسویں صدی سے بہ ذوق و شوق دیکھے جا رہے ہیں۔ شمل کی ان سے گہری والہانہ وابستگی اور انسیت کا ایک پرتو اِن کی آپ بیتی Orient and Occident- My life in East and West میں دیکھا جا سکتا ہے اور شمل کا اقبالؔ سے ذہنی قربت کا ایک بنیادی سبب مولانا رومؔ ہیں۔ اقبالؔ اپنے پیر و مرشد مولانا رومؒ سے جو تعلقِ خاص رکھتے ہیں اس پر بہت سا تحقیقی کام ہو چکا ہے اور کلامِ اقبالؔ میں ان سے دل جوئی اور راہنمائی کے جو پیرائے موجود ہیں ان کا از سرِ نو اعادہ تضیعِ اوقات ہے۔ البتہ ان کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ 'جاوید نامہ' میں مولانا رومؒ کی معیت ہی میں سیر افلاک ہوئی اور راہنمائی کے مختلف مراحل ان کے وسیلہ و فیضان سے طے ہوئے۔ منصور حلاجؒ کی بابت گفتگو کرتے ہوئے شمل نے مولانا رومؔ کے کلماتِ 'انا لحق' کی توضیح میں ایک دلچسپ عبارت رقم کی:

"مناسب وقت پر 'میں' کہنا مہر کا باعث ہے اور نامناسب وقت پر قہر کا باعث۔ منصور کی 'میں' مہر بن گئی اور فرعون کی 'میں' قہر۔"[۴۷]

مولانا رومؒ اور ان کے مرشد شاہ شمسِ تبریزؒ سے اقبالؒ کے علمی و روحانی تعلق کی صراحت میں شمل کا یہ بیان اہمیت کا حامل ہے:

"After 1911, Iqbal starts to reveal Maulana Rumi no longer as an exponent of all-embracing pantheism but as the advocate of spiritual development, of love between man and a personal God, and of an infinite quest for God: ideas which are found indeed-among many others-in the Mathnawi, and perhaps even more distinctly in the Diwan-i-Shams-i Tabriz which Iqbal probably studied in Nicholson's fine selection."48

یہ مولانا سے اقبالؒ کی بے حد انسیت ہی کا ایک علامتی اظہار ہے کہ قونیہ (ترکی) میں مزارِ رومی کے باہر اقبالؒ کی مرقد موجود ہے اور کچھ اسی نوع کا علامتی اظہار شمل کے حوالے سے بھی عمل میں آیا اور ٹھٹھہ کے ماکلی قبرستان میں، جہاں شمل نے دفن ہونے کی خواہش کی تھی، ایک قبر شمل کے لیے بنائی گئی جبکہ ان کا مدفن بون (BONN) میں ہے۔

صوفی شخصیات جو فکرِ اقبالؒ کو متعدد حوالوں سے انگیخت کرتی رہیں ان میں ایک اہم نام شیخ محی الدین ابن عربیؒ کا ہے۔ شمل کے نزدیک شیخ، وحدت الوجودی بیانیہ مرتب کرنے والے اولیں بزرگ ہیں۔ اس فلسفۂ تصوف کی بابت ایک اہم اور بڑا نام منصور حلاجؒ کا بھی شامل کیا جاتا ہے تاہم شمل کا تفحص یہ ہے کہ ابتدائی صوفی عہد میں وحدت الوجودی افکار اس طرح سے موجود نہ تھے جو بعد میں ابنِ عربیؒ کی تشریحات و توضیحات کے نتیجہ میں متشکل ہوئے؛ یعنی یہ سرّی، فکری ضابطہ ابنِ عربی کے وسیلہ سے متعارف ہوا، اور ہندوستان میں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس کا ایک اہم سبب اس خطے کی وہ روحانی ویدانت فضا تھی جو صدیوں سے اس وجودی فلسفے کی مؤید تھی، چنانچہ جب اس کا تعارف ہندوستان سے ہوا تو اس کے پھلنے پھولنے میں کوئی بڑی رکاوٹ سامنے نہ آئی اور بہت بعد میں شیخِ سرہند، مجدّدِ الف ثانی (متوفی: ۱۶۲۴ء) نے اس فکر کے سامنے پشتہ کھڑا کیا اور اس کے مقابل وحدت الشہودی فلسفہ پیش کیا یعنی

وہ اس روحانی تحریک کے 'قائمِ اوّل' تھے اور بخارا کے شیخ بہاء الدین نقشبند (متوفی: ۱۳۸۹ء) کے سلسلہ کو آگے بڑھایا۔

اقبالؔ بچپن ہی سے شیخ محی الدین ابن عربیؒ کی شخصیت اور افکار سے آشنا تھے۔ اس ضمن میں گھر پر باقاعدہ دروس کی نشست ہوتی تھی اور اس کا سبب یہ تھا کہ اقبالؔ کے والد شیخ نور محمد، ابنِ عربی کے بے حد معتقد تھے اور وحدت الوجودی ایقان رکھتے تھے۔ ان کی بابت یہ کہا جاتا ہے کہ وہ قادریہ سلسلہ کے ایک اہم بزرگ سلطان العارفین حضرت قاضی سلطان محمود دربار آوان شریف سے فیض اٹھائے ہوئے تھے اور ان کے مرید تھے جبکہ اقبالؔ نے بھی سلسلہ قادریہ میں بیعت کی۔ ۴۹

اقبالؔ اس سلسلہ کے جملہ خصائص کی ایک جامع تصویر سامنے رکھے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر جاوید اقبالؔ نے گھر کے داخلی ماحول اور اس سلسلۂ ارادت کی بابت یہ معلومات بوسیلۂ اقبالؔ کچھ یوں پہنچائی ہیں۔

"شیخ اکبر محی الدین ابنِ عربی رحمتہ اللہ علیہ کی نسبت کوئی بدظنی نہیں۔۔۔۔ میرے والد کو فتوحات اور فصوص سے کمال توغل رہا ہے اور چار برس کی عمر سے میرے کانوں میں ان کا نام اور ان کی تعلیم پڑنی شروع ہوئی۔ برسوں تک ان دونوں کتابوں کا درس ہمارے گھر میں رہا۔ گو بچپن کے دنوں میں مجھے ان مسائل کی سمجھ نہ تھی۔ تاہم محفلِ درس میں ہر روز شریک ہوتا۔ بعد میں جب عربی سیکھی تو کچھ کچھ خود بھی پڑھنے لگا اور جوں جوں علم اور تجربہ بڑھتا گیا، میرا شوق اور واقفیت زیادہ ہوتی گئی۔" ۵۰

مذکورہ اقتباس ۲۴ فروری ۱۹۱۶ء میں لکھے گئے ایک خط سے مرقوم ہے جو اس عہد کی ایک اہم صوفی شخصیت شاہ سلیمان پھلواروی کو لکھا گیا اور یہ امر باعثِ حیرت ہے کہ اسرارِ خودی کا سنِ تصنیف ۱۹۱۵ء ہے اور اس کے دیباچہ میں اقبالؔ کا شیخ محی الدین ابنِ عربیؒ کی بابت بیان قدرے جدا معنیٰ لیے ہوئے ہے جو ایک طرح سے محولا بالا اقتباس کا نقیض ہے، اور پھر شمل کا کہنا کہ اقبالؔ کے جملہ خیالات میں ۱۹۱۵ء کے بعد کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی، مزید حیرانیوں کو مستوجب ہے۔ کیا اقبالؔ کے ہاں صوفیا کی بابت خیالات میں بتدریج تبدیلی آئی جیسا کہ منصور حلاجؒ کے حوالہ سے

دیکھا جا سکتا ہے کہ اوّل وہ منصورؒ کے بارے میں، دلپذیر نقطۂ نظر نہ رکھتے تھے لیکن بعد میں ایسی کایا کلپ ہوئی کہ منصور ہی ان کی پسندیدہ شخصیات میں سے ایک بن گئے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ وجودی فلسفہ کے جملہ اثرات سے وہ متفق نہ تھے اور ان کا فلسفہ خودی، تعینِ ذات کا مؤید ہے اور اس پر جملہ مشرقی و مغربی آثار کی بابت راقم اختصار سے گفتگو کر چکا ہے۔ اسرارِ خودی کے دیباچہ میں جہاں اقبالؔ کی وسیع المشربی قاری سے مکالمہ کرتی ہے وہیں ان کا وحدت الوجود کے حوالہ سے نقطۂ نظر مکمل صراحت کے مع موجود ہے۔ جسے پڑھنے پر احساس ہوتا ہے کہ اقبالؔ اس فلسفۂ وصال کے بے جا، ناقد نہ تھے بلکہ وہ قوم کی بے حسی، اضمحلال اور درماندگی کے اسباب ان صوفیانہ رویوں میں دیکھ رہے تھے جس سے قوم عالمِ سُکر میں تھی۔

اقبالؔ چونکہ اس سلسلہ کے جملہ افادات سے خود کو ہم آہنگ نہ کر سکے اس لیے وہ چاہتے تھے کہ اس خطۂ ہندوستان کے لوگ اس اعتقادی تصور سے علمی و عملی طور پر باہر آئیں اور نفیٔ ذات سے اجتناب برتتے ہوئے اپنے آپ کو پہچانیں، اپنی خودی کی تعمیر کریں اور واصل بالحق ہونے کی بجائے ذاتِ برحق کے سامنے بہ حیثیت اور بہ رشتہ مخلوق کے کھڑے ہوں اور اس کا بنیادی سبب وہ منفعل اور غیر متحرک ذہنی رویہ تھا جس سے انھیں شدید کدّ تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے اسلاف کا طرزِ عمل دیکھ کر ایک متحرک اور عملی زندگی گزاریں۔ اقوامِ عالم میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوائیں۔ ہاتھ ہاتھ پر دھرے ایک غیر فعال اور پہلے سے طے شدہ مقسوم پر یقین نہ رکھیں اور بے عملی کی زندگی سے ہاتھ اٹھالیں۔ وہ مسلم قوم میں حمیت، غیرت، حریت اور اہلیت دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی مجموعی گفتگو انہی حرکی تصورات سے عبارت ہے۔ وہ مسلسل مسلمانوں کو از سرِ نو، جی اٹھنے کی عملی ترغیب دیتے رہے۔

؎ یہ گھڑی محشر کی ہے، تو عرصہ محشر میں ہے!   پیش کر غافل، عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!

(اقبال۔ کلیاتِ اقبال، اردو۔ شیخ غلام علی۔۔۔ ۲۶۰)

Gabriel's Wing میں شمل نے اقبالؔ کے ہاں مساوات، انسانی مقدر اور نصیب ایسے موضوعات پر بات کرتے ہوئے ایک انتہائی حساس معاملے حیات بعد از موت کو شاملِ گفتگو کیا۔ یہ وہ پیچیدہ و گنجلک فکری منطقہ ہے جو ایک

جدا مقالے کو مقتضی ہے تاہم یہاں اختصار سے گفتگو کرتے ہوئے ہم شمل کے تفہیمی مندرجات کو پیشِ نظر رکھیں گے اور یہ جاننے کی کوشش ہوگی کہ اس امر پر ان کا تفحص قاری سے کس نوع کا مکالمہ کرتا ہے۔

شمل حیات بعد از موت کو اِک بسیط خواہش، آرزو اور عشق سے مملو دکھاتی ہیں۔ اس ضمن میں اقبالؒ اور گوئٹے ہم آواز معلوم ہوتے ہیں۔ وہ متعدد زاویوں اور اسناد سے اقبالؒ کے اس منفرد فکری جغرافیے کو ماپتی ہیں اور تقابلی مطالعہ میں بعض اہم شخصیات شامل کرتی ہیں۔ کتاب کے صفحہ ۲۷۵ کے فٹ نوٹ میں امام غزالیؒ کے حوالہ سے عشق اور موت کی تصریح کچھ یوں کرتی ہیں:

"Ghazzali, Ihya, last chapter....about death, and the significant story of Abraham and the angel of death: Abraham asked the angel: Have you ever seen that the beloved kills his lover? Whereupon God revealed to him: Have you ever seen a lover who would refrain of coming in the presence of his beloved? And Abraham said to the angel: Now take my soul away!–a story reflects the different attitudes of the faithful towards the problem of death."51

اقبالؒ کا مسلم عقیدہ سے کچھ ہٹ کر یہ فہم، شمل کے نزدیک اک احساسِ نَو لیے ہوئے ہے جو خالصتاً فلسفیانہ رنگ میں پیش ہوا:

"Personal immorality is, according to Iqbal,

Only an aspiration; you can have it if you make an effort to achieve it,

Or, as he puts it many years later in his memorial article on Mc Taggart's philosophy(SS 151): immorality is only a hope, an inspiration, a duty, but not an eternal fact."52

انسانی مقدر اور نصیب کی بابت گفتگو کرتے ہوئے شمل ، فکرِ اقبالؔ کی توضیح میں مسلم الٰہیات کو سامنے رکھتی ہیں اور گلشنِ رازِ جدید کا حوالہ دیتے ہوئے نبی اکرم ﷺ کی حدیثِ مبارکہ کی روشنی میں یہ نمایاں کرتی ہیں کہ اقبالؔ کی نظر میں خودی جزوی مختار اور پابند ہے؛ اور ان افکار کی صراحت اسرارِ خودی میں ہے۔۵۳

شمل، اقبالؔ کے تصورِ وقت پر بہت سی اہم معلومات بہم پہنچاتی ہیں۔ اس ضمن میں قرآن و حدیث، علم الکلام، فلسفہ اور جدید سائنسی معلومات سے اخذ و استنباط کی مختلف صورتیں موجود ہیں۔ اقبالؔ کے ہاں تصورِ زمان و مکاں ایک بھرپور پیراڈائیم کی صورت مشخص ہوتا ہے۔ یہ اقبالؔ کا پسندیدہ موضوع رہا جو بہت سے اہم فکری مباحث کو جنم دیتا ہے کیونکہ یہ صرف ان کے لیے ایک علمی مشغلہ نہ تھا بلکہ یہ ایک ایسی فکری تشکیل ہے جس کے وسیلہ سے انسانی نصیب، خدا اور انسان کے باہمی تعلق اور انسان کی کائنات میں حیثیت کا امکانی تعین ہو سکتا ہے؛ اور پھر اس سے خود ذاتِ برحق کے اثبات کا جواز پیدا ہوتا ہے اور ایک 'زندہ اور متعلق' مسلم خدا کا تصور پنپتا ہے۔ کائنات کے جملہ رموز اور ان کی توسیع تک کے معاملات اس تصورِ زمان و مکاں سے جڑے ہوئے ہیں؛ یہاں انسانی نصیب، اختیار اور بے اختیاری سے فروغ پاتا ہے اور وقت کی دو متوازی صورتیں نظر آتی ہیں۔ ایک وقت کا تواتر سے آگے بڑھتا مادی (ATOMIC) سلسلہ ہے ، جسے اشاعرہ نے علم الکلام کا موضوع بنایا اور قدیم یونانی اثرات سے محفوظ رکھا اور دوسرے وقت کی وہ صورت جو ماضی، حال اور مستقبل سے ماوراء ہے اور جس کو ماپنا فہمِ انسانی سے بالا ہے اور اس حوالہ سے پیش کردہ حوالہ جات بکثرت موجود ہیں۔

ایک زندہ اور متعلق خدا کا تصور اقبالؔ شد و مد سے پیش کرتے ہیں اور اس کا بنیادی سبب فلسفہ اور مغربی لسانیات کی خدا سے وہ مغائرت تھی جو کبھی بائبل کی زبان بارے شبہات پیدا کر رہی تھی تو کبھی سرے سے ہی جنابِ عیسیٰؑ کے وجود کی ناقد تھی اور پھر خدا کے مر جانے کی بابت بھی ایک معروضی تصور پیش کیا گیا۔ اِسے خاص طور سے رینان اور نطشے کے پیش کردہ افکار کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے، اور پہلی جنگِ عظیم کے بعد تو صورتحال کچھ اور پیچیدہ

ہو گئی۔ اقبالؔ نے جہاں انسانی تحرک کا فلسفہ پیش کیا وہیں کائنات کا بھی ایک حرکی نظریہ پیش کیا، گو کہ آئن سٹائن اور دیگر ماہرینِ طبیعیات بھی، اپنی پیش کردہ دریافت میں ایک بڑھتی، پھیلتی کائنات کا تصور پیش کر رہے تھے۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید

کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں!

(اقبال۔ کلیاتِ اقبال، اردو۔ ۳۲۰)

یعنی عقیدہ کے اعتبار سے ایک طرف حقیقتِ مطلق صرف لفظ 'کن' کہہ کر تکوینی امور لمحہ بھر میں سرانجام دیتی ہے اور دوسری جانب وقت کا مرتب (SERIAL) سلسلہ ہے جو آسمان اور زمین کی تخلیق میں چند روزہ کاہش دکھاتا ہے اور پھر ان دونوں اوقات میں موجود تفاوت بھی ایک جدا مبحث لیے ہوئے ہے کہ تواتر سے بڑھتا ہوا وقت اور ایک ہمہ گیر ماضی و حال سے ماوراءوقت دونوں کے وقوف جدا ہیں:

"That means: serial time, as we are used to, comes into existence only by the very act of creation, and so Iqbal can interpret logically the two contrasting statements on creation in the Quran: in Sura 54/50 that creation was finished as quickly as the twinkling of an eye-which will hint at the creation in Divine time which cannot be measured, and in Sura 25/60 that creation took place in six days-which will say: the appearance of things in serial time."54

اقبالؔ کے ہاں ان دو متوازی اوقات کے مباحث کا بنیادی مقصد کائنات کے وجود کی الٰہیاتی تشکیل تھی جو خاص طور سے ان کے خطبات میں اپنا فہم پیش کرتی ہے۔ اس حرکی تصور کے ساتھ خالقِ کائنات کا حرکی تصور بھی ناگزیر تھا اور ایسے میں جملہ اسناد جہاں اُس عہد کی جدید طبیعیات میں موجود تھی وہیں بہت کچھ اقبالؔ کو قرآن و سنت کے مطالعہ

سے حاصل ہوا، اور سورہ رحمٰن کی آیت کا ایک حصہ اقبالؒ کے جملہ افکار کو تقویت پہنچانے میں حد درجہ معاون ہوا، جس میں ذاتِ برحق ہر روز ایک نئی شان سے جلوہ افروز ہوتی ہے:

کُلّ یَوم ھُوَ فِی شَان۔ آیت ۲۹

یعنی خدا کا ایک مکمل حرکی تصور جو اپنی تخلیق یعنی انسان سے ایک بھرپور تعلق قائم کیے ہوئے ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک یہ تعلق من حیث القوم معروضی سطح پر اپنا تفاعل پیش کرتا ہے لیکن فرد کی سطح پر یہ تعلق انفرادی بھی ہے اور موضوعی بھی:

فطرت افراد سے اِغماض بھی کر لیتی ہے کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

(اقبالؒ۔ کلیاتِ اقبال (اردو)۔ اسلام آباد: الحمراء پبلشنگ، ۷۲۳)

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

(اقبالؒ۔ کلیاتِ اقبال (اردو)۔ اسلام آباد: الحمراء پبلشنگ، ۶۱۴)

اقبالؒ کے تصورِ وقت پر برگسان کے اثرات بلکہ ان کے تصورِ خودی پر بھی Time and Free will کے جملہ افکار کی کارفرمائی دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ برگساں کا پی۔ ایچ۔ ڈی مقالہ تھا اور جو ۱۸۸۹ء میں شائع ہوا۔ اس میں یہ خیال پیش کیا گیا کہ وقت، علمِ ریاضی اور سائنس کی گرفت سے باہر کی شے ہے یعنی جو تخمینہ وقت ماپنے کا لگایا جاتا ہے وہ محدود اور غیر متحرک وقت سے متعلق ہے جبکہ وقت ہمیشہ متحرک رہتا ہے۔ اسی طرح انھوں نے ایمائیل کانٹ کے اس مفروضے کی نفی کی کہ آزاد منشاء زمان و مکان سے باہر نکل کر ہی اپنا تفاعل پیش کر سکتی ہے۔ غرض ہنری برگساں سے اخذ و استنباط کے معاملہ پر گفتگو کے اور بہت سے پہلو موجود ہیں البتہ جب اقبالؒ ان سے ملنے پیرس گئے تو تصورِ وقت

پر بات کرتے ہوئے اِسے جب حقیقتِ مطلق سے مشابہہ قرار دیا تو برگساں اِس خیال پر ششدر رہ گئے۔ اقبالؔ کے پیشِ نظر قرآن و سنت کے وہ معنی خیز پیرائے تھے جن کی معاونت سے وہ پیچیدہ اور لاینحل مسائل کو گرفت میں لانے کی سعی کرتے رہے۔ یہ حدیثِ مبارکہ جو "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا زمانے کو برا بھلا نہ کہو کیونکہ اللہ ہی زمانہ ہے۔"۵۵ مذکورہ گفتگو کا مصدر بنی۔

غرض اقبالؔ کے ہاں وقت کی تفہیم ایک مستقل موضوع رہی۔ میر داماد محمد باقر ہوں یا آئن سٹائن یا پھر معروف یہودی عالم موسی بن میمون ہوں ان سب سے اقبالؔ کی فکری منفعت کئی زاویوں سے مشخص ہوتی ہے۔ شمل نے ایسی متعدد شخصیات کا حوالہ دیا جو اس موضوع پر اقبالؔ کی معاون ہوئیں اور خود اقبالؔ نے ان کا تذکرہ احترام سے کیا۔ مثلاً آئن سٹائن کی بابت یہ کہا کہ وہ یہودی نسل کے زرتشت تھے اور ان کی تھیوری آف ریلی ایٹی وٹی (Theory of relativity) سے جب وقت کو چوتھی جہت قرار دیا گیا تو اقبالؔ بہت محظوظ ہوئے اور ان کا یہ ایقان تھا کہ حقیقت کی اصل، روحانیت ہی قرار پائے گی۔۵۶ اسی طرح موسی بن میمون کا ذکر بھی احترام سے لیا جاتا ہے اور ان کے حوالہ سے یہ واضح کیا کہ خدا کے ہاں مستقبل نہیں لیکن اس ذاتِ برحق نے وقت لحہ بہ لحہ آن موجود کیا۔ اسی طرح اقبالؔ اپنی بے مثل کتاب 'جاوید نامہ' میں قدیم ایرانی خدا 'زروان' کو دکھاتے ہیں جو ایک رفتار سے آگے بڑھتے زمان کا نمائندہ ہے، اور ان کے ہاں زنّار، زمان کے مادی تسلسل کا عکاس ہے جو بقول شمل کے علامتِ زرتشت ہے۔ اسی ضمن میں ایک اور حدیثِ مبارکہ کہ جس میں نبی اکرم ﷺ یہ فرماتے ہیں کہ میرے اور خدا کے درمیان ایک وقت ایسا بھی رہا کہ جب جبریل امینؑ بھی موجود نہ تھے اور جسے مولانا رومؒ نے بکثرت اپنے کلام میں برتا، وقت کی ابدیت کی مظہر ہے۔ اس موضوع پر مزید گفتگو کرتے ہوئے شمل حضرت شیخ علی ہجویریؒ کی بابت یہ کہتی ہیں کہ ان کے ہاں بھی وقت ماضی و مستقبل کی قیود سے آزاد ہے اور اگر آئن اسٹائن کی تھیوری کو سامنے رکھا جائے تو مستقبل، ماضی کی طرح پہلے سے طے شدہ ہے یعنی ایک پھیلا ہوا سمندر جس کا کوئی کنار نہیں اور جو ہمہ وقت موجود ہے اب

بھلے سے کوئی اس کو دیکھے یا نہ دیکھے۔ اس نوع کی گفتگو برٹنڈ رسل کے ہاں بھی ملتی ہے اور ان کے نزدیک ایک مردِ دانا ہمیشہ حالتِ موجود میں رہتا ہے اور ماضی و مستقبل کے حدوبست میں گرفتار نہیں ہوتا۔

وقت کی مجموعی نامیاتی وحدت جو دکھائی نہیں دیتی، اقبالؔ کے نزدیک تقدیر ہے۔ شمل کا یہ کہنا اہمیت کا حامل ہے کہ اقبالؔ کا تصورِ وقت شیخ علی ہجویریؒ کے افکار سے مماثل ہے۔ انسانی مختارات، نصیب اور وقت کی بابت ذیل کا اقتباس اہمیت کا حامل ہے:

"'Time is a cutting sword' may be used (AK 1531), which had been applied by Hujwiri to the moment of reaching divine time, which Cuts the root of the future and the past, and obliterates care of yesterday and tomorrow from the heart. The sword is a dangerous companion: either it makes its master a king or it destroys him....Though Iqbal has not quoted this word of his medieval compatriot, not even alluded to it, his concept of Time as fullness of destiny in which man may choose, the rank he wants, could be derived easily from Hujwiri's statement."57

فکرِ اقبالؔ کے تقابل میں شمل نے بہت سی اہم اور منفرد شخصیات کو موضوعِ بحث بنایا۔ افلاطون ،ارسطو، دانتے، گوئٹے، ہائنے، نطشے، ہیگل، کارل مارکس، آئن سٹائن، لوئی میسی یوں، ہنری برگساں، ٹالسٹائی، ورڈز ورتھ، میر داماد ملا باقر، موسیٰ بن میمون، حافظ شیرازی، عبدالکریم الجیلیؒ، شیخ محی الدین ابنِ عربی، مجدّدِ الف ثانی، بیدلؔ، سرمدؒ، منصور حلاجؒ اور مولانا رومؒ کے علاوہ تور آندرے، مارٹن بیوبا، پال ٹیلچ، فیڈ غش ووں ہوگل اور رودولف پان وٹز ایسی شخصیات کو بھی شمل نے لائق اعتنا جانا؛ اور ان میں سے بیشتر کا ذکر اقبالؔ کے نثری و شعری کلام میں کسی نہ کسی حوالہ سے موجود ہے۔ عرفانِ حق سے سیرتِ رسول ﷺ اور زمان و مکان کے جملہ تصورات سے لے کر سماج کی روحانی تشکیل تک کے معاملات سے مذکورہ شخصیات جڑی ہوئی ہیں۔ اقبالؔ ان کے مداح رہے اور ان سے اخذو استنباط کے بہت سے در وا ہوئے۔

تور آندرے جن کا ذکر شمل نے ہمیشہ ادب و احترام سے کیا، نے خاص طور سے نبی اکرم ﷺ کی سیرت کو موضوع بنایا۔ شمل کو ان کے جملہ خیالات بڑی حد تک اقبالؔ سے مماثل معلوم ہوئے۔ اسی طرح ایک اور اہم شخصیت فید غش ووں ہوگل کا نام بھی تعظیماً لیا جاتا ہے جن سے اقبالؔ متاثر تھے اور دونوں کے مابین ایک زندہ و متعلق خدا کا تصور، مشترک فکری سرمائے کی صورت موجود ہے:

"Friedrich von Hugel spoke of the 'Divine Ego as the stupendously rich reality', an idea well known to readers of Iqbal lectures. Iqbal is related to these thinkers by his strong interest in the personal, living relation between man and God and the feeling that God has to be conceived of as a personality rather than as an unqualified Supreme Being who cannot be approached by the loving and longing heart."58

آسٹرین نژاد یہودی فلاسفر مارٹن بیوبا(MARTIN BUBER)جو اپنے فلسفہ کلام یعنی مکالمہ کے حوالہ سے ایک خاص شناخت رکھتے ہیں بھی اقبالؔ کے افکار پر اثر انداز ہوئے۔ من و تو کا یہ فلسفہ، کلامِ اقبالؔ میں ایک مسلسل مکالمے کی صورت دیکھا جا سکتا ہے اور اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اقبالؔ اپنے معاصر دانشوروں، فلسفیوں، الٰہیات اور طبیعیات کے ماہرین سے کس قدر متعلق رہے۔ شمل نے یہ بھی بتایا کہ اقبال کی لائبریری میں مارٹن بیوبا کا کچھ کام نظر بھی آیا۔ اقبالؔ کی ان عالمی دانشوروں سے وابستگی کا ایک بنیادی سبب شمل نے کچھ یوں بتایا:

"We may well account for these similarities by referring them back to the common heritage of the 'Prophetic' religions."59

اقبالؔ کے مداحوں میں ایک اہم نام رودولف پان وٹز(RUDOL PANNWITZ)کا ہے۔ یہ جرمن فلسفی اور شاعرِ اقبالؔ سے بے حد متاثر تھے۔ جب انھوں نے اقبالؔ کے خطبات پڑھے اور شمل کے تراجم بابت 'جاوید نامہ' اور '

پیامِ مشرق' دیکھے تو متعجب ہوئے کہ کس بہتر انداز پر ایک مسلم دانشور نے نطشے کو سمجھا اور یہ اعتراف کیا کہ اقبالؔ کی نطشے فہمی کی نظیر مغرب میں بھی خال خال ہے۔۶۰

اقبالؔ زمانۂ طالبعلمی ہی سے ملٹن کی 'فردوس گمشدہ' کے مداح تھے اور ان کی یہ خواہش تھی کہ وہ بھی، کچھ اسی انداز پر، کربلا کی داستانِ غم رقم کریں۔ یاوریٔ قسمت سے یہ موقع انھیں ملا اور 'جاوید نامہ' کی صورت میں فکر و معنٰی کے کئی اہم پیغام سامنے آئے۔ اگرچہ اس کا موضوع کربلا اور اس کے تلازمات و ملحقات سے نہ تھا تاہم جس اعلیٰ سطح پر عشق و محبت، خودی، عرفانِ حق اور وسیع المشربی کے مضامین اس شعری کتاب میں رقم ہوئے، اس کی نظیر کہیں اور کم دیکھنے میں آئی۔ ملٹن اور اقبالؔ کے افکار کی مماثلت کا ایک بنیادی سبب دونوں کا وہ مذہبی لگاؤ تھا جو ان کے شعری افکار میں جگمگایا۔ اور پھر ملٹن سے پہلے دانتے اور عبدالکریم الجیلیؒ ہیں جن کے ہاں بھی ایک افسانوی سفر کی روادا دکھائی دیتی ہے۔ دانتے نے جہنم، اعراف اور جنت کو نظم کو موضوع بنایا اور شروع میں نظم کا نام صرف Comedia تھا، بعد ازاں Divina کا اضافہ ہوا۔ دانتے کی یہ نظم بعض حوالوں سے، خصوصاً مسلمانوں کے لیے دل آزاری کا باعث بنی کہ اس میں نبی مکرّم ﷺ کی شانِ اقدس میں گستاخی کی گئی۔ دانتے کا یہ سفر قبل از مسیحؑ اطالوی شاعر ورجل کی معیت میں ہوا جبکہ اقبالؔ، مولانا رومؒ کی معیت اور راہنمائی میں افلاک کی سیر کرتے ہیں۔ کچھ اسی نوع کے سفر کی روداد عبدالکریم الجیلیؒ بیان کرتے ہیں اور وہاں بھی مختلف سیاروں پر بزرگ ہستیاں نظر آتی ہیں۔ عبدالکریم الجیلیؒ، ابنِ عربیؒ سے متاثر تھے اور وحدت الوجودی سلسلہ کے ایک بڑے مبلغ تھے۔ انھوں نے ابنِ عربیؒ کے خیالات کو ایک مربوط شکل دی اور انسانِ کامل کا تصور پیش کیا، جسے اقبالؔ کے مردِ مومن کی اولیں چھاپ کہہ سکتے ہیں اور پھر ان کا ذاتِ برحق کو ایک خودی قرار دینا ایک ایسی فکری اپج تھی جو انھیں اقبالؔ کے انتہائی قریب لے آتی ہے۔ ان کے، اقبالؔ، اور ابنِ عربیؒ کے سفر افلاک کی بابت شمل اپنی کتاب GABRIEL'S WING کے صفحہ ۳۰۵ پر باقاعدہ چارٹ بنا کر یہ بتاتی ہیں کہ کس فلک پر کون سی ہستی متذکرہ شخصیات کی جانب سے دکھائی گی ہیں؛ مثلاً فلکِ مشتری (JUPITER) پر ابن عربیؒ کی جانب سے جنابِ موسیٰؑ اور ان کے وزیر، الجیلی کی جانب سے بھی جنابِ موسیٰؑ اور حضرت میکائیلؑ اور اقبالؔ کے ہاں عشاقِ ایزدی منصور حلاجؒ، قرۃ العین طاہرہ، غالبؔ اور ابلیس

موجود ہیں۔ ابلیس کے حوالہ سے اقبالؔ جہاں گوئٹے اور مولانا رومؒ سے فکری مماثلت رکھتے ہیں وہیں ملٹن بھی اس فکری احاطہ میں شامل نظر آتے ہیں اور وہ بھی ابلیس کو مصالحِ ایزدی کا ایک بنیادی محرک جانتے ہوئے خاص اہمیت دیتے ہیں۔ اپنی کتاب پیراڈائز لاسٹ (PARADISE LOST) یعنی جنتِ گم گشتہ کی بنیاد ہی مصالحِ ایزدی کی تفہیم پر رکھی گئی اگرچہ گفتگو کا پیرایہ بدل گیا تاہم خالص ابلیسی تحرک کے ضمن میں اقبالؔ اور ان کے درمیاں مماثلت موجود ہے؛ غرض ملٹن کے ہاں یہ کردار پرومیتھیس (PROMETHEUS) کا روپ دھار لیتا ہے کہ اس کی فراہم کردہ آتش سے انسانی زندگی کا سفر آگے بڑھا۔ دانتے اپنی اسلام بیزاری کے باوجود ابنِ عربیؒ کے اثرات لیے ہوئے تھا اور اس کی 'ڈیوائن کامیڈی' پر شیخ عربیؒ کے افکار کا رنگ دیکھا جا سکتا ہے۔ ملٹن اور اقبالؔ کی فکری مماثلتوں کی بابت شمل کا یہ کہنا اہمیت کا حامل ہے:

"However he could not escape the overwhelming impression the English poet had once left upon his mind, and when in 1932 the Javidname was completed, a reader familiar with Milton could detect without difficulty some striking resemblance of persons and imagery. Iqbal and Milton, both deeply involved in the Mental struggle with the problem of power and its reconciliation with goodness, have given the figure of Satan very similar features; Satan, endowed with Promethean virtues, the powerful and wonderful Anti-Christ of the paradise Lost, is comparable to the Iqbalian Iblis in many respects..."61

جمہوریت کی بابت اقبالؔ کے تصورات اپنے پس منظر میں اسلامی ضبط لیے ہوئے ہیں۔ وہ اسلام کے شورائی نظام کو ایک حد تک سماجی جمہوریت کا بدل جانتے ہیں تاہم مغربی جمہوریت کی بابت ان کی رائے بہتر نہیں اور انھیں جمہوری قبا میں دیوِ استبداد پائے کوب نظر آتا ہے اور ان جملہ خیالات کا اظہار انھوں نے متعدد مقامات پر کیا اور پھر خلافت ان کے ہاں بھیک میں حاصل ہونے والی شے نہیں یعنی اسے قائم کیا جاتا ہے، مانگنے سے نہیں ملتی۔ ان کی یہ تنقید خاص طور سے خلافت تحریک کے پس منظر میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جنگِ عظیم اوّل کے بعد، سلطنتِ عثمانیہ کے حصے بخرے

ہونے پر جو ترک پارلیمنٹ وجود میں آئی، ابتداً اقبالؔ اس سے بہت متاثر تھے اور اسے انھوں نے مسلم اجتہاد کی ایک صورت قرار دیا کہ یہ ضروری نہیں کہ اجتہاد کا اختیار کسی فردِ واحد کو حاصل ہو، یہ اہم کام مسلم پارلیمنٹ بھی اپنے ذمے لے سکتی ہے یوں ایک روحانی جمہوریت کا تصور اقبالؔ کے ہاں فروغ پاتا رہا جو نظم و نثر میں اپنا تفاعل پیش کرتا رہا، البتہ مغرب کے تتبّع میں جب ترکی میں بھی ریاستی امور میں، مذہبی مداخلت کو محدود کر دیا گیا تو اس پر وہ ناشاد ہوئے اور ان کی توقعات ڈھے گئیں:

"However, Iqbal's attitude towards the Turkish experiment was rather oscillating. He had the Greek, with greatest welcomed Mustafa Kemal's victory, the conquest of Izmir from Joy and pride, and had even composed a chronogram with the word ismi azam Mustafa- But three years later he the Greatest Name Mustafa-which gives the date 1342, i.e. 1922. was reluctant as to the result of the separation of state and church which had been introduced by Ataturk through the new constitution."62

ہندوستان میں سماجی جمہوریت اور مسلم معاشرت کے تحفظ کی خاطر اقبالؔ سیاسی افق پر جن تبدیلیوں کو ناگزیر جانتے تھے اس پر شمل نے بعض اہم نکات مبحث کا حصہ بنائے۔ اگرچہ وہ نظم و نثر میں اس طرزِ حکومت پر سخت تنقیدی نظریات پیش کر چکے تھے لیکن ایک خاص صورت میں وہ اس کے مؤید بھی نظر آئے؛ پیشِ نظر مقاصد میں ایک اہم معاملہ جہاں مسلم ثقافت کا تحفظ اور اس کی نشو و نما تھی وہیں اس وسیع خطے میں موجود مسلمانوں کی روٹی روزی کا مسئلہ بھی اہمیت کا حامل تھا؛ اور اس کے لیے تقسیم ہندوستان انھیں ناگزیر معلوم ہوئی۔ اسلام کے ابدی اور آفاقی اصول اور قوانین کو آزمانے کے لیے ایک جدا مسلم ریاست کا خاکہ وہ ۱۹۳۰ء میں الہٰ آباد کے مقام پر دے چکے تھے جسے مسلم لیگ نے سنجیدگی سے اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کا ایک کارگر ضابطہ جانا اور اس کی عملی تعبیر میں وہ متحرک ہوئے۔ اقبالؔ اس امر سے خائف تھے کہ اگر یہ تقسیم نہ ہوئی تو پھر جمہوریت کے نتیجہ میں جو ریاست وجود میں آئے گی وہ سراسر ایک ہندو ریاست ہی ہو گی۔ محمد علی جناح کو لکھے گئے ایک خط کے مندرجات کو شمل نے برمحل پیش کیا:

"After a long and careful study of Islamic law I have come to the conclusion that if this system of Law is properly understood and applied, at least the right to subsistence is secured to everybody. But the enforcement and development of the Shariat of Islam is impossible in this country without a free Muslim state or states. This is my honest conviction for many years and I still believe this to be the only way to solve the problem of bread for Muslims as well as to secure a peaceful India..."63

شمل نے اپنے مقالات اور خاص طور سے کتاب Gabriel's Wing میں مقدور بھر یہ کوشش کی کہ فکرِ اقبالؔ کو ہر زاویہ سے پرکھا جائے اور اسے قاری کے لیے قابلِ تفہیم بنایا جائے۔ اپنی اس کوشش میں وہ تقابلی مطالعات بھی پیش کرتی ہیں اور ایسی تمام اہم اور نابغۂ روزگار شخصیات کو بھی گفتگو کا حصہ بناتی ہیں جو کسی نہ کسی حوالہ سے اقبال کے زمرۂ افکار سے متعلق ہیں۔ موضوع خودی ہو یا علم الکلام کے مباحث، گفتگو تصورِ وقت پر ہو یا پھر روحانی جمہوریت کی، شمل نے اسناد و براہین کے ساتھ نِکات کی تسہیل میں دقتِ نظری سے کام لیا اور یہ محسوس ہوا کہ شمل نے کسی بھی موضوع پر قلم اٹھانے سے پیشتر بہت سا وقیع تحقیقی و تنقیدی کام دیکھ رکھا تھا۔ یہ شمل کے جملہ اختصاصات میں سے ہے کہ وہ الٰہیات، تصوف، تاریخ، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، ادب اور تہذیب و ثقافت کی بابت ایک بسیط اور عمیق مطالعہ رکھتی تھیں اس لیے افکار کی تفہیم میں ان کا قلم رواں ہمیشہ رواں نظر آیا اور تحریر میں ایک بہاؤ محسوس ہوا، اور یہ اقبالؔ اور اس کے قاری کی خوش بختی ہے کہ اسے ایک ایسا ناقد اور محقق ملا جس کے خیالات مانگے تانگے کہ نہیں بلکہ علمی و فکری تفحصات سے پُر ہیں۔ تقابلی مطالعے اور توضیحاتی تکنیک اور تنوع کی بابت ذیل کا اقتباس اہم ہے:

"This mystery, that God seeks man first, has often been expressed in mysticism both Eastern and Western, perhaps in the simplest words by the Persian Sufi Kharraqani who beheld one night God Almighty in his dreams, and, overflowing with love and joy, cried out: "O my God, for sixty years have I hoped to win thy love, and lived in longing for Thee!" And the lord answered: "Thou hast sought Me sixty years? And we have loved

thee from the beginning of the world.....The finest example of the quest of God for man in European literature, that of Francis Thompson's Hound of Heaven, is anticipated by Niffari, an Iraqi Mystic of the middle of the 10th century. And how often do we find the idea that God himself gives prayer, that He "causes prayer to grow in us like roses grow from the dust", so that in each "O lord" of the slave there are a hundred, "I am at your service" from God's side."64

شمل کے اس نوع کے تفحصات نہ صرف قاری کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں بلکہ ان کا جمالیاتی احساس تا دیر مسحور کیے رکھتا ہے اور ان کا پڑھنا لطف و انبساط کا سبب بنتا ہے۔

شمل نے بہت سے مواقعوں پر اقبالؔ کے اشعار بطور سند کے پیش کیے، انھیں انگریزی زبان کے قالب میں ڈھالا اور مغربی قارئین کے لیے اقبالؔ فہمی کی آسان صورت پیش کی۔ بعض اشعار کے تراجم تو انتہائی موزوں اور بر محل معلوم ہوتے ہیں تاہم چند اشعار ایسے ہیں جن میں فکری سقم یا خیال کی نارسائی کا احساس ہوتا ہے۔ مثلاً کتاب Gabriel's Wing کے صفحہ ۲۶۲ پر اقبالؔ کے ایک معروف شعر:

ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلّی   اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

کا انگریزی ترجمہ کچھ یوں مندرج ہے:

"Every moment new Sinais, new lightnings of revelation.....

May God grant that the path of nostalgy may never been travelled."65

مترجم انگریزی ترجمہ کا پہلا مصرعہ ہی اسقام لیے ہوئے ہے جبکہ دوسرے مصرعے میں 'مرحلۂ شوق' کے لیے 'nostalgy' کا استعمال کسی بھی طور مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اسی طرح مذکورہ کتاب کے صفحہ ۳۶۹ پر بالِ جبریلؑ کے ایک زبان زدِ عام شعر یعنی

یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے　　گلیمِ بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ

(اقبال۔ کلیاتِ اقبال، اردو۔ شیخ غلام علی۔۔۔۳۱۵)

کا انگریزی ترجمہ کچھ یوں ہے

"The Shaik of present day has stolen and sold

The carpet of Abu Dharr, the cloak of Uwais and the veil of Fatima."66

مترجم شعر کے پہلے مصرعہ میں 'یہی شیخِ حرم' کے لیے 'the Shaikh of present day' ایسے کلمات کسی بھی طور موزوں معلوم نہیں ہوتے، اسی طرح مصرعہ دوم میں 'گلیم' کے لیے لفظ 'carpet' کا چناؤ بھی غیر مناسب ہے تاہم یہ خرابی ہر مترجم شعر میں موجود نہیں اور متعدد اشعار ایسے ہیں جن میں شمل کا تفہیمی جوہر درست سمت دکھاتا ہے، مثلاً بالِ جبریلؑ کا معروف شعر:

شوق ترا، اگر نہ ہو میری نماز کا امام　　میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب

(اقبالؔ۔ کلیاتِ اقبال (اردو)۔ اسلام آباد: الحمراء پبلشنگ، ص ۵۶۴)

کا انگریزی ترجمہ کچھ یوں داد سمیٹتا ہے:

"As long as longing for Thee is not the aim of my prayer,

As long both my standing (qi yam) and my prostration (sujud) are a veil (between us)."67

اقبالؔ کا ایک اور معروف شعر:

کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں   کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

(اقبالؒ۔ کلیاتِ اقبال (اردو)۔ اسلام آباد: الحمراء پبلشنگ، ص ۳۹۸)

کا انگریزی ترجمہ شمل نے کچھ یوں کیا:

"For once, O waited Reality, reveal Thyself in a form material:

For a thousand prostrations are quivering in my submissive brow..." 68

اقبالؒ نے پہلے مصرعہ میں لفظ 'حقیقت' کی ضد 'مجاز' کا استعمال انتہائی خوبصورتی سے کیا اور ذاتِ برحق کی جلوہ نمائی کی امکانی صورت پیدا کی اور 'لباسِ مجاز' جس کی اصلاً کوئی مادی حقیقت نہیں، کو اپنے لیے ایک بڑی سعادت قرار دیا ہے کہ مشاہدۂ حق آسان نہیں، اگرچہ اقبالؒ یہ کہنے میں بھی متامل نہیں۔

اڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پر کلیمؑ   طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی

(اقبال۔ کلیاتِ اقبال، اردو۔ لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ص ۱۰۲)

تاہم 'مجاز' ہی وہ صورتِ امکاں ہے جس کی تاب لائی جا سکتی ہے اور شمل کا اس ضمن میں یہ کہنا 'reveal Thyself in a form material' فہم سے بالا ہے البتہ مصرعہ دوم کا ترجمہ موزوں اور برمحل معلوم ہوتا ہے۔

مغرب میں بیسویں صدی کے وہ مستشرق جنھوں نے اسلام اور داعی اسلام ﷺ کے دفاع میں اپنی گرانقدر خدمات پیش کیں، ان میں ایک بڑا نام شمل کا ہے جنھیں لوئی میسی یوں کے بعد انتہائی اہم شخصیت گردانا جا سکتا ہے اور یہ دفاع جذباتی یا سطحی رغبت کا نتیجہ نہیں بلکہ اِس کی اساس اُس بسیط مطالعے کی بنیاد پر ہے جو الٰہیات و تصوف سے ادب، ثقافت اور فنونِ لطیفہ کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اقبالؒ کی بابت بھی جملہ اعتراضات کا انھوں نے کمال مہارت سے

دفاع کیا اور یہ جو کہا گیا کہ اقبالؔ کے خیالات میں تسلسل نہیں۔ وہ اپنی ہی کہی ہوئی باتوں کے مرتد ہیں اور افکار کا ایک ہجوم ہے جن میں باہمی ضبط کا فقدان ہے یا پھر اقبالؔ کے جملہ افکار مانگے تانگے کے ہیں اور یہاں تک کہ اقبالؔ اپنی شاعری اور نثر میں مختلف نظر آتے ہیں۔ ان سب اعتراضات کا جواب شمل کچھ یوں دیتی ہیں:

"Self-contradiction occurs in every living being, and why should not the poet show a certain inconsistency, a development, either deepening some root ideas or throwing away some outlived ideas? The rapid change in the political field during his life time may also have caused some changes in his outlook. Thus, one can witness different currents of his thought Excellency in the case of Turkey which was both praised and blamed for her modernization, and yet, Iqbal's twofold attitude towards this country emerges quite logically out of his main ideal: that of a reconstruction of Islam on new lines without adapting the surface of the European way of life. On the whole, from 1915 onwards Iqbal's essential direction has remained largely the same."69

اور اقبالؔ بحیثیت فلسفی کس درجہ اور کس قبیل سے علاقہ رکھتے تھے اس پر شمل کی رائے وہی معلوم ہوتی ہے اور انھیں بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے:

"As to the question of his philosophy one should not forget that a difference exists between a scientific philosopher and a prophetic philosopher. Iqbal was certainly of the second type, endowed with an extraordinary capacity for assimilation, and for synthesing seemingly divergent facts into a new unity that may look, at the first glance, surprising enough, but has, in any case, proved as stimulating formative of the Weltanschauung of Pakistan."70

شمل پر ہونے والی تنقید اور خاص طور سے Gabriel's Wing پر موجود نقد یا مقالات بڑی حد تک متوازن لب و لہجہ قائم رکھے نظر آتے ہیں اور اگر شمل سے کوئی شے بتانے یا اس کا اظہار کرنے میں کوئی کجی، کوتاہی سرزد ہوئی بھی ہے تو اسے بطریقِ احسن نمایاں کیا گیا ہے یعنی ایک عالمانہ اور مشفقانہ رویہ۔ اور اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ چونکہ شمل ایک بدیسی معاشرت اور ثقافت کی پروردہ ہیں، اس لیے ان کا پاکستان، ہندوستان اور اس کی کثیر الجہت ثقافتی و تہذیبی زندگی سے تعلق کبھی بھی ٹھوس بنیاد پر قائم نہیں ہو سکتا چنانچہ اِن سے اُس تفحص کی امید نہیں رکھنی چاہیے جو ایک مقامی اسکالر یا عالم براہِ راست اس سماج اور ثقافت کا ناظر ہونے پر پیش کرتا ہے اور اگر شمل ٹکر کا یا بڑھ کر اپنا علمی و فکری مطالعہ سامنے لائے تو یقیناً کمال کی بات ہے۔ ایک مستشرق کے لیے ہمارے خطے کا ادب، ثقافت، معیشت، تاریخ، تصوف اور مذہبی عقائد و رسوم سے کامل آشنائی، کارِ دشوار ہے اور قریباً ناممکن۔ ایسے میں اگر کچھ چھوٹ جائے یا کسی جا پر چوک واقع ہو تو معاملہ پر گرفت کچھ نرم ہونی چاہیے نہ کہ طنز و طروز کے نشتر چلائے جائیں اور بھد اڑاتے ہوئے، کردار کشی کی جائے۔ یہ طور بعض مقالہ نگاروں کے ہاں دیکھنے کو ملتا ہے جو شمل کے افکار پر بات کرتے ہوئے، بے سبب ذاتی عناد یا مخاصمت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک مقالہ 'اقبالؔ ریویو' میں جون ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا جو محترم سید عبد الواحد نے لکھا اور اس کے مترجم سید یوسف بخاری ہیں۔ اس مقالہ میں جا بجا، ایسے اقتباسات موجود ہیں جن سے فاضل مصنف کی شمل سے برافروختگی نمایاں ہے، اور وہ یہاں تک مشورہ دے ڈالتے ہیں کہ شمل کو کن الفاظ سے اپنی تحریر کا آغاز کرنا چاہیے تھا:

"اقبالؔ نے مرنے سے عین قبل اپنے بھائی سے کہا تھا: 'میں مسلمان ہوں اس لیے موت سے کیا ڈروں گا'۔ ڈاکٹر شیمل کو چاہیے تھا کہ وہ ان الفاظ سے ہی اپنے موضوع کی ابتدا کرتیں اور بتاتیں کہ اقبالؔ نے اسلام کی روح کو کس طرح سمجھا تھا۔۔۔۔ یہاں یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ اقبالؔ کے مذہبی خیالات کی 'تشکیلِ جدید' سے آخر کیا مطلب ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ مصنفہ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ دین کے معاملے میں اقبالؔ کی 'غلط فہمیاں' کیا ہیں؟ 'اقبالؔ اور دعائیں' کے موضوع پر ڈاکٹر شیمل کے تصورات سے ہم بخوبی آگاہ ہیں۔ وہ اپنی جگہ دلچسپ بھی ہیں اور عالمانہ بھی۔ مگر اقبالؔ کی دعاؤں میں جو

سوزِ دروں، جو والہیت، جو اضطراب و التہاب اور جو شش دری و خود رفتگی ہے اس تک مصنفہ بھلا کہاں پہنچ سکتی ہیں؟ اس لیے وہ اس باب میں بھی رسمی اور سطحی بات کر رہی ہیں۔"۷۱

یعنی محض تاثرات کی بنیاد پر ایک سخت محاکمہ پیش کیا گیا اور وہ بھی اس خاتون کی بابت جس کے ہاں تصوف، الٰہیات، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، منصور حلاجؒ، مولانا رومؒ اور اقبالؔ کی بابت محبت اور شیفتگی کے متعدد زاویے ہیں اور جن کا اسلام سے رغبت کا سبب ایک حدیثِ مبارکہ تھی اور جس کی تمام عمر اسلام اور اس کے جمالیاتی پہلوؤں کو مرتّب کرنے میں گزر گئی اسے یوں عامیانہ انداز میں ہدفِ تنقید بنانا، کسی بھی طور مناسب نہیں اور شاید اس کا ایک اہم سبب شمل کے جملہ افکار و معاملات سے بے خبری ہے جو درست نقد پیش کرنے میں سدِّ راہ ہوئی۔ باب کے اس حصہ کا اختتام شمل کی اُن سطور سے ہو رہا ہے جن میں اقبالؔ کی عظمت خاص طور سے رقم ہے:

"Nobody will assert that he was a Prophet –that would be both wrong from the point of view of history of religions and incompatible with the Islamic dogma of the finality of Prophet Hood–but we may admit that he has been touched by Gabriel's Wing."72

حواشی

حصہ سوم: بابِ سوم

ا: این میری شمل ، پروفیسر ، ڈاکٹر۔ شہپرِ جبریل۔ علامہ اقبالؒ کے دینی افکار۔(مترجم) محمد ریاض، ڈاکٹر۔لاہور: گلوب پبلشرز، ۱۹۸۵ء ص ۴

۲: ایضاً ص ۷

3: Schimmel, Annemarie. "Iqbal and Goethe." Iqbal, vol.52, no.3 July-Sep.2005, p. 15

4: _________________. "Pakistan's Philosopher-Poet Mohammad Iqbal: AN INTRODUCTION." Iqbal Review 44: 4 (upcoming)

(Talk given on January 20, 1989 by Dr. Annemarie Schimmel at the residence of the Ambassador of Pakistan to Netherland, Hague).

۵: طیبہ تحسین (مبصر)۔ دریائے رائن تا دریائے مہران۔ محمد اکرام چغتائی (مرتّب)۔ مخزن ۲۶۔لاہور: جلد ۱۳، شمارہ ۲، ۲۰۱۳ء ص ؟

6: AL-HASAN, SHARIF. "Islamic Studies." Islamic Studies, vol. 3, no. 2, 1964, pp. 233–237. JSTOR, www.jstor.org/stable/20832744.

7: Schimmel, Annemarie. Gabriel's Wing: A Study into the religious Ideas of Sir Muhammad Iqbal. Leiden: Brill, 1963. Reprinted, Lahore: Iqbal Academy, 1989. p.29

8: Ibid. p.45,46

9: Ibid. p. 49.

10: Ibid. p.52.

11: Ibid.

12: AL-HASAN, SHARIF. “Islamic Studies.” p.233

13: Schimmel, Annemarie. Gabriel’s Wing: A Study into the religious Ideas of Sir Muhammad Iqbal. P. 89

14: Ibid. p. 93

15: Schimmel, Annemarie. “Some Thoughts About Future Studies of Iqbal”. Iqbal, vol. xxiv, no.4, Oct. 1977.p.2

16: Schimmel, Annemarie. Gabriel’s Wing: A Study into the religious Ideas of Sir Muhammad Iqbal. P.234.

17: Ibid. p. 327

18: Ibid. p.234

19: Ibid. p.94

20: Ibid. p.264

21: AL-HASAN, SHARIF. “Islamic Studies.” P. 235

22: Schimmel, Annemarie. Gabriel’s Wing: A Study into the religious Ideas of Sir Muhammad Iqbal. P. 266

23: Ibid. p.95

۲۴:امیر خان نیازی، سیّد۔ مترجم۔ عین الفقر۔ حضرت سلطان باہو۔لاہور: العارفین پبلیکشنز، ۲۰۱۴ء ص ۳۰، ۳۲

25: Schimmel, Annemarie. Gabriel's Wing: A Study into the religious Ideas of Sir Muhammad Iqbal. P.98

26: Ibid

۲۷:حمید یزدانی، خواجہ، ڈاکٹر۔ شرحِ جاوید نامہ۔لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء ص ۲۰۴، ۱۹۸

28: Schimmel, Annemarie. Gabriel's Wing: A Study into the religious Ideas of Sir Muhammad Iqbal. P.123,124

۲۹:حمید یزدانی، خواجہ، ڈاکٹر۔ شرحِ جاوید نامہ۔ ص ۲۰۴

30: Schimmel, Annemarie.The Secrets of Creative love: The work of Muhammad Iqbal. London: Al Furqan Islamic Heritage Foundation, 1998.

or

Schimmel, Annemarie. "The Secrets of Creative love: The work of Muhammad Iqbal." Iqbal Review 44: 4 (upcoming).

31: Ibid. p.16.

32: Schimmel, Annemarie. Gabriel's Wing: A Study into the religious Ideas of Sir Muhammad Iqbal. P. 162.

33: Ibid.164,166,167

34: Ibid. p.192

35: Ibid.p.248

36: AL-HASAN, SHARIF. “Islamic Studies.” P. 236,237

37: Schimmel, Annemarie. Gabriel's Wing: A Study into the religious Ideas of Sir Muhammad Iqbal. P.333

38: Ibid. p.331

39: Schimmel, Annemarie. “Iqbal and Goethe”. P.21

40: Ibid. p.20

41: Ibid. p.23

42: Ibid. p.24

43: Ibid. p.27

44: Ibid. p.27

۴۵: این میری شمل، ڈاکٹر۔ "منصور حلّاج۔ اقبالؔ کی نظر میں "ماہِ نو (اقبالؔ نمبر)، ستمبر ۱۹۷۷ء ص ۸

۴۶: ایضاً۔ ص ۱۰

۴۷: ایضاً۔ ص ۱۰

48: Schimmel, Annemarie. Gabriel's Wing: A Study into the religious Ideas of Sir Muhammad Iqbal. P.356

۴۹:جاوید اقبال۔ زندہ رود، حیاتِ اقبال۔ لاہور: اقبال آکادمی پاکستان، ۲۰۰۰ء ص ۱۰۹

۵۰:ایضاً۔ ص ۹۳

51: Schimmel, Annemarie. Gabriel's Wing: A Study into the religious Ideas of Sir Muhammad Iqbal. p.275

52: Ibid. p.283

53: Ibid. p.311

54: Ibid. p.292

55: forum.mohaddis.com/threads/1656.

56: Shafique, Khurram Ali. Iqbal –AN ILLUSTRATED BIOGRAPHY.Lahore: Iqbal Academy Pakistan, 2010(3rd Edition), 106.

57: Schimmel, Annemarie. Gabriel's Wing: A Study into the religious Ideas of Sir Muhammad Iqbal. p. 298

58: Schimmel, Annemarie. "Some Thoughts About Future Studies of Iqbal". P.5

59: Ibid. p.6.

60: Schimmel, Annemarie. "Rudolf Pannwitz (1881-1968)" Iqbal, vol. xxvi, no.1, Jan. 1979. P.76.

61: Schimmel, Annemarie. Gabriel's Wing: A Study into the religious Ideas of Sir Muhammad Iqbal. p. 329

62: Ibid. p. 241

63: Ibid. p.235

64: Ibid. p.190

65: Ibid. p.262

66: Ibid. p.369

67: Ibid. p.176.

68: Ibid. p.182

69: Ibid. p.379

70: Ibid. p.380

۷۱: یوسف بخاری، سیّد۔ مترجم۔ بالِ جبرئیل از اینے میری شیمل۔ عبدالواحد، سید (تبصرہ نگار)۔ اقبال ریویو، شمارہ ۲، جلد ۱۲، جولائی ۱۹۷۱ء ص ۱۰۰، ۹۹، ۸۹

72: Schimmel, Annemarie. Gabriel's Wing: A Study into the religious Ideas of Sir Muhammad Iqbal. p. 387

حصہ چہارم: بابِ سوم

شمل کی ادب فہمی

باب کا یہ حصہ شمل کی ان کاوشوں سے متعلق ہے جو براہِ راست اردو ادب کے تعارف سے جڑا ہے۔ ہمارے پیشِ نظر ان کی تالیف CLASSICAL URDU LITERATURE FROM THE BEGINNING TO IQBAL ہے جو وزبیڈن (WIESBADEN) مغربی جرمنی سے اشاعتی ادارے اوٹو ہیر ازووٹز (OTTO HARRASSOWITZ) سے ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی۔ یہ تحقیقی کاوش اس بسیط علمی سرمائے کا حصہ ہے جو معروف ماہرِ ہند جین گونڈا (JAN GONDA) کی نگرانی میں مرتب ہوا؛ وہ سنسکرت کے ایک بڑے عالم تھے۔ ان کا تعلق ہالینڈ سے تھا اور ان کے ذمّہ ہندوستانی ادب یا بہ الفاظِ دگر آریائی ادب کی تاریخ کو مرتّب کرنا تھا؛ چنانچہ مرکزی عنوان A HISTORY OF INDIAN LITERATURE کی ذیل میں متعدد صاحبانِ علم نے ہندوستان کے جملہ مذہبی، تاریخی، تہذیبی، ثقافتی، لسانی اور سری علوم سے فنون لطیفہ تک کے مباحث کا احاطہ کرنے کی جستجو کی۔ اس ساری کدوکاوش کے پس پردہ محرکات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہم شمل کے ادبی تاریخی شعور کو مرکزِ نگاہ بنانا چاہیں گے کہ یہ ایک ایسی منفرد کوشش ہے جس سے ان کی ادب فہمی کے بہت سے نئے حوالے سامنے آتے ہیں۔

شمل نے اردو ادب کی تاریخ کا مطالعہ پیش کرتے ہوئے ہندوستان کے اسلامی ادب (ISLAMIC LITERATURE OF INDIA) اور سندھی ادب (SINDHI LITERATURE) کے حوالہ سے جدا تفحصات پیش کیے جو شماریاتی تصحیح کے بعد بالترتیب والیم ۸، حصہ یا جُز اول اور والیم ۹، حصہ یا جُز اوّل پر مشتمل ہے جبکہ موضوعِ گفتگو حصہ جو اردو ادب سے براہِ راست متعلق ہے اس سیریز کے والیم ہشتم کے حصہ سوم کی شماریاتی شناخت

لیے ہوئے ہے۔ جدید ادب کی بابت مطالعہ پیش کرنے کی کاوش گوپی چند نارنگ کی جانب سے نظر آتی ہے جو اسی والیم کا حصہ چہارم ہے۔ شمل نے یہ مطالعہ یا سیریز کا حصہ ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے نام کیا ہے جو صفحہ ۱۲۵ سے ۲۶۱ کو محیط ہے اور تین ابواب میں منقسم ہے؛یعنی بابِ اوّل جو ابتدائی دور سے متعلق ہے، بارھویں سے سترھویں صدی عیسوی تک کے ادب کا احاطہ کرتا ہے۔ شمالی ہند میں اردو ادب کے آغاز کی بابت بارھویں(۱۲) سے چودھویں(۱۴)صدی عیسوی اور دکن میں اردو کی نشوونما کے حوالہ سے پندرھویں (۱۵) سے سترھویں(۱۷)صدی عیسوی تک کو شامل کیا گیا ہے اور گجرات، گلبرگہ، بیجاپور، گولکنڈہ، اورنگ آباد کو مبحث کا حصہ بنایا ہے۔ اس ضمن میں مرتب ہونے والا کام بہت سی اہم معلومات لیے ہوئے ہے۔

بابِ دوم ۱۷۰۰ سے ۱۸۵۰ء تک ادبی رجحانات کو سمیٹتا ہے جبکہ تیسرا باب غالبؔ سے اقبالؔ تک کی ادبی کارگزاریوں کو سامنے لاتا ہے۔ اس تحقیقی و تنقیدی مطالعے کے مآخذ و مصادر میں جو کتب معاون ہوئیں ان میں دتاسی کی Historie de la Litterature Hindouie et Hindoustani کا والیم ۳ جو پیرس سے ۱۸۷۰،۷۱ میں شائع ہوا کے ساتھ رام بابو سکسینہ کی A History of Urdu Literature (مترجم مرزا محمد عسکری)، ٹی۔جی۔ بیلے(T.G.BALLEY) کی A History of Urdu literature جو شمل کے نزدیک اگرچہ مختصر ہے لیکن معلوماتی ہے کے علاوہ جو اہم کتب اور مصنفین کے نام ملتے ہیں ان میں اے بوسانی(A. Bausani) کی Storia Delle letterature del Pakitan, Milano History of Urdu Literature سید احتشام حسین کی Istoria Literatury Urdu (Moscow)، محمد صادق کی A History of Urdu literature کے N. Gelbov –A. کی Suchocey, Literatura Urdu اور عبدالحیؒ کی گلِ رعنا کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر وحید قریشی اور نقوش کے خصوصی غزل، افسانہ اور شخصیات نمبر کا حوالہ موجود ہے۔ مزید یہ کہ یورپین، ہندوستانی اور پاکستانی کتب خانوں کی فہارس سے بھی معاونت حاصل کی گئی ہے۔

اس کتاب کا اختصاص یہ ہے کہ اس کے فٹ نوٹ میں موجود مصادر و منابع جس کثرت اور وقیع حوالوں کی صورت موجود ہیں وہ ادبی کتب کی تواریخ میں بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں۔یعنی ایک بات کے لیے بیسیوں منابع موجود ہیں البتہ ایڈیٹر کے اس نوٹ کے سبب نہ صرف اس کتاب کی قدر و منزلت متاثر ہوئی بلکہ یہ کتاب شمل کی بہترین کتب کے ساتھ رکھنے کی بھی سزوار نہیں۔ جین گونڈا کا انتہائی مختصر پیش لفظ کچھ یوں ہے:

"In writing it Professor Schimmel was indebted to some colleagues, who wish to remain anonymous, not only for many helpful suggestions but also for a wealth of notes and unpublished material, mainly concerning the chapter on Dakhni Literature, the sections on Faiz and Nazir and most sections on prose literature in the second and third chapters."1

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ مترشح ہے کہ شمل کا یہ کام طبع زاد نہیں اور یوں بھی ان کے ہاں کبھی اس کتاب کے حوالہ سے کوئی علمی تخصیص نظر نہیں آئی۔ انھوں نے فراخدلی سے ایڈیٹر کے نوٹ کی موجودگی میں اس کتاب پر اپنا نام لکھانا منظور کیا اور تاریخِ ادب کے مبادی مباحث پر کہیں کہیں گرانقدر تفحصات پیش کیے۔ یہ کتاب زبانِ اردو کی نشو و نما کی بابت بہت سی اہم معلومات لیے ہوئے ہے اور اپنے بسیط حوالوں کے سبب اردو کی منتخب تواریخ میں اہم جگہ پانے کی اہلیت رکھتی ہے۔

کتاب کا پہلا باب جو اردو کی نشو و نما کے ابتدائی عہد کو محیط ہے کا تعارف پیش کرتے ہوئے شمل لائقِ اعتنا اسناد پیش کرتی ہیں اور اس ضمن میں صوفیاء کرام کی ابتدائی کاوشیں مرکزِ نگاہ بناتی ہیں ؛اِس عہد کی مجموعی تہذیبی و معاشرتی فضا کے ساتھ ساتھ سیاسی پس منظر بھی احسن انداز پر پیش ہوا،اور یہ ایک ایسا موضوع ہے جو شمل کی براہِ راست انسیت اور لگاؤ سے عبارت ہے یعنی شمل جن کا اختصاص ہی الٰہیات و تصوف ہے کے بیان میں ہمیشہ آسودگی اور ارزانی محسوس کرتی ہیں:

"Most of the Muslim saints of the early period composed their major works in Persian; the tadkiras mention, however, that Hwaja(Kwaja) Asraf Ghani Sumnani had set down his teachings in a treatise in the hindwi language, called Aklaq-i-tasawwaf, 'The Ethics of Sufism'; but only small fragments have come to light. Sufi masters like Farid Gang-i-Sakar of Pakpattan (d. 1265) and Hamiduddin Nagori (d.1274) as well as Bu Ali Qalandar in the early 14th century, Sarafuddin Yahya Maneri in the late 14th century are credited with short utterances, and perhaps a few verses, in the local languages."2

شمل نے اس کتاب میں لفظ کی ادائیگی کے ضمن میں جو صوتی طریقہ کار اپنایا ہے وہ قدرے دشوار ہے اور اس سے الفاظ کے درست مخارج یا تلفظ کے بہتر فہم کی ارزانی محسوس نہیں ہوتی اور یوں لفظ کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے، مثلاً لفظ 'تذکرہ' کو 'tadkira' اور 'خواجہ' کو 'Hwaja' لکھنا اور اس صورت میں یہ اہتمام کہ انگریزی حرف کے نیچے الٹی قوس لگا دی جائے، ایسے تمام مختارات ممکن ہے کہ کسی مروج اہم ضابطے سے متعلق ہوں لیکن اردو کے قاری کے لیے یہ ایک مشکل قرأت ہے اور لفظوں کا انشراح آسان نہیں۔

شمل نے اردو کے آغاز کی بابت من جملہ انھی تصورات و خیالات کی باز آفرینی کی ہے جو تاریخ کی دیگر ادبی کتب میں بالاستعیاب موجود ہیں، تاہم اس فرق کے ساتھ کہ محمود غزنوی کے ساتھ آنے والی سپاہ یا اس کے جوان یہاں بولی جانے والی مختلف زبانوں کو مجموعی طور پر کس طرح سے دیکھ رہے تھے اس بابت شمل کا بیان کچھ یوں ہے:

"In the beginning of 11th century, when the victorious soldiers of the Afghan ruler Mahmud of Ghazna, defender of Sunni Islam, invaded northern India, Prakrit (the middle Indian language which had naturally developed out of Sanskrit) had already lost its importance as a means of communication, and had been replaced by popular dialects, which in turn became the bases of most neo-Indian languages. In north-western India the

Sirhindi dialect (called after the city of Sirhind, from the Persian sar-I Hind, 'beginning of India') was widely spread; and in the plains, south and southeast of Delhi, Braj and Awadhi were spoken. A simplified form of these dialects was called khari boli, standard language. The Muslims who knew nothing or very little about the various indigenous idioms, called them simply hindawi, 'Indian'."3

ایسا صرف مسلمانوں ہی کی جانب سے نہیں ہوا کہ مقامی بولی جانے والی زبان کو ہندوستانی یا ہندوی کہا گیا بلکہ سترھویں (۱۷) سے انیسویں (۱۹) صدی کے وسط تک بیشتر مستشرقین بھی اردو کو اسی نام سے پکارتے رہے۔ مولانا محمد حسین آزاد، حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر مسعود حسین اور ڈاکٹر جمیل جالبی کے ہاں اردو کی ابتدائی صورتوں کی بابت مختلف النوع آراء ملتی ہیں تاہم سب اس امر پر متفق ہیں کہ اردو کی ساخت یا اس کا کینڈا مقامی زبانوں سے خمیر اٹھاتا ہے۔ کہیں اس کی پشت پر کھڑی بولی، پنجابی، اودھی، برج بھاشا، اپ بھرنش نظر آئی تو کبھی اس کے ابتدائی ماخذ دکن کی خود مختار ریاستوں کے مذہبی ادب میں تلاش کیے گئے۔ امیرانِ صدہ کی بغاوت کا معاملہ ہو یا عہدِ تغلق میں دارالخلافہ کی دولت آباد منتقلی، اردو کی ابتدائی نشوونما کی بابت بہت سے مفروضے اور تفحصات موجود ہیں اور ہر بڑے ماہر لسان نے اس ضمن میں مقدور بھر اسناد فراہم کی ہیں۔ غرض شمل نے اس بابت جو حقائق قاری کو فراہم کیے، وہ پہلے سے موجود مطالعات کی روشنی میں مرتب نظر آتے ہیں۔ اردو کے دیگر ادب شناسوں کی آراء کچھ یوں ہیں:

"ہماری زبان اردو برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے۔"۴

"زبانِ اردو اس ہندی یا بھاشا کی ایک شاخ ہے جو صدیوں دہلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی تھی اور جس کا تعلق شورسینی پراکرت سے بلاواسطہ تھا۔ یہ زبان جس کو مغربی ہندی کہنا بجا ہے، زبانِ اردو کی اصل اور ماں سمجھی جاسکتی ہے گو کہ "اردو" کا نام اس زبان کو عرصہ دراز کے بعد دیا گیا۔ زبانِ اردو کی صرف و نحو، محاورات اور کثرت سے ہندی الفاظ کا اس میں استعمال ہونا اس بات کی بین دلیل ہے کہ اس کی ابتدا ہندی سے ہوئی، اور یہ محض اتفاق تھا کہ وہ ہندوستان کی زبانِ عام بن گئی جس کی وجہ یہ ہوئی کہ دہلی جو اس زبان کا ابتدائی مرکز تھا مسلمان حملہ آوروں اور بادشاہوں کی جائے

ورود اور ان کا دارالسلطنت بنا ہوا تھا۔۔۔۔ برج بھاشا جو متھرا اور اس کے جوانب میں بولی جاتی تھی، گو اس بھاشا سے جو اطرافِ دہلی میں بولی جاتی تھی بہت مشابہت رکھتی ہے مگر پراکرت کی ایک علیحدہ شاخ ہے اور یہی شاخ یعنی دلی بھاشا ہمارے خیال میں زبانِ اردو کی اصل سمجھی جا سکتی ہے۔"۵

"سینتی کمار چیٹرجی کے نظریے میں ڈاکٹر زور کی مطابقت ملتی ہے۔ وہ اس خیال کی تائید کرتے ہیں کہ ۱۱۹۳ء میں فتح دلی کے بعد جس نئی بولی کا سلسلہ شروع ہوا اس کی بنیاد پنجابی اور مغربی اترپردیش کی مغربی اپ بھرنش پر تھی۔۔۔۔ اس زبان کی ابتدا تشکیل اور ارتقا میں فوجی مہمات کا گہرا دخل ہے۔ اس زبان کا لسانی سفر ان فوجی مہمات کے زیرِ سایہ طے ہوتا رہا ہے۔"٦

دیگر اہم مؤرخینِ ادب کی مانند شمل بھی، اردو کی ارتقائی منازل میں، صوفیاء کرام کے کردار کو خاص اہمیت دیتے ہوئے 'عین الدین گنج العلم' (۱۳۹۶ء۔۱۳۰۶ء) کو اردو زبان کا پہلا نثر نگار قرار دیتی ہیں جن کی زندگی کا بیشتر حصہ گجرات میں گزرا اور انتقال سے کچھ عرصہ پہلے بہمنی دربار سے متعلق ہوئے۔ صوفیانہ افکار کو ہندوی زبان میں منتقل کرنے والی اولیں شخصیت جو دہلی کے سلاطین کے ہاں بھی معروف تھی۔ ۷

شمل ، زبانِ اردو کی تشکیل میں جن مختلف شخصیات کو موضوعِ مبحث بناتی ہیں ان میں خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ (۱۴۲۲ء۔ ۱۳۲۱ء)، فخر الدین نظامی، شیخ محمد خوب چشتی، شمس العشاق شاہ میراں جی، برہان الدین جانم، امین الدین عالی کے علاوہ رزمیہ شاعری کے معروف شاعر کمال خاں رستمی شامل ہیں۔ شمل نے محض افراد و شخصیات کے نام لینے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ نظم و نثر کی معروف تخلیقات کی صراحت کرتے ہوئے ان کے جملہ خصائص پر روشنی ڈالی ہے، مثلاً نظامی کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ اور شاہ میراں جی کی 'شرحِ مرغوب القلوب'۔

اردو کی رزمیہ شاعری کی بابت شمل کا یہ تفحص لائقِ اعتنا ہے:

"It was at the court of the wealthy and powerful Adilshahs that the first artistic work of Urdu epic poetry was composed. Its author was Kamal Khan Rustami son of the secretary

of Sultan Muhammad Adilshah (1626-1656). In 1649 he wrote his Dakhni epic Hawarnama (Khawernama), ' Book of the East,' imitating Ibn Husam's Persian epic with the same name, composed in 1470; it was commissioned by Hadiga (Khadiga), Muhammad Adilshah's wife and Abdullah Qutbshah 's sister. With its 24000 lines it is one of the longest Dakhni matnawis; like its Persian model, it has been illustrated. In this poem Rustami takes over some motifs from Firdosi's Sahnama, like the stories of Gamsid and Bahman, Isfandiyar's son; yet, some themes are adapted from the heroic poetry of the Hindu poet Canda Bardai."8

اسی طرح مرزا محمد مقیمی (متوفی ۱۶۶۵ء) کا قصہ چندر بدن اور مہیار، حسن شوقی اور صنعتی کا قصہ بے نظیر، میراں ہاشم (متوفی ۱۶۹۷ء) کے مراثی، ملک خوشنود کا قصہ 'غمِ یوسفؑ اور زلیخاؒ، نصرتی کی گلشنِ عشق اور غواصی کی بدیع الکمال کو اپنے بیانیہ کا حصہ بناتے ہوئے شمل، علی عادل شاہ دوم اور محمد قلی قطب شاہ کی بابت کسی قدر اہم معلومات فراہم کرتی ہیں۔ کتاب کا پہلا باب جو اردو کے اولیں دور سے متعلق ہے، اہم شعراء اور نثر نگاروں کا تعارف لیے ہوئے ہے۔

شمل، قلی قطب شاہ کو اردو کا پہلا لوک (Folk) شاعر تسلیم کرتی ہیں اور ان کی شاعری کے جملہ خصائص نمایاں کرنے کی جستجو کرتی ہیں۔ جن دیگر ادبا اور شعراء کی بابت گفتگو ملتی ہے ان میں غواصی، نشاطی، وجہی اور ملک محمود جائسی اہمیت کے حامل ہیں۔ نصرتی کی بابت قدرے تفصیل موجود ہے غرض غواصی کی طوطی نامہ، ملاوجہی کی قطب مشتری اور سب رس سے فتاحی نیشاپوری کی تصنیف 'حسن و دل'، ابن نشاطی کی پھولبن، فائز اور تحسین الدین کی مثنوی کام روپ پر نقد و تحقیق پیش کرتے ہوئے لوک شاعری اور شعراء کی بابت تعارفی توضیحات یکجا کرتی ہیں۔ یہ دکنی ادب کا ایک مختصر انسائیکلوپیڈیا ہے جس کے منتخب اور لائقِ اسناد حوالہ جات ذیلی حاشیہ میں نظر آتے ہیں۔ دکن میں ابتدائی مرثیے کی بابت شمل کچھ یوں رقم طراز ہیں:

"Since the Deccani kingdoms were predominantly Shia, the commemoration of the tragic events of Kerbela in Muharram formed part and parcel of their religious institutions; in fact, Muhammad Quli Qutabsah is credited with the first Martiyas in Dakhni. This art was now developed and used to tell in touching verses the suffering of the Prophet's descendants, including the infant Asghar.- A beautiful example of expressiveness in the martiya by Hasim Ali which begins with the words

Woe, your bloodstained shroud, Asghar!

Woe, your thirst-parched mouth, Asghar!

Red is your rose-body Asghar!

Woe, for your childhood Asghar!......."9

یہ اقتباس گراہم بیلی اور ڈاکٹر مسیح الزماں کی اسناد لیے ہوئے ہے اور چونکہ یہ کتاب ایڈیٹر کی صراحت سے شمل کی طبع زاد نہیں ہے اس لیے ہم اس کی تحقیقی چھان پھٹک سے گریز کرتے ہوئے اجمالاً جائزہ ہی کو مکتفی سمجھتے ہیں؛ البتہ جہاں کہیں شمل کا ذاتی فہم تنقید کی ایک برتر صورت سامنے لاتا ہے اسے نشان زد کرنا ضروری ہے؛ اور یہاں یہ بات بھی واضح ہونی چاہیے کہ جسے ہم شمل کا فہمِ ذاتی قرار دے رہے ہیں وہ بھی قیاسی نوع کا ہے؛ اور اس کا سبب یہ ہے کہ کتاب میں یہ مذکور نہیں کہ کونسا حصہ کاملاً شمل کا لکھا ہوا ہے اور کون سا متصرف ہے۔ ولی دکنی کی بابت بہت سی اہم معلومات فراہم کرتے ہوئے شمل اردو کی کلاسیکی روایت کے پس منظر میں کچھ یوں خیال آراء ہیں:

"He was well enough versed in classical Islamic learning to invent witty puns with its terminology:

Every night, your long tresses are treated with the mutawwal

When one sees your mouth one makes the word short (mukhtasar).

Mutawwal, the long one, and Mukhtasar, the short one, are two commentaries by the medieval scholastic philosopher Taftazani for Sakkaki's Miftah al-ulum; the tresses are very long, and black as night, the mouth, seen at day time, is exceedingly small."10

کتاب کا بابِ دوم ۱۷۰۰ء سے ۱۸۵۰ء تک ادبی سفر کا احاطہ کرتا ہے اور یہاں ایک بار پھر ملک محمد جائسی کی پدماوت سے شمال میں اردو کے ابتدائی شاعر صدرالدین محمد فائز کی بابت بات کرتے ہوئے اہم تاریخی وقوعات کا عکس پیش کیا گیا ہے یعنی اورنگ زیب کی وفات سے بہادر شاہ ظفر تک کے جملہ سیاسی معاملات صراحتاً مذکور ہیں۔ فائز کی بابت شمل کا کہنا ہے کہ عہدِ ولی ہی میں ان کا دیوان ۱۷۱۴ء میں مرتّب ہو چکا تھا اور پھر اردو کے چار اہم ستون اور ان کے مقلدین کا ذکر کرتے ہوئے خان آرزو (متوفی ۱۷۵۶ء)، شاہ مبارک نجم الدین آبرو (متوفی ۱۷۴۷ء) اور دہلی کے ابتدائی شعراء کو تسوید کا حصہ بناتی ہیں، اور ذیلی حاشیہ میں مصادر کی جمع آوری نظر آتی ہے۔ اردو کے چار اہم ستون کی بابت شمل یہ وضاحت کرتی ہیں کہ مولانا حسین آزاد نے ان میں جن مشاہیر کو شامل کیا وہ مرزا مظہر جانِ جاناں، میر دردؔ، میر تقی میر اور مرزا رفیع سوداؔ ہیں۔ پیش آیندہ ناقدینِ ادب نے جزوی تبدیلی کی اور مرزا مظہر جانِ جاناں کے بدل میں میر حسن کو اہم گردانا اور یوں اردو سے جڑی ہندوستان کی ادبی زندگی کی چار مختلف سمتیں نمایاں ہو گئیں۔

شمل کی تحریر ادائیگیٔ تلفظ کے باعث بار بار متاثر ہوتی ہے اور یوں افراد و شخصیات، مقامات اور تصانیف تک کے اسماء کی شناخت، کارِ دشوار ہے۔ یہ کتاب کا بڑا اسقم ہے۔

اس کتاب میں اسلام اور بانیٔ اسلام کی بابت اخلاص موجود ہے۔ خواجہ میر دردؔ کے حوالہ سے بات کرتے ہوئے شمل کچھ یوں گویا ہیں:

“Most people who praised Dard’s modesty, poverty, and austere but heart-winning behavior were probably not aware that this poet regarded himself as the renovator of the unalloyed religion of Muhammad.”11

دینِ محمد ﷺ کے لیے لفظ 'unalloyed' کا استعمال کس قدر لگاوٹ لیے ہوئے ہے۔ یعنی شمل اسلام کو بے آمیزش اور خالص دین کے طور پر شناخت کرتی اور کراتی ہیں۔ دردؔ کے بعض شعروں کا ترجمہ بھی مرقوم ہے اور ذیل میں دیے گئے شعر کا ترجمہ انتہائی موزوں ہے۔

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا

برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

“When I could not see Thee and all Thy majesty,

I do not care if I saw the world or did not see....”12

اردو کے وہ اہم تذکرے جن کا حوالہ ادبی تواریخ میں بکثرت موجود ہے اور جنھیں معتبر جانا گیا ہے میں میرؔ کا نِکات الشعراء، علی حسین گردیزی کا تذکرہ ریختہ گویاں اور قائم چاند پوری کا مخزنِ نکات شامل ہے۔ کتاب میں ان کا ذکر اجمالاً موجود ہے؛ علاوہ ازیں جن مثنویوں کو گفتگو کا حصہ بنایا گیا ان میں محمد اسمٰعیل طپش کی بہارِ دانش اور میر اثرؔ کی خواب و خیال خاص طور سے مذکور ہے۔ میرزا رفیع سوداؔ کی بابت قدرے تفصیل ملتی ہے۔ ان کی شاعری کے جملہ خصائص نشان زد کرتے ہوئے شہر آشوب کے بارے اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں؛ البتہ تلفظ کے حوالہ سے یہاں بھی اشکال جنم لیتے ہیں اور قاری کو دقت کا سامنا ہے۔ سوداؔ کی مرثیہ نگاری کی صراحت میں، وہ انھیں اس صنف میں رجحان ساز قرار دیتی ہیں کہ اردو مرثیہ میں مسدّس کی ہیئت متعارف کرانے میں ان کو تفوق ہے اور آئندہ ایک سو پچاس برسوں کے لیے انھوں نے ایک مخصوص صنفی طریقہ کار کی داغ بیل ڈال دی۔[۱۳]

میر تقی میرؔ کے حوالہ سے محا کمہ موجود ہے۔ میرؔ کی غزل اور مثنویات کو مبحث کا حصہ بناتے ہوئے بہت سے اہم اشعار انگریزی میں نقل کیے ہیں اور جامع اسناد فراہم کی ہیں، مثلاً میرؔ کے تغزل کی بابت قریباً بارہ(۱۲) سے زائد اہم حوالہ جات صفحہ ۱۷۸ پر ذیلی حاشیہ میں موجود ہیں۔ میرؔ کے وہ چند اشعار جن کو انگریزی کے قالب میں ڈھالا گیا ہے ان میں ایک اہم شعر کا موزوں ترجمہ کچھ یوں ہے۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے

دردو غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

Don't call me a poet-for I have collected

Much grief and much sorrow to make it a diwan! 14

تاہم کسی مقام پر شعر کا ترجمہ بے محل معلوم ہوتا ہے، مثلاً یہ شعر اور اس کا انگریزی ترجمہ دیکھیے۔

پتہ پتہ، بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے

جانے نہ جانے گل ہی جانے، باغ تو سارا جانے ہے

Leaf by leaf and plant by plant has known our state;

Whether they know, whether they don't even though the rose may not know-yet the whole garden knows it...15

مترجم انگریزی ترجمہ کے دوسرے مصرعہ میں لفظ they کا استعمال فہم سے بالا ہے البتہ پہلا مصرعہ ترجمہ کی اچھی نظیر ہے۔ میرؔ کی مثنویوں کی بابت ایک قدرے مختلف اور وقیع تفحص کچھ یوں ہے:

"The same trend to melancholia on the one hand and to the repetition of favourite phrases or key words on the other is visible in Mir's matnawis. All of these lyrical scenes are rather short, between 234 to 297 verses. The Mu amalat-I isq is, as we have mentioned, probably a kind of autobiography of an unhappy love affair. The tragic end of the stories recall the folktales of the Punjab and Sind, which always end with the lovers' death: during Mir's lifetime some Punjabi tales were retold in Urdu poetry, such as the legend of Saussi-Punhun by Mahabat Khan. His matnawis often begins with long chains of repetitions: Su 'la-yi Isq, 'The Flame of Love', partly translated by Garcin de Tassy...."16

میر تقی میرؔ کے بعد شمل میر حسن اور اٹھارہویں صدی عیسوی کے ایک معروف شاعر کی سرخی تلے نظیر اکبر آبادی کی بابت بات کرتے ہوئے ان کا بین البر اعظمی مقام متعین کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور اے -بوسانی(A. Bausani) اور معروف روسی اسکالر Glebov کی نظیرؔ میں ذاتی دلچسپی کے معاملات سامنے لاتی ہیں کہ کس طرح مذکورہ شخصیات نے ان کی شاعری کو عالمی سطح پر متعارف کرایا، اور بہتر نقد پیش کیا۔ اسی باب میں لکھنؤ کے نوابین کی بابت بہت سی اہم معلومات ملتی ہیں اور لکھنوی معاشرت کا تقابل سلطنتِ عثمانیہ کے دورِ گلِ لالہ (Tulip Period) سے کیا جو اٹھارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں کچھ وقت کے لیے سامنے آیا(۱۷۳۰-۱۷۱۸ء) اور پھر منظر سے ہٹ گیا۔

لکھنوی معاشرت سے جڑے شعراء میں میر سوزؔ، غلام ہمدانی مصحفیؔ، انشأاللہ خاں انشأ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ضمناً مرثیہ نگار ضمیرؔ اور خلیقؔ کا تعارف کراتی ہیں اور خاص طور سے مصحفی اور انشأ کی اہم تصانیف رانی کیتکی اور دریائے لطافت پر توضیحی مباحث رقم کرتی ہیں۔ ریختی کے موضوع پر نواب سعادت یار خان رنگینؔ اور میر علی یار خان جان صاحب کی بابت اہم معلومات سامنے آتی ہیں علاوہ ازیں مرزا نظام الدین ممنونؔ، شاہ نصیر الدین ناصر، امام بخش ناسخؔ، علی اوسط رشک، وزیر علی صباؔ، سیّد محمد خان رندؔ، تصدق حسین شوقؔ، آغا جو شرفؔ، دیاشنکر نسیم، فضل علی

فضلی، خلیق اور مظفر حسین ضمیر کے باہم تقابل میں عالمی منظر نامہ پیش کرتی ہیں اور یہی اس کتاب کا اختصاص ہے کہ گلزارِ نسیم کا تذکرہ ہو یا مرثیہ نگاری کا، شمل جو معلومات بہم پہنچاتی ہیں وہ انتہائی منفرد ہیں۔ گلزارِ نسیم اور اودھ میں مرثیہ نگاری کے حوالہ سے شمل کچھ یوں گویا ہیں:

"The most important member of Atis's group is the Hindu Daya Sankar Kaul Nasim (1811-1843)........He wrote his famous matnawi Gulzar-I Nasim 'Zephir's Rose-garden' in 1837, based on Nihal Cand's prose version of the Madhab-I isq, in the hope to become as successful as Mir Hassan. Garcin de Tassy's translation made this book as ' Rose of Bakawali' known in Europe........That the authors (Mersia Writers) ' confused anachronistically the emotional and social, and to a large extent geographical, milieu of the Ist/7th century Iraq with 19th century Awadh' seems to me, not more blameworthy than European painters' representation of biblical scenes in Flemish or Italian environment."17

اردو داستان کے تعارف میں شمل، میر امن کی باغ و بہار کی بابت قریباً خاموش ہیں۔ خلیل علی خان اشک کی داستانِ امیر حمزہ اور رجب علی بیگ سرور کی فسانۂ عجائب کی بابت کسی قدر صراحت موجود ہے، لیکن میر امن کو جس طرح سے نظر انداز کیا گیا ہے، اس کی کوئی معقول توجیہہ میسر نہیں؛ اور جو معمولی ساذکر ہے وہ بھی فسانۂ عجائب کے ضمن میں ہے۔ اسی طرح ترجمہ کے جملہ محرکات کی نشاندہی کرتے ہوئے گلکرسٹ کی ہندوستانی ڈکشنری کا حوالہ سامنے آتا ہے اور فورٹ ولیم کالج میں شائع ہونے والی کتب کے مصادر و منابع سے شناسائی ہوتی ہے۔ ان کے ہاں، اس حوالہ سے، ایک مخصوص طریقہ کار ملتا ہے:

"Another book of a similar moralist character, and also of Sanskrit origin, is the Tutinama, 'The Parrot's Book first brought into Persian by Nahsabi (Nakshabi) in the 14th century,

and elaborated in Dakhni by Gawwasi...Its most successful Urdu adaptation is Mir Muhammad Bahs (Baksh) Haidari's (d. 1823) Tota Kahani (1801), based on 17th century version by Muhammad Qadiri; it was often printed and later translated into Sindhi. Haidari translated also Husain Waiz Kasifi's Rauzat as-suhada' as Gul-I magfirat 'Rose of forgiveness' (1812)."18

تذکرہ نگاری، لارڈ میکالے کی پالیسی اور اس کے نتیجے میں اردو کا فروغ اور پھر 'جامِ جہاں نما' ایسے رسائل کی بابت گفتگو کے اہم پیرائے موجود ہیں۔ باب کے اختتام میں اندر سبھا کی اہمیت خاص طور سے اجاگر کی گئی ہے۔ شمل اس ضمن میں کسی قدر سیر حاصل گفتگو اپنی کتاب German Contributions to the Study of Pakistani Linguistics. Hamburg میں کر چکی ہیں یہاں ان کا اعادہ تضیع اوقات ہے۔

کتاب کا تیسرا باب عہدِ غالبؔ سے اقبالؔ کو محیط ہے۔ کلاسیکی شاعری کے اختتام کی ذیلی سرخی تلے غالبؔ اور کلامِ غالبؔ کا مطالعہ پیش کرنا فہم سے بالا ہے کہ ہماری پوری انیسویں صدی، شعری سطح پر، کلاسیکی آثار لیے ہوئے ہے ایسے میں کلاسیکی عہد کے خاتمہ کا نقارہ بجا دینا غیر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہاں شمل سے ایکبار پھر غالبؔ کے تلمذ کی بابت چوک واقع ہوئی کہ اس نوع کی غلطی وہ اپنی کتاب A Dance of Sparks- Imagery of Fire in Ghalib's poetry میں کر چکی ہیں۔ غالبؔ کی بابت ایک پھیلا ہوا تحقیقی و تنقیدی بیانیہ پڑھنے کو ملتا ہے۔ علاوہ ازیں جن دیگر شعراء پر نقد موجود ہے ان میں مومن خان مومنؔ اور مرزا داغؔ دہلوی نمایاں ہیں۔ مصادر اور اسناد کی ذیل میں دی تاسی اور گراھم بیلی کا نام بکثرت پڑھنے کو ملتا ہے۔ باب کے اسی حصہ میں The Reformist کے عنوان سے اصلاح پسندوں کے احوال سے تعارض نظر آتا ہے۔ سر سیّد، آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد کی بابت قدرے توضیحی علمی نکات موجود ہیں اور ان اصحاب کی جملہ مساعی ہدفِ نگاہ بنائی گئی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے بارے میں ذیل کا اقتباس اہمیت کا حامل ہے:

"The University of Edinburgh conferred upon him an honorary LL.D in recognition of his services to modern Urdu prose. Nadir Ahmed was basically a translator who rendered English legal texts into Urdu, such as the Penal Code, the Income Tax Act, and the Indian Evidence Act. He wrote on Islamic law and published a good translation of the Quran without supplying the Arabic original. His activity in the rather uninspiring field of legal translation gave him the background for his novels which Centre around educational problems."19

اس عہد کے دیگر نامور لکھنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے شمل اہم علمی معلومات سامنے لاتی ہیں۔ رتن ناتھ سرشار، شرر اور رسوا کی جملہ کارگزاریوں کا ایک پُر اثر مرقع دیکھنے کو ملتا ہے؛ البتہ میر امن کی طرح منشی پریم چند کی بابت گفتگو انتہائی معمولی ہے اور ان کا ذکر محض تبرکاً موجود ہے؛ اور پھر یہ کہ ان کا سنِ وفات غلط طور پر مرقوم ہے یعنی اکتوبر ۱۹۳۶ء کی بجائے ۱۹۳۰ء تحریر کیا گیا ہے۔ شمل کی یہ رائے بھی محلِ نظر ہے کہ انھوں نے صرف ۱۹۱۴ء تک اردو کہانیاں لکھیں۔۲۰ سجاد حیدر یلدرم اور پارسی تھیٹر کے بارے میں مناسب اور دلچسپ خیالات کا اظہار ہے کہ کس طرح معروف پارسی ڈرامہ نگار نوشیرواں جی مہرواں جی آرام نے میر حسن کی مثنوی سے اپنے ڈرامہ بے نظیر و بدرِ منیر کی صورت گری کی۔

عبوری دور کے ادباً کی ذیلی سرخی تلے جن شعراءاور مشاہیر کے نام ملتے ہیں ان میں محمد اسمٰعیل میرٹھی (۱۹۱۷ء۔۱۸۴۴ء) نظم طباطبائی(۱۹۳۳ء۔۱۸۵۲ء)منشی احمد علی شوق قدوائی، منشی درگاہ شاہی سرور، تلوک چند محروم، پنڈت برج نرائن چکبست، علی برادران اور ان کی جملہ مساعی (صحافت اور سیاست کے میدان میں)،مزید براں مولانا ظفر علی خان، سر عبد القادر، خوشی محمد ناظر،شاہ دین ہمایوں، سید امداد حسین امداد،سید علی محمد شاد عظیم آبادی، یاس یگانہ چنگیزی،سید علی نقی زیدی سیفی، مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی،سید نوّاب انوار حسین آرزو لکھنوی جو غزل سے تھیٹر ڈرامہ اور بالآخر بمبی فلم انڈسٹری سے منسلک ہوگئے کے علاوہ فانی بدایونی،اصغر حسین گونڈوی، علی

سکندر جگر مراد آبادی، سید فضل الحسن حسرت موہانی، وحشت رضا علی کلکتوی اور اثر لکھنوی شامل ہیں۔ حسرت موہانی کے بارے میں اوروں کی نسبت کسی قدر صراحت ہے۔ شعراء اور ادبأ کے علمی اور ادبی کمالات کا تعین کرتے ہوئے مصادر و منابع، ذیلی حاشیہ میں بکثرت پیش کیے گئے ہیں۔ شمل نے باب کے اس حصہ میں قریباً ۱۹۵۰ء اور ٦۰ء تک کے ادبی عہد کو شامل کیا ہے اور خاص طور سے صنفِ غزل کو مرکزِ نگاہ بنایا۔ بنیادی طور پر یہ تعارف مغرب کے قاری کے لیے ہے؛ اگرچہ اہم مصادر اور ان کا بکثرت مرقوم ہونا غیر معمولی بات ہے اور یہ اردو کے قاری اور ایک سنجیدہ محقق کے لیے معتبر حوالہ جات ہیں۔ اس سے نہ صرف کتاب کی وقعت بڑھتی ہے بلکہ استفادے کی ایک سے زائد صورتیں جنم لیتی ہیں۔

ڈاکٹر محمد اقبالؔ کی ذیلی سرخی تلے جو مبحث موجود ہیں وہ متعدد صفحات کو محیط ہیں۔ اردو ادب میں یہ شمل کا پسندیدہ ترین موضوع ہے۔ حضرت خواجہ میر دردؔ اور غالبؔ کے حوالہ سے اہم اور جدا کتب موجود ہیں تاہم جس شخصیت سے شمل والہانہ لگاؤ رکھتی ہیں وہ اقبالؔ ہیں، اور ہم جانتے ہیں کہ اقبالؔ سے شمل کی وابستگی کی اساس مولانا رومؒ ہیں جو منصور حلاجؒ کے بعد مسلم صوفیاء میں، شمل کی محبت کا مرکزہ ہیں۔ اس ضمن میں ہم بیسویں صدی کے اوائل میں ان تہذیبی و سیاسی عوامل کو نظر انداز نہیں کر سکتے جو ترکی اور جرمنی کے مابین فروغ پا رہے تھے۔ جرمن ادبا کا مشرق اور اس کی سریت سے حظ اٹھانے کا سلسلہ قریباً اٹھارہویں صدی کے اواخر سے شروع ہوتا ہے اور زندگی کی متحرک تعبیروں سے متحد ہوتے ہوئے بیسویں صدی کی آخری دہائیوں کو جالیتا ہے۔

شمل نے اس حصہ میں چند حوالے اپنی کتاب Gabriel's Wing سے دیے ہیں، دیگر مصادر میں ڈاکٹر سید عبد اللہ، یوسف حسین خان، جے مارک، بی اے ڈار، اے بوسانی، آر۔ اے نکلسن اور اے۔ جے آربری کے نام نمایاں ہیں۔ راقم کتاب کے اس ذیلی حصہ سے اعراض برتتے ہوئے اختتام پر ہونے والی گفتگو کو سمیٹنا چاہتا ہے کہ فکر اقبالؔ پر ہم جدا سے سیر حاصل مبحث پیش کر چکے ہیں اور یہاں ان کا اعادہ غیر مناسب ہے۔

اقبالؔ کے علاوہ سرسری طور پر جن شعراء کا ذکر ہوا ان میں حفیظ جالندھری، حفیظ ہوشیار پوری اور جوش ملیح آبادی
خاص طور سے شامل ہیں۔

حواشی

حصہ چہارم: باب سوم

1: Schimmel, Annemarie. "Classical Urdu Literature from the beginning to Iqbal." Jan Gonda. Edit. A History of Indian literature. Wiesbaden: Otto Harrassowitz, 1975

2: Ibid. p. 129.

3: Ibid. p.127, 128

۴: محمد حسین آزاد۔ آبِ حیات۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء ص ۱۰

۵: رام بابو سکسینہ۔ تاریخِ ادبِ اردو۔ کراچی: غضنفر اکیڈمی پاکستان، ۲۰۰۱ء ص ۲۶،۲۵

۶: تبسم کاشمیری، ڈاکٹر۔ اردو ادب کی تاریخ۔ ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء ص ۲۲

7: Schimmel, Annemarie. "Classical Urdu Literature from the beginning to Iqbal". p.132

8: Ibid. p.137

9: Ibid. p.151

10: Ibid. p.154, 155

11: Ibid. p.171

12: Ibid. p.172

13: Ibid. p.178

14: Ibid. p.180

15: Ibid. p.182

16: Ibid. p.183

17: Ibid. p. 199, 200

18: Ibid. p.209

19: Ibid. p.231

20: Ibid. p.235

بابِ چہارم

الٰہیات، تصوف، تہذیب و ثقافت، فنونِ لطیفہ اور تاریخ

باب کے اس حصہ میں شمل کی اہم متفرق کتب کا اجمالاً جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔ اس سے نہ صرف کتب کا تعارف ممکن ہو گا بلکہ ان میں موجود مواد سے بھی خاطر خواہ استفادے کا موقع حاصل ہو گا۔ اس بابت یہ احتیاط ملحوظ ہے کہ صرف وہ کتب جزوی طور پر مبحث کے دائرہ میں لائی جائیں جو شمل کی شناخت کا معتبر حوالہ ہیں؛ اور یہ اس لیے بھی کہ یہ کتب، اردو ادب سے براہِ راست متعلق نہیں چنانچہ ان کے جزوی مطالعہ ہی کو موزوں خیال کیا گیا ہے۔

شمل کی بیشتر کتب ان کے وہ لیکچرز ہیں جو اُنھوں نے وقتاً فوقتاً دنیائے اسلام اور مغرب میں خصوصی دعوت یا بلانے پر دیے۔ تعارفِ کتب میں فکری و معنوی ترتیب کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے اور یہ اہتمام بھی ہے کہ کتب کے اہم مندرجات یا نکات نمایاں ہوں تاکہ شمل کی علمی صلاحیتوں کا ایک مرقع کسی قدر مرتب ہو۔ یہ کتب مسلم الٰہیات، تصوف، تہذیب و معاشرت، ادب، فنونِ لطیفہ اور تاریخ سے متعلق ہیں۔ چند کتابیں تراجم سے متعلق ہیں اور معدودے چند مولانا رومؒ کی شخصیت اور فکر کا احاطہ کرتی ہیں۔ یہ کتابیں اپنے موضوع، متن اور پیش کردہ مواد کے سبب خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کے مصادر و منابع اور ان میں موجود معلومات، سیر حاصل نقد اور تحقیق کو سزاوار ہیں۔ ان کتب کو کسی ایک ضابطے یا فکری قرینہ میں رکھ کر پرکھنا آسان نہیں۔ ان کے مطالعات منفرد، جدا اور متنوع ہیں۔ کسی ایک محقق یا ناقد کے لیے ان تمام کتب پر مبحث پیش کرنا قریباً ناممکنات میں سے ہے۔ ایک ناقد کے لیے بیک وقت عربی، فارسی، اردو، سندھی اور انگریزی و جرمن ادب کے علاوہ مسلم تہذیب و ثقافت، اسلامی تاریخ، قرآن و حدیث اور فنونِ لطیفہ پر مکمل گرفت کارِ دشوار ہے۔ شمل کا علمی و فکری مطالعہ کسی ایک عہد، جغرافیہ، قوم یا معاشرت سے جڑا ہوا نہیں۔ وہ ایک ایسی مستشرقہ ہیں جن کے ہاں ولیم جونز کی سی تحقیقی تکثیریت نظر

آتی ہے۔ اسلام، تصوف اور مسلم ادب و ثقافت جو ان کا موضوعِ خاص ہے کسی ایک خطے، مقام، علاقے یا مسلک میں محدود نہیں۔ انھوں نے اسلام کو مجموعی طور پر جاننے، سمجھنے اور متعارف کرانے کی جستجو کی، اور اسے ایک زندہ مذہب کے طور پر شناخت کیا جو کسی ایک علاقہ یا مقام کی تحدید میں زاروزبوں نہیں بلکہ اس کا آفاقی پیغام، کرہ ارض کے طول و عرض کو جالیتاہے اور نہ ہی کسی ایک فرقہ یا مسلک سے اس کی آبیاری ممکن ہے؛ شاید یہی سبب ہے کہ وہ اسلام کی مختلف جہات اور سمتوں کے تعین میں فراخی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی سوچ کو حدِّ تعین سے ماورا، رکھتی ہیں۔ غرض اسلام کو اس کی جامعیت اور مختلف جہتوں سے جاننے کی سعی میں ان کا مطالعہ اور تدبر کئی جغرافیوں کو یکجا کر دیتاہے، خاص طور سے مشرق کو مغرب سے جوڑنے میں جو مہارت انھوں نے پیش کی، اُس کی نظیر تلاش کرنا اتنا آسان نہیں۔

شمل کی وہ پہلی کتاب جو اقوام عالم سے دادِ تحسین سمیٹتی ہے وہ Mystical Dimensions of Islam ہے۔ جو پہلی بار ۱۹۷۵ء میں یونیورسٹی آف نارتھ کیرولائنا سے شائع ہوئی۔ راقم کے پیشِ نظر جو ایڈیشن رہا وہ سنگِ میل پبلی کیشنز سے ۲۰۰۳ء کو شائع ہوا۔ قریباً آٹھ ابواب پر مشتمل یہ متصوفانہ بیانیہ ہر جہت سے جامع و کامل نظر آتا ہے تاہم شمل کو اپنی نارسائی کا اعتراف ہے:

"Thus to set out and delineate some main features of Sufism, both historically and phenomenologically, will yield no result that satisfies everybody: it is easy to overlook certain aspects and give much weight to others. The amount of oriental and occidental literature existent in print and in manuscript is beyond counting, so that even from this viewpoint a full account is not to be achieved."1

تاہم جس بہتر انداز پر انھوں نے یہ مطالعہ پیش کیا وہ ان کی شناخت کا معتبر حوالہ ہے۔ کتاب کے دیباچہ میں شمل خصوصی طور پر اپنی والدہ کا شکریہ ادا کرتی ہیں جو مسودے کی تکمیل میں مسلسل ان کی ڈھارس بندھاتی رہیں۔ یہ

کتاب کلاسیکی تصوف اور اس کے تشکیلی دور، نویں صدی عیسوی کی اہم شخصیات، منصور حلاجؒ، امام غزالیؒ اور تصوف کے مختلف مدارج و مراتب، موضوعاتِ عشق و فنا، طُرُقِ عبادت، صوفی نفسیات، معاملاتِ خیر و شر اور ابلیس، صوفیانہ کرامات اور تعظیمِ نبی ﷺ ایسے موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی تعظیم سے متعلق کتاب کے بابِ چہارم میں ذیلی سرخی تلے جو عنوان موجود ہے وہ بعد میں باقاعدہ ایک اہم تصنیف کی صورت مرتب ہو کر سیرت نبویؐ کے باب میں ایک اہم اضافہ کی اساس بنتا ہے۔ ہماری مراد AND MUHAMMAD IS HIS MESSANGER-THE VENERATION OF THE PROPHET IN ISLAMIC PIETY ہے جو اپنے منفرد موضوعات کے سبب قاری کو متاثر کرتی ہے؛ مزید براں بحیثیت قوم مسلمانوں کا طرزِ زیست اور صوفیا کرام کے مختلف سلسلوں کی بابت اہم صراحتیں موجود ہیں۔ ابو سعید ابوالخیرؒ، حضرت سہروردی مقتولؒ، حضرت ابنِ عربیؒ، ابن الفریدؒ، وحدت الوجودی مباحث، ترکی و فارس کی صوفیانہ شاعری، لافانی گلاب، پرندوں کی زیارت، حضرت سنائیؒ، عطّارؒ، رومیؒ، انڈو پاکستان میں تصوف کا کلاسیکی عہد، نقش بندی مزاحمت، میر دردؔ بحیثیت مخلص محمدیؐ ایسے متفرق موضوعات ہیں جن میں ایک باہمی فکری ربط موجود ہے اور یہ کتاب کی وقعت میں اضافہ کرتے ہیں۔ حضرت خواجہ میر دردؔ اور شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اُن دونوں بزرگ ہستیوں کی بابت ایک جدا کتاب بعنوان 'دردؔ اور شکوہ' شمل پیش کر چکی ہیں۔ ان کے علاوہ علاقائی زبانوں یعنی سندھی، پنجابی اور پشتو میں صوفیانہ شاعری اور اس میں موجود علامتی رموز اور نسائیت کی بابت اہم گفتگو دستیاب ہے۔ غرض اپنے شش جہتی موضوع کے حوالہ سے یہ کتاب ادبیاتِ عالم کا اہم ورثہ قرار پاتی ہے۔ اس کتاب میں آیاتِ قرآنی کی پیش کش اور ان سے تخریج کے متعدد اہم پیرائے دیکھے جا سکتے ہیں۔ شمل جس سہولت سے آیات کو اپنی تحریر میں سمیٹتی ہیں اُس سے اِن کے قرآنی تبحر کا اندازہ بہ سہولت ہوتا ہے:

"They read that God is closer to man than his Jugular vein (Sura 50:16) and is, at the same time, the lord and Creator of the Universe, immanent and transcendent. 'The sights do not reach him'. (Sura 6: 103), but, 'withsoever ye turn there is the Face of God' (Sura

2: 109). God has 'put signs into nature and into the human soul' (Sura 51: 21), and it is necessary to see and to understand them."2

اس طرح شمل ایک ایسی صورتحال کی وضاحت کرتی ہیں جو اقبالؔ کے یورپ میں قیام کے دوران پیدا ہوئی؛یعنی اقبالؔ کے ہاں چند ایسے اشکال جنم لے رہے تھے جو صراحت کا اقتضار کھتے تھے۔ اپنے پی۔ ایچ۔ڈی مقالہ، ایران میں فلسفہ مابعد الطبیعیات کے ارتقا کی تسوید کے لیے وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ قرآنِ مجید کی وہ کون سی آیات ہیں جو صریحاً تصوف سے متعلق ہیں اور مسئلہ وحدت الوجود کی مؤید ہیں ؟ تاریخی اعتبار سے اسلام اور تصوف کے باہمی تعلق کی نوعیت اور نبی اکرم ﷺ کا حضرت علیؓ کو خصوصی تعلیم دینے کی بابت وہ منقولی اور مفصل جواب چاہتے تھے۔ خواجہ حسن نظامی کو یہ استفسارات، خط کی صورت ۱۸ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو بھیجے گئے اور اس میں یہ استدعا شامل تھی کہ شاہ سلیمان پھولواری صاحب سے بھی صلاح لی جائے۔ غرض شمل نے ان امور کی وضاحت مذکورہ کتاب میں کی اور یہ واضح ہے کہ خواجہ حسن نظامی کے جواب سے اقبالؔ کچھ زیادہ مطمئن نہ ہوئے۔ شمل نے مخفی دانائی کا خاندانِ رسالتمآب ﷺ میں فروغ اور صوفیا کا ان سے مستفید ہونا اور استنباط کرنے کی بابت کچھ یوں گفتگو کی:

"According to the tradition, esoteric wisdom was transmitted from Muhammad to his Cousin and son-in-law 'Ali ibn Abi Talib, the fourth of the righteous caliphs (d.661). Other members of His family and His friends, according to legend, were endowed with mystical insight or pursued mystical practices. The traditions (hadith) that go back to the Prophet, or at least attributed to him, served the Sufis when they elaborated their own definitions of the various stages and states."3

مغرب میں نبی اکرم ﷺ کی بابت صدیوں تک فروغ پاتی مذموم تحریک کے آثار نمایاں کرتے ہوئے شمل تصوف کے ابتدائی خراسانی صوفیا یعنی حضرت شقیق البلخیؒ (م۔۸۰۹ء)، آپؒ کے مرید حضرت حاتم العاصمؒ (م۔۸۵۱ء) اور

ان کے شاگرد ابوتراب النخشبیؒ(م۔۸۵۹ء)کا حوالہ دیتے ہوئے حضرت رابعہؒ بصری کا خصوصی تعارف پیش کرتی ہیں؛علاوہ ازیں حضرت امامِ جعفر صادقؓ اور قرآنِ حکیم کی بابت بہت سے لطیف نکات سامنے لاتی ہیں:

"Jafar discerned the four different aspects of the Koran: expression, for the common people; allusion, for the privileged or elite; touches of grace (lata if), for the Saints; and finally the "realities" for the Prophets.....as Jafar's modern interpreter states, "the language of experience becomes the language of love." That means that before the time of Rabia the first steps were taken in the direction of authentic love mysticism. The definition of divine love as given by Jafar, and often repeated by later mystics, is this: "a divine fire that devours man completely."4

متصوفانہ تقابل میں شمل جرمن الٰہیاتی مفسر رودولف اوٹو(Rudolf Otto)اور حضرت ذوالنونؒ کے افکار پیش کرتی ہیں۔

رودولف اوٹو اپنے تصورِ تطہیر کے حوالہ سے خاص شہرہ رکھتے ہیں۔ان کی بابت گفتگو کرتے ہوئے حضرت ذوالنونؒ کے تصور جلال(Tremendum)اور جمال(Fascinans)کی لطیف پیرایوں میں گرہ کشائی کرتی ہیں۔اسی طرح معروف صوفی بزرگ حضرت یحیٰؒ کے وسیلہ سے وصل کی حالتِ ارفع پیش کرتی ہیں جو صدیوں سے صوفیا اور ان کے معتقدین کے لیے ذاتِ برحق سے اتصال کی منفرد صورتِ واقعہ ہے اور جو ادب میں آج بھی ایک صوفی ایقان کی نظیر رکھتی ہے؛یہی سبب ہے کہ اللہ کے برگزیدہ بندوں کے رحلت فرما جانے پر ہم انتقال یا وفات ایسے الفاظ استعمال نہیں کرتے بلکہ وصال کا لفظ برتتے ہیں اور ہر سال، عرس کے موقع پر یومِ وصال کا عددی شمار ہوتا ہے۔

صوفیانہ تعلیم کے ضمن میں شمل صیغۂ واحد کے استعمال پر جو مروج تفہیم پیش کرتی ہیں اس کے مطابق یہ اختیار صرف ذاتِ حق کو حاصل ہے، کوئی دوسرا، اس بلند مرتبہ گفتار کا اہل نہیں ہو سکتا۔ یہ اندازِ تکلم، ذاتِ حق کے سوا اور کسی کے شایاں بھی نہیں۔ صوفیانہ افکار کے تقابل میں شمل کہیں کہیں عصبیت کا شکار ہوتی ہیں:

"Nuri's description of the seven citadels, surrounded by seven ramparts and a wall, as God has built them in the heart, is somewhat reminiscent of St. Theresa's Interior Castle, though the Baghdad Sufi does not reach the psychological depths of the great Carmelite nun."5

معروف ہسپانوی کیتھولک صوفیہ ٹیریسا(Teresa of Avila) کی فکری وسرّی عظمت بجا لیکن یک جنبشِ قلم سے یہ کہہ دینا کہ وہ بغداد کے ایک بلند مرتبہ صوفی پر تفضل رکھتی تھیں، مناسب نقد نہیں۔

منصور حلاجؒ جو شمل کی پسندیدہ ترین شخصیات میں سے ایک ہیں یہاں بھی خصوصی توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔ شمل کی یہ کوشش ہمیشہ رہی کہ وہ اپنے ممدوح کا تعارف بھرپور اور خوبصورت انداز پر کرائے؛ اور ان غلط فہمیوں پر سے پردہ اٹھے جو ممدوح کی شخصیت کو دھندلاتے ہیں۔ شمل نے یہ بھی نمایاں کیا کہ حلاجؒ کو شہید کرنے کا سبب ان کا اناالحق کہنانہ تھا بلکہ اس کے پس پردہ مخصوص سیاسی و معاشی عوامل تھے جو ان کی شہادت پر منتج ہوئے۔ شمل کی جانب سے یہ صراحت بھی موجود ہے کہ حلاجؒ کے افکار، وحدت الوجودی اثرات سے عاری تھے اور انھیں بے جا، ان خیالات و تصورات کا مؤید و موسس قرار دیا جاتا ہے۔ غرض گفتگو شمع و پروانہ کی ہو یا گوئٹے کا حلاجؒ سے موازنہ یا پھر نبی اکرم ﷺ کی تعظیم و تقدس کا ذکر ہو، شمل نے ان تمام مراحلِ فکر میں اپنی تحقیقی انفرادیت کا ثبوت بہم پہنچایا:

"If there is any doubt as to whether Hallaj was a faithful Muslim, one need only read his description of Muhammad in the 'Tasin as-siraj' of the Kitab at-tawasin. These short, rhyming sentences achieve new heights in the veneration of the Prophet: All the lights of the Prophets proceeded from his light; he was before all, his name the first in the book of

Fate; he was known before all things, all being, and will endure after the end of all. By his guidance have all eyes attained to sight.....All knowledge is merely a drop, all wisdom merely a handful from his stream, all time merely an hour from his life.....”6

صوفیا کرام کی بابت بعض اہم نکات کی تسہیل میں شمل کی نکتہ آفرینی قاری کو بے حد محظوظ کرتی ہے۔ مثلاً حضرت ابو بکر شبلیؒ کے حوالہ سے وہ یہ بتاتی ہیں کہ انھوں نے ایک شخص کو اپنے محبوب کے گزر جانے پر روتا دیکھا تو کہا 'او احمق! تو اسے پیار ہی کیوں کرتا ہے جسے بالآخر مرنا ہے۔'۷

شمل نے حضرت نفاریؒ کے وسیلہ سے بندے اور خدا کے مابین ہونے والی گفتگو کو مبحث کا حصہ بنایا کہ کیسے ایک فرد ذاتِ حق سے مکالمہ کرتے ہوئے معتمد علیہ بن جاتا ہے اور پھر اسی نوع کا بیان حضرت خواجہ میر دردؔ کی معروف کتاب 'علم الکتاب' میں تلاش کرتی ہیں؛ علاوہ ازیں شمل، نفاریؒ کی بابت، حرف میں مخفی جوہر کی توضیح کرتی ہیں اور اس دور کی بابت توجہ مبذول کراتی ہیں جب مسلم بنیاد پرستی حروف کے استعمال کے ضمن میں محتاط رویہ اپنائے ہوئے تھی، اور اسے انتہائی پیچیدہ، دانشورانہ معاملہ بنا دیا تھا، یعنی الفاظ کی لغوی حیثیت کو ایک ایسا مقام عطا کر دیا تھا جس سے خدائے بزرگ و برتر کی پیش کردہ ہدایت کی تفہیم میں اشکال پیدا ہو رہے تھے۔ نفاریؒ نے اسے کمال خوبصورتی سے حجاب المعارفہ کہا؛ ایک ایسا پردہ، جو مانندِ دیوار، بندہ و خالق کے مابین موجود ہو۔ گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے شمل دعا کے ضمن میں اسلامی و عیسوی عقائد کا موازنہ کرتی ہیں اور ملامتی صوفیا کی بابت ابتدائے عیسائیت میں موجود آثار کی نشاندہی کرتی ہیں۔ اس مخصوص تناظر میں فقہا اور صوفیائے کرام کا موازنہ کچھ یوں پیش ہوا ہے:

“Ghazzali wrote: ‘Those who are so learned about rare forms of divorce can tell you nothing about the simpler things of the spiritual life, such as the meaning of sincerity towards God or trust in Him.”8

شمل، سیرتِ رسول ﷺ پر ایک انتہائی منفرد اور اہم کتاب بعنوان AND MUHAMMAD IS HIS MESSENGER- The veneration of the Prophet in Islamic piety پیش کر چکی ہیں۔ جرمن زبان میں یہ کتاب بعنوان Und Muhammad ist Sein Prophet: die verehrung des Propheten in der Islamischen Frommigkeit پہلی بار 1981ء میں شائع ہوئی جو شمل کی کتاب MYSTICAL DIMENTIONS OF ISLAM کے باب چہارم کا جز چہارم ہے۔ یہ صفحہ ۲۱۳ سے ۲۲۷ کو محیط ہے۔ شمل، نبی اکرم ﷺ سے والہانہ عقیدت و انسیت رکھتی ہیں اور ایڈورڈ سعید کی طرح مغرب میں پائی جانے والی اسلام بیزاری اور داعیٔ اسلام سے بے وجہ عناد کو خاص طور سے نمایاں کرتی ہیں؛ اور ایسا آرتھر۔ جے۔ آربری کے مترجم قرآن کے دیباچہ میں بھی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے جس میں وہ قرآن کے فرانسیسی مترجم آندرے دوریئر (ANDRE DU RYER) کا خاص طور سے ذکر کرتے ہیں جن کے ترجمہ میں جہاں متعدد اسقام ہیں وہیں ان کا تعصب اور اسلام بیزاری کا رویہ بھی بھرپور انداز میں سامنے آتا ہے۔ یہ ترجمہ ۱۶۴۷ء میں کیا گیا البتہ قرآنِ حکیم کا پہلا باقاعدہ ترجمہ آربری کے مطابق Retenensis نے ۱۱۴۳ء میں کیا۔ یہ کتاب دراصل ایسی ہی غلط فہمیوں اور بہتانوں کا ازالہ وتدارک ہے؛ یعنی مغرب میں اسلام کی بابت جو منفی رائے صدیوں سے پنپتی رہی، اس پر ایک روک لگائی جائے۔ شمل سیرتِ رسولؐ پر بہت سی اہم کتب میں سے تین اہم مصادر کی جانب ہماری توجہ مبذول کراتی ہیں:

"An important introduction is Muhammad Hamidullah's Le Prophete d' Islam, which, based on his lifelong penetrating studies into the original Arabic sources and his deep personal piety, depicts the life of the Prophet as it appears to a devout Muslim who has received his academic training mostly in Western universities. Similarly, Emel Esin's beautiful book Mecca the Blessed, Medinah the Radiant contains a fine account of the feeling of a highly cultured modern Turkish lady at the threshold of the Rauda (mausoleum) of the Prophet in Medina. Martin Ling's Muhammad, a life of the Prophet

as depicted in the oldest sources, is an excellent introduction to the subject and very well written. These are only three typical examples from a large number of publications."9

شمل نے یہ دکھانے کی کوشش کی کہ مستشرقین کے ہاں آپؐ کی ذاتِ گرامی کی بابت تنوع موجود ہے۔ کسی کے ہاں نبی اکرمؐ کی ہستی ایک مثالی وجود رکھتی ہے تو کوئی انھیں محض ایک عام انسان کے حوالہ سے جاننے کی جستجو کرتا ہے۔ معروف سوئس مستشرق تور آندرے جن کی کتاب Die person Muhammads in lehre und glaube seiner Gemeinde (1918) شمل کے نزدیک ایک بے مثل اور تحسین کی اہل کاوش ہے جس سے بانیٔ اسلام کا مثبت، تعمیری شخصی پہلو سامنے آتا ہے۔ شمل اس کتاب کو متعدد مواقعوں پر بطور حوالہ کے پیش کر چکی ہیں تاہم وہ اس تأسف کا بھی اظہار کرتی ہیں کہ سیرتؐ پر کام کرنے والے بھی تورآندرے کی اس مساعیٔ خاص سے نابلد ہیں اور ان کا ذکر معدوم ہے۔ تقابلی مطالعہ میں جرمن اسکالر میکس ہارٹن (Max Horten) بھی سامنے آتے ہیں جنھوں نے اپنی کتاب Die religiose Vorstellungswelt des Volkes im Islam میں جو خیالات پیش کیے وہ شانِ رسالتؐ کے منافی ہیں اور یوں بھی اسلام کی بابت ان کا مجموعی کام مسلم بیزاری لیے ہوئے ہے۔ مسلم تصوف کو وہ حقیقی نہیں جانتا بلکہ ہندوستان کو اس کا مرکزہ سمجھتا ہے؛ قریباً نصف صدی بعد یعنی ۱۹۶۴ء میں ہرمن اسیٹک لیکا(Hermann Stieglecker) نے نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس کو الٰہیاتی تناظر میں جانچنے کی خوبصورت کوشش کی۔ شمل سیرتؐ نگاری کے ضمن میں انگریزی زبان کے اہم اور بہتر کام کے متعدد حوالے دیتے ہوئے کونسٹانس ای۔ پیڈوک (Constance E. Padwick) کی کتاب Muslim Devotions (1960) کے بارے میں کچھ یوں گویا ہیں:

"Among works in English, Constance E. Padwick......leads the reader into the very heart of Muslim piety, namely the life of prayer, in which the Prophet Muhammad occupies a truly sublime position. This book on Muslim religious life is equally knowledgeable and lovable and contains abundant material about the veneration of the Prophet, culled from

the prayer books and devotional literature of the entire Islamic world. It is, to my feeling, the best introduction to the topic."10

ان کے علاوہ شمل آرتھر جیفری (Arthur Jeffery) کی کاوشوں کو بھی سراہتی ہیں۔ ان کی کتاب Reader on Islam عربی متون سے فیض اٹھاتی ہے۔

موضوعِ بحث کتاب کے باب ہفتم 'نورِ محمدؐ اور صوفیانہ روایت' میں شانِ رسالتؐ، اسرارِ آغازِ کائنات، نوری محمدیؐ کی تعبیر، مسلم فکر میں نبی پاکؐ کا خلق ہونا اور خاص طور سے آپؐ کی بابت احسن الخالقین کا عقیدہ ان تمام امور کی گرہ کشائی میں شمل اپنا تفحص بے دریغ پیش کرتی ہیں اور احادیث کی روشنی میں عقائد کی تسہیل کرتی ہیں۔ اس ضمن میں تین احادیث خاص طور سے سامنے آتی ہیں جنھیں شمل متعدد مواقعوں پر بطور حوالہ کے رقم کر چکی ہیں اور جن کا متصوفانہ مقام ہمیشہ شاداب رہا ہے۔ صوفی شاعری اور تفحصات میں یہ تواتر سے پیش کی گئی ہیں۔ پہلی حدیث کا تعلق ابتدائے نبوتؐ سے ہے جو جامع ترمذی میں کچھ یوں رقم ہے:

"حضرت ابو ھریرہؓ سے روایت ہے کہ صحابہؓ کرام (رضی اللہ عنھم) نے عرض کی یارسولؐ اللہ! آپؐ پر نبوت کب واجب ہوئی؟ فرمایا جب آدمؑ روح اور جسم کے درمیان تھے۔"۱۱

دوسری حدیث باعثِ تخلیقِ کائنات کے پس منظر میں پیش کی جاتی ہے:

"اے محبوب! اگر آپ کو نہ بنانا ہوتا تو میں دنیا کو پیدا نہ کرتا۔"۱۲

اس حدیثِ مبارکہ کا عربی متن لولاک لما خلقت الدنیا کی صورت پیش کیا جاتا ہے۔

تیسری حدیث جسے حدیثِ گنجِ پنہاں بھی کہا جاتا ہے کا بیان کچھ یوں ہے:

کُنتُ کَنزاً مَخفِیّاً فَاَحبَبتُ اَن اُعرَف فَخَلَقتُ الخَلقَ لِاُعرَف » یعنی: پروردگارا! برای چہ مخلوقات را آفریدی؟ خدای تعالی فرمود: گنجی پنھان بودم، دوست داشتم کہ شناختہ شوم، پس خلق را آفریدم تا مرا بشناسند"۱۳

یہ تینوں احادیث صوفیانہ عقائد میں مرکزی حیثیت رکھتی ہیں۔ شمل نے بڑی مہارت سے ان سرّی، متصوفانہ رموز کی عقدہ کشائی کی ہے:

"Numerous hadith are now quoted to show that He was indeed the meaning and end of creation. In one he states: 'I was a Prophet while Adam was still between water and clay,' that is, uncreated. The Prophet is also reported to have said, 'The first thing that God created was my spirit'; but one finds conflicting statements such as 'The first thing that God created was the Pen' (which is 'identical with the Muhammadan Spirit') or 'the Intellect.' Najm Razi skillfully combines all three seemingly contradictory hadith by interpreting all of them as pertaining to the Prophet: 'When God Almighty created the Muhammadan Spirit and looked upon it with the gaze of affection, shame overcome it, and caused it to split in two'-one half of the Pen of God became the spirit of the Prophet, the other half the intelligence of the Prophet."14

شمل نے شانِ رسالتؐ کو ہمیشہ بہترین انداز پر بیان کیا۔ وہ نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس سے اک گونہ انسیت رکھتی تھیں اور ان کی یہ شدید خواہش رہی کہ وہ درِ نبیؐ پر حاضری دیں لیکن مذہبی افتراق کے باعث ایسا ممکن نہ ہو سکا؛ اس پر وہ رنجیدہ رہیں اور اپنی خود نوشت میں اس کا اظہار بھی کیا۔ زیرِ مبحث کتاب نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی کے بہت سے اہم پہلو آشکار کرتی ہے اور اہلِ مغرب کو داعیٔ اسلام سے بہتر انداز پر متعارف کرانے میں معاون ہے۔

الٰہیاتی موضوع پر شمل کی ایک اہم کتاب Deciphering the Signs of God- A Phenomenological Approach to Islam دستیاب ہے جو اسلام کے مظہراتی پہلو نمایاں

کرنے کی ایک بھرپور کاوش ہے۔ ادارہ ورلڈ کیٹ (worldcat.org) میں موجود حوالہ جات کے مطابق یہ کتاب پہلی بار، انگریزی میں البانی نیویارک (Albany New York) سے ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی۔ راقم کو دستیاب کتاب، ۲۰۰۶ء میں سنگِ میل پبلی کیشنز، پاکستان سے شائع ہوئی۔

یہ کتاب فطرت اور تہذیب کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے تصور زمان و مکاں کی الٰہیاتی نسبت، سماوی متن، فرد اور معاشرہ، خالق اور مخلوق، عقیدۂ آخرت اور اسلام کی تسہیل و تفہیم ایسے موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ ایک مستشرق کے لیے مسلم الٰہیات اور علم الکلام ایسے موضوعات پر گفتگو کرنا سہل نہیں۔ اس کے لیے جامع تہذیبی و ثقافتی عرفان، متعلقہ زبان و ادب پر دسترس، فلسفہ، مابعد الطبیعیات، علم البشر اور تاریخ پر ایک مضبوط گرفت ناگزیر ہے، اور شمل اس ضمن میں خوش قسمت ہیں کہ انہیں ارنسٹ کوہنل (ERNST KUHNEL)، رچرڈ ہاٹ مان (RICHARD HARTMANN)، ہائین غش شیڈر (HEINRICH SCHADER)، فرانز کینل (FRANZ KUHNEL) اور آنیماری ووں گیبیاں (ANNEMARIE VON GABIAN) ایسی نابغۂ روزگار شخصیات کی رہنمائی حاصل رہی۔ اس سبب شمل کو وسعتِ فکر کی ارزانی ہوئی اور مسلم الٰہیات، تقابلِ ادیان، تاریخ اور اسلام کی مظہراتی تفہیم میں آسانی و آسودگی میسر رہی۔ ان کی دیگر کتب کی مانند یہ کتاب بھی شمل کے دیے گئے لیکچروں کا حاصل ہے۔ اس بابت شمل کچھ یوں رقم طراز ہیں:

"To deliver the Gifford Lectures is a great honour and privilege for any scholar working in the general field of 'religion', and I am deeply grateful to the Trustees of the Gifford Lectures for having invited me to speak in Edinburgh in the spring of 1992-an experience which I thoroughly enjoyed."15

یہ لیکچرز فید غش ہائیلے کو معنون ہوئے۔ شمل اس کتاب میں مختلف نکات سجھاتے ہوئے اس امر پر زور دیتی ہیں کہ مذہب کا مطالعہ کس نہج پر ہونا چاہیے؟ مذہب کا معروضی تجزیہ کس طرح ممکن ہے؟ اور اہلِ مغرب کے ہاں اسلام کی بابت اسقام کی نوعیت اور محاضرات کیا ہیں؟ وہ سمجھتی ہیں کہ زبان کا ادھورا علم اور از کارِ رفتہ تراجم وہ بنیادی اسباب ہیں جو ہمیشہ سے اسلام کی درست تفہیم و تشخیص میں سدِ راہ ہوئے۔ ایڈورڈ سعید نے بڑی صراحت سے اپنی کتاب "Orientalism" میں ان جملہ امور کی نشاندہی کی ہے۔ شمل مظہریت کو تصوف سے ہم آہنگ جانتی ہیں اور اسلام کے مسلمہ اصولوں کی تعبیر میں اس کی حیثیت مقدم سمجھتی ہیں۔ شمل کی جانب سے اس انتہائی منفرد کتاب کو تحریر کرنے کا پس منظر کچھ یوں سامنے آتا ہے:

"Nevertheless, I believe that the Phenomenological approach is well suited to a better understanding of Islam, especially the model which Friedrich Heiler developed in his comprehensive study Erscheinungsformen und Wesen der Religion (Stuttgrat 1961), oh whose structure I have modelled this book. For he tries to enter into the heart of religion by studying first the Phenomena and then deeper and deeper lyres of human responses to the Divine until he reaches the innermost sacred core of each religion, the centre, the Numinous, the deus absconditus."16

شمل کتاب میں نکات کی خوبصورت تفہیم میں بزبانِ مولانا رومؒ خدائے واحد کی بابت یہ کہتی ہیں کہ وہ ہستی جنت میں لگے سیب کے درختوں کی خوشبو کی مانند ہے۔ نشانات کی تکثیریت، خدائے واحد کو مخفی رکھنے کے لیے ضروری ہے، جو وراءالورا ہے مگر آیت مقدسہ کے مطابق شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ نشانات کی تکثیریت اور خدائے واحد کے مابین ایک گہرا تعلق ہے۔ یہ حق کی موجودگی کا پتہ دیتے ہیں، اور اس ضمن میں شمل سورۂ رحمٰن کی اس آیت کا حوالہ دیتی ہیں:

کل من علیھافان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام (آیت نمبر ۲۷،۲۶)

عرفانِ ذاتِ حق کے لیے ایک دائروی زائچے کی مدد لی گئی ہے یعنی وہ ہستی تین حوالوں سے مشخص ہوتی ہے۔ تقدس، محبت اور سچ؛ محبت سے محبت جنم لیتی ہے، سچ عقیدے کی بنیاد ہے، یہ وحیٔ الٰہی پر ایقان کا نام ہے جس سے مقدس الفاظ اور مطہر متون جنم لیتے ہیں۔ تقدس کا تعلق بزرگی اور اتباع سے ہے اور یہ تصورِ خدا ہے۔ شمل کے نزدیک مذہب خلا میں موجود روحانیت کا نام نہیں بلکہ حق تعالیٰ سے ایک فطری، مادی تعلق پر انحصار کرتا ہے۔ شمل مسلم تہذیب و ثقافت کے پس منظر میں الٰہیاتی مظاہر اور مادی اشیاء کے باہم اتصال سے تسہیل و تفہیم کی نئی راہیں دریافت کرتی ہیں؛ مثلاً تصورِ مکان کی بابت وہ مسجد کے دروازے، خطاطی، اگلے وقتوں میں مسجد میں جلنے والے ایندھن اور دیگر اہم مقامات یعنی کربلا، نجف اشراف، مشہد اور مدینہ کا ذکر کرتی ہیں:

"The sacred space par excellence in Islam seems to be the mosque, and many visitors–Rudolf Otto, S.H.Nasr, Martin Lings, Frithjof Schuon and others–have emphasized the 'feeling of the Numinous', the experience of otherworldliness when standing in one of the Great mosques in North Africa or Turkey. These buildings were, as they felt, perfect expressions of the emptiness which is waiting to be filled with Divine blessing, that is the experience of the human being, poor (faqir) as he or she is, in the presence of the All-Rich, Alghaniy."17

الٰہیاتی موضوع سے جڑی ایک اور اہم کتاب We believe in one God–The experience of God in Christianity and Islam کو شمل عبدالجواد فلاطوری کی مدد سے مرتب کرتی ہیں۔ یہ کتاب پہلی بار انگریزی میں ۱۹۷۹ء میں Burns & Oates کی جانب سے لندن میں شائع ہوئی۔ اس سے قبل یہ جرمن زبان میں پہلی بار ۱۹۷۵ء میں بعنوان Glauben an den einen Gott: Menschliche Gotteserfahrung im Christentum und im Islam جرمنی سے شائع ہوئی۔ بنیادی طور پر یہ کتاب عیسائیت اور اسلام میں اثباتِ ذاتِ حق سے متعلق ہے۔ اس کا پیش لفظ معروف مستشرق اور اینجلیکل بشپ کینتھ کریگ (1913-

2012)کا تحریر کردہ ہے جنکی زندگی کا بیشتر حصہ اسلام اور عیسائیت کے باہمی تعلق پر لکھتے ہوئے گزرا۔ کتاب کا تعارف شمل اور ایرانی نژاد جرمن اسکالر عبد الجواد فلاطوری(1996-1926) نے پیش کیا۔ کتاب میں شامل شمل کا مضمون تخلیق اور روزِ محشر۔ قرآن اور صوفیانہ شاعری کی تشریح سے متصف ہے؛ یہ وہ مضامین ہیں جن کی پیش کش میں شمل ہمیشہ اعتماد محسوس کرتی ہیں، معلومات کی فراوانی کے ساتھ وہ نکات بھی سامنے آتے ہیں جن کی تفہیم گہرے اسلامی اور تاریخی مطالعے کو سزاوار ہے۔ ذاتِ حق کا انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے الست بربکم پر شہادت لینے کا معاملہ ہو یا انسانوں اور دنیا سے بے نیازی کی کوئی صورت، ایسے تمام مندرجات دیدنی ہیں۔ خالق اور مخلوق کے مابین تفاوت کی صراحت میں شمل وقت کی ابتدا، اختتام اور ابدیت ایسے موضوعات کو سمیٹتی ہیں اور اقبالؔ کی مانند یہ واضح کرتی ہیں کہ تواتر سے آگے کو سرکتے وقت کی بندش، ایک کامل انسان ہی ختم کر سکتا ہے۔ یعنی 'ایّام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر'۔

"Creation is also the separation of creatures from God. It is then...a directed time comes into existence; a time which, like the constantly active Divine word, extends between pre-eternity and endless eternity, and thus forms a limit which man can surpass only in rare moments of ecstasy. For the mystics the word which the Prophet spoke during His ascension to heaven, e.g. ' I have a time (Kairos, moment) with God in which even Gabriel has no access', is proof of the fact that it is possible to break through created serial time and to share in the Divine nunc aeternum. Such a breakthrough is, however, granted only to the most perfected human beings, but not to the –static–angels."18

اسی پس منظر میں شمل صوفیا کی ہر دلعزیز حدیث کُنتُ کَنزاً مَخفیّا کی جانب ایک بار پھر توجہ دلاتی ہیں اور اقبالؔ کے تصورِ خودی اور جرمن فلاسفر اور شاعر رودولف پان وٹز کے مابین جملہ فکری مماثلتوں کو نشان زد کرتی ہیں۔ رودولف پان وٹز خود بھی اقبالؔ کے زبردست مداح تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ جس بہتر انداز پر اقبالؔ نے نطشے کے جملہ افکار کی تفہیم

کی وہ مغرب میں اوروں کے ہاں نایاب ہے۔ منصور حلاجؒ ایک بار پھر شمل کی تحریر کا حصہ بنتے ہیں اور اس بار شمل، 'کتاب الطواسین' کے وسیلہ سے نورِ محمدیؐ کی تفہیم اور سنائیؒ کے بیان کی روشنی میں حضرت محمد ﷺ کے خلقِ اُولیٰ کی نسبت پیش کردہ حدیث یعنی لولاک لما خلقت الدنیا کا اعادہ کرتی ہیں اور اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ حلاجؒ کے نزدیک ابلیس کا آدمؑ کو سجدہ نہ کرنے کا سبب حق تعالیٰ سے عشق تھا اور حلاجؒ معروف جرمن مستشرق ہیلمٹ ریٹر (Hellmut Ritter)، امام غزالیؒ اور سنائیؒ کی مانند ابلیس کو شہیدِ عشق اور سچے موّحد کی حیثیت سے شناخت کرتے ہیں۔ اس فکر کے مؤسسِ اعلیٰ حلاجؒ قرار پاتے ہیں:

"The true lover is Satan', for he preferred to be the target for the fatal arrow from the hand of his divine beloved, and surrendered to his inexplicable will. Most mystics, among them Rumi, have of course seen Satan as the one-eyed representative of intellect and false analogy, who did not recognize the divine spark in Adam and the divine breath that had been infused into the figure of clay (Sura 5:15; 38:72) and who therefore deserves a punishment which, according to Sura 26:94, will eventually cast him into hell-fire."19

مولانا رومؒ وہ ہستی ہیں جن کے سبب شمل اسلامی تصوف اور دنیائے اسلام سے بہتر طور پر متعارف ہوئیں۔ ان کے مزار پر حاضری شمل کے لیے کسی روحانی مکاشفے سے کم نہ تھی اور اس ضمن میں کیا جانے والا سفر متعدد دلفریب نقوش سمیٹتا رہا۔ حوالہ کے طور پر شمل کی آپ بیتی .Orient and Occident- My life in East and West کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ذاتِ حق کا عشق سے مملو عرفان اور اس کی آفاقی حیثیت، انسان کے جملہ روحانی وسرّی کمالات اور ان کی غایت، ان تمام موضوعات پر شمل، مولانا سے مستفید ہوتی ہیں اور ان کی جانب سے یہ کوشش نظر آئی کہ مولانا کے پیش کردہ کائناتی پیغام کو اکنافِ عالم میں حتی المقدور پھیلایا جا سکے۔ The Triumphal Sun-A study of the Works of Jalaloddin Rumi اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی؛ دوسری بار، نظرِ ثانی اشاعت ایسٹ ویسٹ پبلی کیشنز (لندن، ہیگ) کی جانب سے ۱۹۸۰ء میں ہوئی۔ شمل

کی مولانا سے فکری وابستگی کا آغاز اوائلِ عمری میں ہوا تاہم وہ شخصیات جو مولانا سے علمی قربت اور انسیت کا وسیلہ بنیں ان کی بابت ذیل کا اقتباس اہمیت کا حامل ہے:

"The Present writer has to confess that she has been interested in Rumi's work for exactly forty years: beginning in my early school days when for the first time, I read some of my Ruckert's marvelous verse-translations from the Divan of Mowlana Jalaloddin, German verses which never ceased to fascinate me. Later, when I was a very young student of Islamic languages in war-time Berlin, the moment that my venerable professor H.H.Schaeder recited to us the first lines from Rumi's Mathnavi proved decisive for the development of this old love, and it took only a few weeks until my first verse translations from the Divan-e Shams-e Tabrizi were ready; R.A.Nicholson's edition of the Divan, carefully copied by hand, became a faithful companion for many years, and the first money earned in compulsory work in a factory during the semester vacation was immediately transformed into the eight volumes of Nicholson's edition of the Mathnavi."20

طویل اقتباس کو رقم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قارئین اور محققین بہتر طور پر شمل کی مولانا سے وابستگی کے مراحل کو جان سکیں۔ شمل اس کتاب میں اپنے پہلے دورۂ قونیہ کی بابت گفتگو کرتی ہیں جو مئی ۱۹۵۲ء میں ممکن ہوا؛ شمل اِسے ایک معطّر موسمِ بہار سے تشبیہ دیتی ہیں۔ سن ۱۹۲۵ء سے سماع اور دیگر متصوفانہ تقریبات پر پابندی لگا دی گئی تھی تاہم قریباً انتیس (۲۹) برس بعد یہ ممانعت زائل ہوئی اور دسمبر ۱۹۵۴ء کو مولانا رومؒ کے یومِ وصال کے موقع پر سماع اور صوفیانہ رقص کی اجازت مرحمت ہوئی، اور یاوریٔ قسمت سے شمل اور ان کی والدہ کے لیے یہ ایک پر لطف روحانی تجربہ بنا۔ وہ مولانا رومؒ کے علمی و فکری نِکات کی تفہیم میں حیرت و استعجاب کے بہت سے مقفل در، وا کرتی ہیں اور کسی زیرک عالم کی مانند کائنات اور خدا کے باہمی تعلق کی توضیح میں استفہامیہ لہجہ اپناتی ہیں؛ یعنی کیا عشق میں

قربان ہوناہی انسانی بقاکی واحد سبیل ہے؟ کیارومیؒ ایک ایسے فلاسفر تھے جنھوں نے اس کائنات میں دانشِ اُولیٰ کو مخفی دیکھا؟ کیا یہ اس صندوق کی مانند ہے جس میں تمام امکانات بشمول مادہ روزِ اوّل سے محفوظ و مامون ہے اور جو اکِ اشارۂ ایزدی سے زمان و مکان میں حقیقت کا روپ بھرتے ہیں یعنی لفظ 'کُن' کے منتظر رہتے ہیں یا مولانا محض ایک عاشق تھے جو سوزِ عشق میں جلے اور جنھوں نے دانائی اور گردوپیش کی مختلف حالتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے عاشق اور معشوق کی ارفع وحدت کو جالیا تھا؟ یہ وہ جملہ استفسارات ہیں جو شمل قاری کے سامنے رکھتی ہیں۔ شمل، مولانا رومؒ کے حوالہ سے یہ بات کہنے میں اک گونہ طمانیت محسوس کرتی ہیں کہ وہ متحرک قوت جو سب سے ماوراً ہے ،عشق ہے۔ عشق، ذاتِ حق کا جوہر ہے جو مخلوق میں بصورتِ جلال و جمال مجسم ہے۔ شمل کے نزدیک، مولانا اپنے پیش رووں اور مقلدین کی مانند قرآنِ حکیم سے منکشف حقیقتِ ابدی کے خوّاص تھے؛ اس لیے انھوں نے ہر باب کو قرآنی آیات کے پس منظر میں پیش کیااور ان کی فکر، قرآنِ مجید کی اس آیۂ مبارکہ سے واضح ہے:

"عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے"۔ (سورہ ۴۱، آیت ۵۳)۔ یہ آیۂ مبارکہ صوفیا کے نزدیک خاص اہمیت کی حامل ہے؛ یعنی یہ وہ الفاظ ہیں جو نامختتم صوفیانہ امکانات سے مملو ہیں اور جن سے خالق کے تخلیقی قُویٰ جو زندگی کے ہر پہلو سے جڑے ہوئے ہیں کا احساس دلاتے ہیں۔ درحقیقت یہ تخلیقی قوت معدنیات، قوسِ قزح، انواع واقسام کے پھول، پرندوں اور انسانوں میں مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔ اس کتاب میں جس کثرت سے آیاتِ قرآنی کا حوالہ موجود ہے وہ بھی دیدنی ہے۔

مولانا کے بارے، ایک کتابچہ (Aspects of Mevlana 1971) دیکھا جا سکتا ہے جو قونیہ کے سیاحتی ادارہ کی جانب سے شائع ہوا۔ شمل اُس وقت ہاورڈ یونیورسٹی (امریکہ) میں تھیں۔ انھوں نے یہ کتابچہ مرتب کیا اور دیباچہ لکھا۔ مولانا کی مثنوی کی بابت شمل کا یہ کہنا اہمیت کا حامل ہے:

"His Mathnawi, masterly edited by R.A.Nicholson between 1925 and 1940, contains a veritable encyclopedia of mystical thought, where we may find verses which are reminiscent of those of his two predecessors in the field of mystical didactic poetry, of Sana'i (d. 1131 in Ghazna) and of Fariduddin 'Attar (d. ca. 1220 in Nishapur).21

بنیادی طور پر یہ کتابچہ جیسا کہ عنوان سے عیاں ہے کہ مولانا رومؒ کے شخصی اور فکری پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے اور اس میں ہمیں اسکاٹ کیمپر (Scott Kemper) کی تحریر خاص طور سے نظر آتی ہے جو صوفیانہ رقص سے متعلق ہے اور رقص ہی کی بابت شمل اپنی کتاب A Dance of Sparks- Imagery of Fire in Ghalib's poetry میں گرانقدر تفحص پیش کر چکی ہیں۔ مولانا رومؒ کے آٹھ سویں(۸۰۰)جنم دن کی نسبت سے ایک اہم کتاب بعنوان Look! This is Love- poems of Rumi ملتی ہے۔ نظموں کے تراجم شمل نے خود کیے اور یہ کتاب پہلی بار بوسٹن یو۔اے (Boston u.a) سے ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی۔ راقم کے زیرِ مطالعہ کتاب ۲۰۰۳ء میں سنگِ میل پبلی کیشنز کی جانب سے شائع ہوئی۔ مثنوی مولانا رومؒ کا مزید تعارف شمل کچھ یوں پیش کرتی ہیں:

"On the request of his favorite disciple, Husamuddin Chelebi, the Mathnavi, 'The Spirtual Couplets.' This work, praised in the Persianate world as 'the Koran in the Persian tongue' is a compendium of mystical experience, traditions, and folklore in more than 25,000 verses with no apparent 'logical' order."22

کتاب میں موجود بعض تراجم بہت متاثر کن ہیں اور یہ طبع زاد معلوم ہوتے ہیں:

"From Myself I am copper,

Through you, friend, I am gold.

From myself I'm a stone, but

Through You I am a gem!"

"Once a beloved asked her lover: 'Friend, you have seen many places in the world!

Now-which of all these cities was the best?

He said: The city where my sweetheart lives!" 23

شمل کی شاعری کے حوالہ سے دو اہم کتابیں بعنوان Mirror of an Eastern Moon اور Nightingales Under the Snow ملتی ہیں۔ یہ نظمیں طبع زاد ہیں ۔ اوّل الذکر کتاب ۱۹۷۸ء میں ایسٹ۔ویسٹ پبلی کیشنز (لندن۔ ہیگ) سے شائع ہوئی جو تین حصوں میں منقسم ہے؛ حصہ اوّل مولانا جلال الدین رومیؒ سے متعلق ہے جس میں اُن کے خیالات کی تعظیم نمایاں ہے۔ حصہ دوم روایتی فارسی شاعری اور معمولاتِ زندگی سے متعلق ہے جبکہ حصہ سِوم ہندوستان اور پاکستان کے اَسفار سے جڑا ہوا ہے اور اس میں خاص طور پر سندھی شاعری کو اہمیت دی گئی ہے اور ان صوفی شعراء کے کلام سے خمیر اٹھایا گیا ہے جن کے ہاں تواتر سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتیں لوک کہانیاں اپنے باطن میں رمزیت لیے عشق کی لافانی صورت کو منکشف کرتی ہیں۔ یہ کتاب Mirror of an Eastern Moon متعدد اضافوں کے ساتھ مؤخر الذکر کتاب Nightingales Under the Snow کے قالب میں ڈھلتی ہے جو خاقانی نعمت اللہ پبلی کیشنز (لندن۔ نیویارک) کی جانب سے پہلی بار ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی۔ راقم کے زیرِ مطالعہ اس کی دوسری اشاعت تھی۔ یہ امریکہ میں سن ۱۹۹۷ء میں شائع ہوئی، تاہم اس کی دیگر اشاعتیں بھی مذکور ہیں جن میں لندن ہی سے خاقانی پبلی کیشنز کی جانب سے ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی اور ایک اشاعت ۱۹۹۶ء کی بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ اس میں موجود نظمیں ۱۹۷۴ء سے ۱۹۹۴ء تک یعنی قریباً بیس برس کے شعری سفر کو محیط ہیں اور چونکہ اس میں پہلے سے لکھی گئی تمام نظمیں شامل ہیں اس لیے ہمیں نظموں کے ضبط میں وہی ترتیب ملتی ہے جو Mirror of an Eastern Moon میں موجود ہے؛ البتہ موضوعاتی اعتبار سے بعض خوبصورت اضافے دیکھے جا سکتے ہیں۔

شمل کا یہ شعری مجموعہ خوبصورت نظموں پر مشتمل ہے اور انھیں پڑھتے ہوئے جہاں شعری ترفع کا احساس ہوتا ہے وہیں ان کی 'صوفی محبت' بھی اپنا بھرپور تفاعل پیش کرتی ہے:

<u>"Zulaykha's Third letter to Yusuf</u>

I called the best painters

From all over the world

To decorate my house

They looked at you, and each of them tried

To interpret your beauty

In colour, marble, or tiles:...............

Once more I called the best artists

From all over the world

To decorate my house

They looked at you, and each of them brought

A mirror to reflect your face

Thousands of mirrors–steel, diamond, glass–

Each one reflecting the other's light

-Light, borrowed from you-

And each of them was a veil."24

اسلام میں نسائیت کے موضوع پر شمل کی ایک اہم کتاب MY SOUL IS A WOMAN لائقِ ذکر ہے۔ اسے انگریزی زبان میں اشاعتی ادارے "کون ٹی نم" نے ۲۰۰۳ء میں شائع کیا اور اس سے قبل جرمن زبان میں یہ کتاب میونخ سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کا انگریزی ترجمہ سوسین۔ ایچ۔ رے نے کیا۔ بنیادی طور پر یہ کتاب اسلام کے متصوفانہ نسائی پہلوؤں کو نمایاں کرتی ہے اور ایسی مقتدر مسلم خواتین کو مبحث کا حصہ بناتی ہے جو اسلامی تاریخ میں ہمیشہ مؤقر و محترم درجہ پر فائز رہیں اور ان میں بعض زمرۂ متصوفین میں شمار ہوئیں۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ، حضرت فاطمۃ الزہراؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت نفیسہؓ سے حضرت رابعہ بصریؒ اور دیگر مسلم بزرگ خواتین کا معتبر حوالہ اپنے پس مناظر کے ساتھ متاثر کرتا ہے۔ کتاب کے بعض حصوں کے تراجم ہو چکے ہیں۔ شمل، مسلم خواتین کے ذکر میں حفظِ مراتب پیشِ نظر رکھتی ہیں اور ایک والہانہ لگاؤ کا احساس ان کی تحریر سے عیاں ہے۔

کتاب کا پہلا باب 'پیغمبر ﷺ اور خواتین' کے عنوان سے اہم معلومات لیے ہوئے ہے۔ سرنامہ پر جو حدیثِ مبارکہ مندرج ہے اس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھاری دنیا سے میرے لیے عورت اور خوشبو کو پسند فرمایا اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز ہے۔ یہ حدیثِ مبارکہ جسے عموماً شیخ محی الدین ابنِ عربیؒ کے حوالہ سے پیش کیا جاتا ہے، معنیات کے بہت سے در وا کرتی ہے؛ اور مختلف ادوار میں اہلِ تصوف نے اس کے ایک سے زائد مفاہیم پیش کیے، مثلاً حضرت خواجہ نظام الدینؒ اولیاء کے نزدیک عورت سے مراد حضرت عائشہ صدیقہؓ ہیں اور آنکھوں کی ٹھنڈک جنابِ فاطمۃ الزہراؓ ہیں جو عبادات میں یعنی نماز میں ہمہ وقت مشغول رہتی ہیں۔ اسی طرح شیخ محی الدین ابن عربیؒ کے نزدیک عورتوں سے انسیت کا سبب بتقضائے طبع یا فطری نہ تھا بلکہ یہ تو ذاتِ حق کی جانب سے خواتین کو اس اہل بناتا ہے کہ ان سے محبت کی جائے۔ شمل اس ساری بحث کو سمیٹتے ہوئے یہ صراحت کرتی ہیں کہ اس میں ایک اہم حوالہ خوشبو کا ہے جو بیک وقت نسائی عنصر اور پاکیزگی کا استعارہ ہے؛ یعنی عربی زبان میں مجرد مردانہ تصور کی

حیثیت سے لفظ "خوشبو "اس حدیثِ مبارکہ میں دو نسائی اسمائیں شامل ہے یعنی عورت اور نماز۔ یہ مشاہدہ خود مکتفی ہے جو صوفیائے کرام کی فکر کو کبھی نہ ختم ہونے والی غذا فراہم کرتا رہے گا اور جو سرّی تعلق سے جڑا ہوا ہے۔

اس باب میں شمل نے تفصیل سے لائقِ احترام اسلامی خواتین کی بابت گفتگو کی اور حضرت خدیجہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت فاطمہؓ اور حضرت نفیسہؓ کے مناقب و کمالات کی تصریح کرتے ہوئے مختلف واقعات کی روشنی میں شخصی رویوں اور معاملات کی جانچ کی ہے۔ خلافت نشینی، حضرت علیؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کے باہمی نزاع اور حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی بے لوث خدمات کے ساتھ ساتھ حضرت فاطمہؓ کی سادگی اور والدِ گرامیؐ سے انتہائی محبت اور ایثار کی متعدد تمثیلیں پیش کی گئی ہیں۔ حضرت عمرِ فاروقؓ کا خواتین کے بارے میں سخت گیر رویہ اور واقعہ کربلا تک کے واقعات جزوی طور پر اس باب کا حصہ بنتے ہیں اور یہاں یہ واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ شمل لاشعوری طور پر حضرت امام حسینؓ کی لازوال قربانی کے باب میں تاریخی واقعات کا اعادہ کرتی ہیں۔ غرض حضرت امام حسینؓ ہوں یا پھر حسین بن منصور حلاجؒ، یہ شخصیات ہر پھر کر ان کی تحاریر کا وصف بنتے ہیں اور خراجِ تحسین حاصل کرتے ہیں۔ کتاب کے تعارف میں شمل تصوف اور نسائی اطوار کے باہمی ارتباط کے ساتھ حضرت رابعہ بصریؒ اور سنائیؒ کی خواتین کی بابت خیال آرائی کو خاص طور سے رقم کرتی ہیں۔ اس ضمن میں شمل حضرت زلیخاؒ اور نفسِ انسانی کی تطبیق کچھ یوں کرتی ہیں:

"Countless poets have turned to her as a nafs symbol, and it goes without saying that this nafs is purified by boundless love and its resultant fathomless sorrow, and is finally united with Yusuf. At the end of the road, the indefatigably seeking, unspeakably suffering, and loving woman finds the incomparable beauty she so ardently sought manifested in Yusuf. Seen in this light, the story of Yusuf and Zulaikha is the story of the Soul yearning passionately for the source of all beauty, for God."25

علاوہ ازیں شمل ہندوستانی لوک قصوں میں موجود نسائی عناصر کو کھوجتے اور پیش کرتے ہوئے یہ واضح کرتی ہیں کہ ان عشقیہ داستانوں میں موجود خواتین در حقیقت تکمیلِ ذات کا سفر طے کرتی ہیں بظاہر وہ عشق و محبت کے سلاسل میں جکڑی ہیں لیکن ان کے ہاں اپنے محبوب کا حصول محبت کا وہ ارفع ایقان ہے جو انھیں ان کی لاحاصلی پر بھی تکمیل کی منزل پر لے آتا ہے۔ ان متصوفانہ لوک کہانیوں میں نسوانی کردار اپنے پنوں یا ڈھولا کے لیے جان تک کو قربان کر دیتے ہیں اور اگرچہ یہ گماں گزرتا ہے کہ وہ محض عشقیہ۔ المیہ کردار ہیں لیکن ان کا کردار اس سارے جوکھم میں جو ترفع اور طُہر حاصل کرتا ہے وہ جان آفرینی کے بدل میں ایک بے مثل انعام ہے۔ ماروی ہو یا سسی ان کا تھلوں یا بے آب و گیاہ مقامات پر باحسرت و یاس مرنا ان کے عشق کا وہ عرفان ہے جو ذاتِ حق سے تعلقِ خاص کا پتہ دیتا ہے۔ حقیقت میں یہ تمثیلی قصے نفسِ انسانی کی متصوفانہ تکمیل کے لیے بیان ہوئے اور کرداروں میں موجود شدت اور تڑپ حصولِ عشق کے سرّی سفر کے لیے ایک ناگزیر شے سمجھی گئی، ان کے بغیر کامیابی اور ثروت کا حصول ممکن نہیں؛ یہی سبب ہے کہ صوفیا کے ہاں عاشق ہمیشہ ایک نسوانی کردار کی صورت سامنے آتا ہے کہ ایک مرد اس تڑپ اور شدت کا متحمل نہیں جو ایک عورت کو میسر ہے۔ صوفیا کرام کو اسی لیے اللہ کی دلہنیں کہا گیا ہے اور سنائیؒ کا یہ کہنا کتنا وقیع ہے:

"A good woman is better than a thousand men."26

شمل کے علاوہ اس موضوع پر جس مستشرقہ نے کام کیا وہ مارگریٹ سمتھ .Margaret Smith

(1884-1970) ہیں جن کی کتاب Muslim Women Mystics: The life and Work of Rabi'a and other Women Mystics in Islam ۱۹۹۴ء میں سامنے آئی اور غالباً یہی پہلی مربوط کاوش ہے جس میں صراحت سے حضرت رابعہ بصریؒ کی حیات کا احاطہ ہوا۔ ابتدائی مسلم صوفیا کے افکار اور حالاتِ زندگی کی بابت ان کی کتب دادِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ شمل کی طرح یہ بھی لوئی میسی یوں اور آر۔ اے نکلسن کی زبردست مداح تھیں۔ مسلم تصوف کے ضمن میں ان کا اور شمل کا تقابل ممکن ہے؛ شمل کے معاصر اہم مستشرقین میں ولیم سی چیٹک (William C. Chittick)، لیونارڈ لیوی شون (Leonard lewisohn) اور ایک معتبر نام

فریتھ جوف شوان (Frithjof Schuon) کا ہے جن کا علمی ذخیرہ حیرت کا موجب ہے۔ ان کے آباؤاجداد جرمن تھے تاہم یہ خود سوئٹزرلینڈ میں پیدا ہوئے اور امریکہ میں ان کا انتقال ہوا۔

مغرب میں پیش کردہ تحقیقی و تنقیدی کام مشرقی معاشروں میں بہت کم موضوعِ گفتگو بنتا ہے اور اس کا ایک اہم سبب کتب کی عدم دستیابی ہے اور دوسرے یہ کہ اگر کہیں دستیاب ہیں تو ان کی اچھے انداز پر تشہیر نہیں ہو پاتی۔ کتب کی ہوشربا قیمت بھی کم مطالعہ کا سبب ہے۔ غرض بیسویں صدی میں بہت سی اہم کارگزاریاں اہم کتب کی صورت میں سامنے آئیں اور مغرب میں اسلام کے بارے میں بہت سی غلط فہمیوں کا، کسی نہ کسی سطح پر ازالہ بھی ہوا۔ یہ تفہیمِ اسلام ، مسلم معاشرت اور بالخصوص اہلِ تصوف کے حوالہ سے ایک نوع کا مکرّر تجربہ تھا جس میں شمل ایسے مستشرقین نے درمیانی راہ کا انتخاب کرتے ہوئے اسلام کی متوازن صورت گری کی۔ اس ضمن میں شمل اور دیگر مستشرقین کی بہترین کاوشوں کو بطور حوالہ کے پیش کیا جاسکتا ہے لیکن اس سے جہاں ہم موضوع سے دور ہوتے ہیں وہیں مقالہ بھی بے جا طوالت کا شکار ہوتا ہے۔

متصوفانہ شاعری کے حوالہ سے شمل کی ایک اہم کتاب As Through a Veil خاص طور سے دیکھی جاسکتی ہے جو کولمبیا یونیورسٹی، نیویارک کی جانب سے ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے جو ہر زاویہ سے اسلامی اور خاص طور سے صوفیا کرام کی شاعری کا احاطہ کرتی ہے۔ باب اول بعنوان Flowers of the Desert عربی صوفی شاعری کی تشکیل سے متعلق ہے۔ باب دوم بعنوان Tiny Mirrors of Divine Beauty کلاسیکل فارسی شاعری کو ہدفِ نگاہ بناتا ہے۔ بابِ سوم بعنوان Sun Triumphal-Love Truimphant مولانا رومؒ اور محبت کے استعارات کو سمیٹتا ہے جبکہ بابِ چہارم بعنوان The Voice of Love دیسی زبانوں میں صوفیانہ شاعری کو پیش کرتا ہے اور باب پنجم بعنوان God's Beloved and Intercessor for Man اس شاعری کو مرکزِ نگاہ بناتا ہے جو نبی اکرم ﷺ کی مدح یا تعظیم سے جڑی ہوئی ہے۔

یہ کتاب بھی شمل کے جملہ لیکچرز کا حاصل ہے۔ اس سے یہ بات بھی مترشح ہے کہ اگر کوئی اسکالر باقاعدگی سے اپنے تفحصات لیکچرز کی صورت پیش کرتا رہے تو ان کا کتابی صورت میں ڈھلنے کا امکان قوی ہے۔ یہ لیکچرز شمل نے کن کن جگہوں پر دیے ان کی وضاحت کچھ یوں ہے:

"The Five lectures published in this volume were delivered under the auspices of the American Council of Learned Societies during the Spring Term of 1980. They were-in full or in part- given in the following institutions: Rice University (Houston); Trinity College (San Antonio); University of Tennesse at Knoxville; Duke University (Durham, N.C.); University of North Carolina at Cahpel Hill; MacMaster University (Hamilton, Ont.); University of Toronto; Princeton University; McGill University (Montreal); Columbia University and Union Theological Seminary (New York); University of Colorado (Boulder and Denver); University of Chicago; Northwestern University (Evanston iii.); and University of Alberta, Edmonton."27

مذکورہ مقتدر یونیورسٹیوں میں شمل کے محاضرات کتابی صورت میں ڈھل کر متصوفانہ شاعری کے باب میں ایک گرانقدر اضافے کی سبیل بنتے ہیں۔ اس کتاب میں شمل اس امر کا اعتراف کرتی ہیں کہ مولانا رومؒ کے جملہ خیالات کی پایابی ممکن نہ ہو سکی کہ جب بھی انھیں جانچا گیا نت نئے مضامین اور افکار فروغ پانے لگے۔ اُس وقت تک شمل قریباً دو کتابیں مولانا رومؒ کے حوالہ سے پیش کر چکی تھیں ایک جرمن اور دوسری انگریزی زبان میں۔ شمل کے نزدیک مولاناؒ کے افکار کی کامل یکجائی قریباً ناممکن ہے۔۲۸

شمل جنابِ موسیٰؑ، واقعۂ معراج، حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ، نبی اکرم ﷺ اور اقبالؒ کے حوالہ سے گفتگو کرتے ہوئے یہ بتاتی ہیں کہ پیغمبرؑ اور ایک صوفیؒ کے نظریۂ حیات میں تفاوت رہتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ واقعہ معراج سے مراجعت کرتے، بے یقینی اور حیرانی کا شکار نہیں ہوتے جبکہ چشتی سلسلہ کے بزرگ، شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کا یہ کہتے

ہیں کہ اگر انھیں یہ سعادت حاصل ہوتی تو وہ کبھی واپس نہ لوٹتے۔ اس تفاوت کو اقبالؔ نے خاص طور سے نمایاں کیا اور اس کی مزید صراحت شمل نے بہتر انداز پر کی۔

شمل کی تحاریر میں نبی اکرم ﷺ سے محبت و موَدت کا اظہار متعدد مواقعوں پر ہوا۔ راقم اس ضمن میں کسی قدر آسودگی سے ان احوال کو اپنے مقام پر رقم کر چکا ہے لیکن یہاں ایک شے اضافی ہے اور وہ نبی اکرمؐ کا خاتم النبیینؑ ہونا ہے۔ اس بابت شمل کی یہ رائے اہمیت کی حامل ہے:

"The love of the Prophet has been called the strongest binding force in Islam, and Muslims have always regretted that most Westerners fail to understand the importance of his love for Muhammad. Tinged by centuries-old prejudices, they rarely realize that for his followers Muhammad is as much the model for the faithful, as much the infallible leader of his community as He is the beloved intercessor at Doomsday. He is the first thing created by God as well as the 'seal' of all Prophets, and brought with him the final and all-comprehensive revelation."29

ہالینڈ کے معروف ماہر سنسکرت جین گونڈا کی نگرانی میں مرتّب کیا گیا مبسوط تحقیق و تنقیدی کام بعنوان

"A HISTORY OF INDIAN LITERATURE" سے جڑی دو اہم کتب کی مصنفہ شمل ہیں۔ جین گونڈا، اور ان کے بسیط کام کا تعارف راقم اختصار سے پیش کر چکا ہے۔

ISLAMIC LITERATURE OF INDIA اور SINDHI LITERATURE یہ وہ کتب ہیں جو شمل کے بہترین تفحصات سمیٹے ہوئی ہیں۔ اوّل الذکر کتاب کی بابت شمل کا یہ کہنا ہے کہ ہندوستان کے اسلامی ادب کے ضمن میں جہاں عربی، فارسی اور ترکی ادب خصوصی اہمیت کا حامل ہے وہیں اردو، سندھی، پشتو، پنجابی اور بنگالی ادب بھی مرکزِ نگاہ بنتا ہے؛ اور چونکہ ارضِ ہندوستان سے نمو پاتی زبانوں کو جدا جدا پرکھا گیا ہے اس لیے عربی، فارسی

اور ترکی متون کی جانچ کا اہتمام اچھے انداز پر موجود ہے جو پاک وہند میں مرتب یا پیش کیے گئے۔ شمل کا یہ بھی ادّعا ہے کہ زبانِ فارسی میں اسلامی مطالعات اور ادب بشمول نظم و نثر کا ذخیرہ ہندوستان میں اس قدر وافر ہے کہ ایران میں بھی اتنا ادب تخلیق نہ ہوا ہوگا۔ یہ دونوں مذکورہ کتب A HISTORY OF INDIAN LITERATURE کے صدر عنوان تلے شائع ہوئیں۔ ہندوستان کے اسلامی ادب سے متعلق کتاب پبلشر اوٹو ہیر وزووٹز، وزبیڈن کی جانب سے ۱۹۷۳ء میں جرمنی سے شائع ہوئی۔

شمل اس مطالعہ میں مسلمانوں کے ابتدائی عہد سے جڑی ادبی کارگزاریوں کا ذکر کرتے ہوئے احادیث کی ترویج، تخریج اور توضیح میں صوفیا کرام کی بے مثل کاوشوں کا ذکر کرتی ہیں اور قرآنی تفاسیر، صحیح بخاری کی بابت اہم معلومات بہم پہنچاتے ہوئے ایک نادر تفسیر کے بارے میں کچھ یوں گویا ہیں:

"Among the commentaries of the Quran composed in the Subcontinent the strangest one is no doubt the Sawati al-ilham 'Brilliant Lights of Inspiration' by Faidi (Fayzi), Akbar's court poet (d.1595); it consists exclusively of undotted letters. This was, in fact, a major achievement since this form excludes the use of most verbal forms in Arabic. Not surprisingly, its contents are almost lost behind the artificial form."30

ابوالفضل فیضی کی یہ غیر منقوط تفسیر جو 'سواطع الالہام' کے عنوان سے معروف ہے اپنی صناعانہ کارگزاری کے سبب اہمیت کی حامل ہے لیکن فکری سطح پر اس سے استفادے کی صورت بڑی حد تک محدود ہے؛ اور اس کا بنیادی سبب پہلے سے طے ایک غیر مروج اندازِ تحریر ہے جو ان کی ایک اور کتاب کہ جس کا تذکرہ شمل کتاب کے صفحہ ۷ کے فٹ نوٹ میں بحوالہ India's Contribution to Arabic literature: from ancient time to 1857 کرتی ہیں (پہلی بار لاہور سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی اور اس کے مصنف ایم۔ جی زبید احمد ہیں) 'تصوف اور اخلاقیات

' سے متعلق ہے۔ شمل اس کتاب کا عنوانMawarid-al kilam wa silk durar al-hikam بتاتی ہیں جو ۱۸۲۵ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔

شمال اور جنوب کے لسانی تفاوت کی بابت بات کرتے ہوئے شمل یہ واضح کرتی ہیں کہ برصغیر میں عربی شاعری کا آغاز بعینہٖ اس وقت شروع ہوا جب یہاں مغل عمل داری کا آغاز ہوا۔ گولکنڈہ حکمران اور ہمسایہ مسلم ریاستیں کبھی بھی فارسی کے اثر تلے اس طرح سے نہ آ سکیں جس طرح شمال کے صوبہ ہائے جات متاثر ہوئے اور ظاہر کہ اس کے پس پردہ مختلف النوع تہذیبی، معاشرتی اور سیاسی عوامل ہیں جو لسانی افتراق کا سبب بنے۔ جنوبی ساحلوں پر موجود عرب مسلم آبادیاں، ہندوستان اور عرب معاشرت کے باہم مضبوط تعلق کا وسیلہ بنی رہیں اور یہ باہمی اشتراک کا سلسلہ صدیوں جاری رہا۔ اس ضمن میں شمل ابنِ بطوطہ کا ذکر کرتی ہیں کہ جب وہ ۱۴ صدی عیسوی میں جنوبی ہندوستان میں وارد ہوا تو ہناور(Hanawar) کے مقام پر اسے یہ معلوم ہوا کہ مسلمان لڑکوں کے لیے ۲۳ اور لڑکیوں کے لیے ۱۳ مدارس موجود ہیں۔ یہ تعلقہ جس کی بابت مشہور ہے کہ یہاں سب سے پہلے حفظِ قرآن کا اہتمام ہوا، ریاست کرناٹک کے علاقہ کینرا میں واقع ہے اور اس تک رسائی آسان نہیں۔ اسے ہنّاور(Honnavar) لکھا جاتا ہے۔ گولکنڈہ کے قطب شاہی دور کی بابت شمل کا یہ بیان اہمیت کا حامل ہے:

"Arabic Studies gained more importance. The Qutbshahi kings were of Shia persuation spoke Telugu among themselves, but went to great lengths to attract Arabic Scholars and poets to their court; one may especially mention the philosopher Nizamuddin Gilani (d. 1649) hakim al mulk, a disciple of the Persian thinker Mir Damad."31

جین گونڈا سلسلہ کی متذکرہ اہم کتاب بعنوان SINDHI LITERATURE ۱۹۷۴ء میں اوٹو ہیرووزووٹز، وزبیڈن سے شائع ہوئی۔ سندھی ادب اور اس کی معاشرت سے شمل ایک خاص نوع کی انسیت رکھتی ہیں

اور یہاں تک کہ ماکلی قبرستان (ٹھٹھہ) میں پیوندِ خاک ہونے کی خواہش کا اظہار بھی ان کی جانب سے ہوا۔ شمل اس کتاب میں سندھی زبان کو نظر انداز کیے جانے پر گفتگو کرتی ہیں اور اس زرخیز زبان کے مختلف لہجوں کے بارے میں گرانقدر معلومات پیش کرتی ہیں۔۳۲ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ سندھی ادب سے شمل کا اولیں تعارف ارنسٹ ٹرمپ کے سبب ہوا جو انیسویں صدی میں، کراچی میں بیٹھ کر سندھ کی ثقافت اور زبان و ادب کی بابت اپنے براہِ راست تجربے اور مشاہدے کو بروئے کار لائے اور اہم علمی اضافہ کیے۔

شمل کی جانب سے سندھی زبان و ادب کے حوالہ سے ایک اہم تحقیقی مطالعہ بعنوان PEARLS FROM THE INDUS-SUDIES IN SINDHI CULTURE اوائل ۱۹۷۳ء میں سندھی ادبی بورڈ کو پیش کیا گیا۔ اس میں موجود منتخب مطالعات ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۴ء تک مکمل کیے گئے اور کتابی صورت میں اس کی پہلی اشاعت ۱۹۸۶ء میں ہوئی۔ اس وقیع تفحص سے قبل شمل سندھ دھرتی سے جڑے علمی، ادبی افکار اور تاریخی، ثقافتی حقائق کے ساتھ ساتھ اہم روحانی شخصیات کے احوال، تن دہی سے رقم کرتی رہیں۔ ان مطالعات کو پیش کرنے کا دور ۱۹۷۴ء سے ۱۹۸۳ء کو محیط ہے:

“In the meantime, the author has published a good number of other studies in Sindhi literature, thus; ‘Sindhi Literature’ in: Jan Gonda, History of Indian literautres, Wiesbaden 1974. The German Contribution to Pakistani Linguistics (a very much enlarged study of Ernst Trump) 1979. Merchen aus Pakistan (Folktales and Fairytasles from Pakistan), translated from the Sindhi, Cologne 1980..........(Marriage Songs from Sindhi villages), Schah Abdul Latif: Unendliche Sehnucht Munich 1983 (German verse translations from Shah Jo Risalo), As through a Veil. New York 1982 (with a chapter on religious folk poetry in the different Islamic languages). Makli Hill. A center of Islamic Culture in Sindh. Karachi 1983 and numerous other minor studies.33

کتاب کے جملہ مندرجات میں تعارف، تاریخی پس منظر، ارنسٹ ٹرمپ، سندھی زبان میں قرآنِ کریم کے تراجم، تفاسیر، رسولِ خدا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی تعظیم، منصور حلاجؒ، شاہ عنایتؒ، مرزا قلیچ بیگ اور ان کا ناول زینت اور آخر میں سندھی لوک ورثہ سے متعلق نئی اشاعتوں پر گفتگو موجود ہے۔ شمل معروف تاریخ دان بلاذری، حافظ ابنِ جریر طبری اور سندھ کے اہم قدیمی فرماں روا نصیر الدین قباچہ پر گفتگو کرتے ہوئے اپنی پسندیدہ شخصیت منصور حلاجؒ کو مرکزِ نگاہ بناتی ہیں اور ان کے سندھ میں آنے، قیام کرنے کے علاوہ فکرِ اقبالؒ میں اس عظیم روحانی شخصیت کی اہمیت کا اعادہ کرتی ہیں:

"Is it not fascinating to ponder the fact that the great Mysytic Al-Hussain ibn Mansur al-Hallaj, who is credited with the formula ana'l Haqq 'I am the Creative Truth' and who was executed in Baghdad in 922, reached the lower Indus valley in 905, proceeding from Gujrat? He wandered along the river until he reached the northern borders of present Pakistan.....we do not know...whether or not people responded to his missionary call- the call which should have awakened them from slumber and opened their blind and deaf hearts to bring forth a spiritual qiyama, a resurrection (as Muhammad Iqbal interpreted Hallaj's message in his Javidnama).34

شمل، ارنسٹ ٹرمپ اور پیر حسام الدین راشدی کی بابت گفتگو کرتے ہوئے بہت سے علمی نکات کی توضیح کرتی ہیں اور یہ بتاتی ہیں کہ یہ ایچ۔ ٹی۔ سورلے (H.T.Sorley) تھے جنھوں نے بھٹائی کو یورپ میں متعارف کرایا اور اٹھارہویں صدی کے وسط اول کی سیاسی، معاشی اور روحانی ترفع صورتوں سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ ان کے علاوہ شمل مخدوم محمد ہاشم (۱۷۶۲ء۔ ۱۶۹۲ء) کا ذکر کرتی ہیں جن کے وسیلہ سے سندھ میں نقشبندی سلسلے کا احیاء ہوا؛ علاوہ ازیں جو اہم شخصیت صراحت سے اس مطالعہ کا حصہ بنتی ہے وہ جھوک کے صوفی شاہ عنایتؒ ہیں۔

معروف اسلامی اسکالر ، سید حسین نصر کی مرتب کتاب -ISLAMIC SPIRTUALITY MANIFESTATIONS جو WORLD SPIRTUALITY کا والیم نمبر ۲۰ ہے میں شمل کا ایک انتہائی اہم مقالہ بعنوان Indo-Muslim Spirituality and Literature ملتا ہے۔ اس مقالہ میں شمل زور دے کر کہتی ہیں کہ اگر کوئی تاریخِ مذہب میں دلچسپی رکھتا ہے تو اسے ویدک اپنشد کو پیشِ نظر رکھنا ہو گا۔ یہ حکمت و دانائی کا منبع ہے؛ اسے فرانس کے پہلے باقاعدہ مشرق شناس آنکے توں ڈیپے غوں (Anquetil Dupperron) نے ۱۸۰۱ء میں لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ یہ مقالہ بھی شمل کی دیگر تحاریر کی مانند منصور حلاجؒ کی عظمتوں کا معترف ہے اور یہاں ان کے شخصی، علمی اثرات کا اختصار سے جائزہ لیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں چشتی ادب، قادری سلسلے اور تصوف کے متوازی مقامی ادب کی نشو و نما پر، شمل سیر حاصل گفتگو کرتی ہیں:

"With Bayazid Ansari, Pashto began to grow into an expressive literary language. His contemporaries Qadi Qadan in Sind (d. 958/1551) and Madho Lal Husayn in Lahore (d. 1001/1593) expressed their longing for the Divine beloved in short, touching verses in their mother tongues, Sindhi and Punjabi, respectively. They used, as most Sufis in the vernaculars did, Indian poetical forms."35

شمل کی جانب سے اس امر کی بھی صراحت کی گئی کہ کسی اور زبان میں نبی اکرم ﷺ کو ان کے مقامی اختصاص کے ساتھ اس طرح سے نہیں پکارا گیا جس طرح مقامی گیتوں اور ہند فارسی ادب میں آپؐ 'مکی' اور 'مدنی' ایسے القابات سے موسوم ہوئے۔ مولانا جلال الدین رومیؒ کا بھی حوالہ دیا گیا جن کی مثنوی بنگال میں پندرھویں (۱۵) صدی عیسوی میں تواتر سے پڑھی گئی اور یہ ان کا اثر تھا کہ شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ نے 'شاہ جو رسالو' کو ان کی مثنوی کی ساخت پر مرتب و تالیف کیا۔

اسلام اور برصغیر کے موضوع پر شمل کی ایک اہم کتاب ISLAM IN THE INDIAN SUBCONTINENT قارئین کی توجہ اپنی توجہ مبذول کراتی ہے۔ یہ پہلی بار ۱۹۸۰ء میں جرمن اور انگریزی زبانوں میں لیڈن (ہالینڈ) سے E.J.Brill کی جانب سے شائع ہوئی۔ راقم کے پیشِ نظر اس کی وہ اشاعت رہی جو سنگِ میل پبلی کیشنز کی جانب سے ۲۰۰۳ء میں سامنے آئی۔ کتاب، مسلم معاشرت سے متعلق بہت سے اہم موضوعات کا احاطہ کرتی ہے اور قارئین تک مختلف النوع معلومات بہم پہنچاتی ہے؛ مثلاً بابِ دوم جو آزاد ریاستوں کے عہد اور شیعہ اسلام کی نشوونما سے متعلق ہے میں شمل مالوہ کی خود مختاری اور پٹھان طرزِ تعمیر کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے گجرات، سومنات، غزنہ کے محمود، منصور حلاجؒ، عرب آبادکاری اور ایران کی فتح کے نتیجہ میں پارسیوں کا ہندوستان میں ورود، ان سب کی تفصیل فراہم کرتی ہیں۔ کاٹھیاواڑ کے معروف مندر 'سومنات' کی بابت محمود غزنوی کی مہم جوئی کا ذکر کتبِ تاریخ میں بکثرت ہے تاہم وہاں قائم ہونے والی ایک مسجد سے متعلق ذیل کا اقتباس دلچسپی سے خالی نہیں:

"Even more importantly, the mosque in Somnath, dated 1264, contains an inscription in Arabic and Sanskrit which deals, inter alia, with the donation for the shab-I barat (15. Sha`ban) and gives orders to send the surplus of incoming money to the holy cities. It can be assumed that the builders of these mosques belonged, as well as the Arabs settling along the Westcoast, to Shafiite madhhab."36

گجرات کے بارے میں شمل تغلق عہد کے خاتمہ اور گورنر مظفر خان کی خودمختاری (۱۴۰۷ء) کے اعلان اور دیگر تاریخی امور مندرج کرتے ہوئے بتاتی ہیں کہ حکومت کرنے کا مذہبی جواز مصر کی خلافتِ عباسیہ کے تفویض کردہ اختیارات سے حاصل کیا جاتا ہے اور اس ضمن میں فروری ۱۴۱۱ء میں باقاعدہ مسند نشینی عطا ہوتی ہے۔ ۳۷

فنِ خطّاطی کے موضوع پر شمل کی ایک اہم کتاب بعنوان CALLIGRAPHY AND ISLAMIC CULTURE دیکھی جاسکتی ہے جو پہلی بار نیویارک یونیورسٹی کی جانب سے ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی؛ دیگر متعدد کتب کی مانند یہ بھی ان کے دیے گئے مُحاضرات کا حاصل ہے؛ اور یہ ان کی خوش قسمتی اور مسلسل کام کرنے کی جستجو تھی کہ انھوں نے بہت سے مواقعوں پر جو گفتگو کی وہ آج کتابی صورت میں اقوامِ عالم سے دادِ تحسین حاصل کر رہی ہیں۔

۱۹۷۹ء میں ان سے خطاطی کے موضوع پر گفتگو کرنے کی درخواست کی گئی جو انھوں نے خوشدلی سے قبول کی اور ۱۹۸۲۔۱۹۸۱ء میں متذکرہ موضوع پر لیکچر دیے۔ شمل مسلم خطاطی کی دلدادہ تھیں اور ان کی متعدد تحریریں اس امر کو دال ہیں۔ ابتداًخطِ کوفی سے جدید عہد تک کی خطاطی، جن مراحل سے گزر چکی ہے قریباًوہ سب شمل کے پیشِ نظر تھے۔ یہ لیکچرز 'کیوریکن فاؤنڈیشن' (KEVORIKAN FOUNDATION) جو نیورک یونیورسٹی کا ایک اہم علمی مرکز ہے کی جانب سے دیے گئے۔ شمل کی جانب سے یہ صراحت موجود ہے کہ ان محاضرات کو رسمی انداز میں پیش کیا گیا البتہ یونیورسٹی میں موجود ڈیجیٹل میڈیا کے وسیلہ سے مختلف رنگوں کی سلائڈ کا استعمال ہوا۔ ترکی الفاظ کی بابت جدید ترکی لہجہ کو فوقیت دی گئی۔ سنین عیسوی اعتبار سے ترتیب دیے گئے البتہ جہاں کہیں ہجری تاریخ کا مذکور ہونا ناگزیر محسوس ہوا تو اسے رقم کرنے میں تأمل نہ کیا اور درست طور پر لکھنے کا جتن ہوا۔ خطاطی کی جملہ صورتوں اور اس کے مختلف ادوار کی بابت گفتگو کرتے ہوئے شمل یہ واضح کرتی ہیں کہ یہ حضرت علیؓ ابن ابی طالبؓ تھے جو خطِ کوفی کے موجد تھے:

"It seems, however, that Kufa was indeed one of the important centers for the art of writing, and the political connection of Ali ibn Abi Talib with the city accentuates the generally maintained claim that Ali was the first master of calligraphy. Later generations ascribe to him the invention of the 'two horned alif' which may be the shape found in early inscriptions and called ' split arrowhead alif."38

سلطان علی مشہدی (۱۵۲۰۔۱۴۵۳ء) جو خطِ نستعلیق کے بڑے استاد تھے کی بابت شمل کا یہ کہنا ہے کہ وہ اپنی خطاطی کے شہرہ کا سبب نامِ نامی جنابِ 'علیؑ' کو قرار دیتے تھے۔

زبانِ عربی کا پہلا چھاپہ خانہ اٹلی اور پھر ہالینڈ میں قائم ہوا؛ تاہم عیسائی عناد کے باعث، اسلامی دنیا میں یہ چھاپہ خانے زیادہ فروغ نہ حاصل کر سکے۔ مشرقی کوفی خط، کاغذ اور اسی خط میں قرآن لکھنے کی بابت شمل کی یہ رائے اہمیت کی حامل ہے:

“The first known example of Eastern Kufi is dated 972. Eastern Kufi Korans belong to a period when art of the book had developed considerably, mainly because of the introduction of paper in 751, and are frequently written on paper instead of vellum; the vertical format used for profane works was adopted also.39

اسلامی ناموں سے متعلق ایک اہم اور منفرد کتاب بعنوان ISLAMIC NAMES دستیاب ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ شمل مسلم اسمأ کی بابت خاص دلچسپی رکھتی تھیں اور اس ضمن میں ان کا ترکی میں قیام اہمیت کا حامل ہے۔ ایک جدید مسلم معاشرہ میں بیٹوں، بیٹیوں کے نام رکھنے میں جو احتیاط رکھی جاتی ہے اسے شمل بغور دیکھ رہی تھیں اور خود ان کا نام ترکی میں 'جمیلہ' رکھا گیا، بعض نزدیک کے ملنے والے اُنھیں اِس نام سے بلاتے رہے۔ یہ کتاب جسے سنگِ میل پبلی کیشنز نے ۲۰۰۵ء میں لاہور سے شائع کیا پہلی بار ایڈن برگ یونیورسٹی پریس کی جانب سے ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی۔

کتاب کے جملہ ابواب میں تنوع موجود ہے؛ مثلاً باب اوّل، نام کی ساخت یعنی اسم، کنیت، نسب اور لقب کو گفتگو کا حصہ بناتا ہے۔ بابِ دوم اُن بچوں کے اسماء پر مشتمل ہے جو بروز جمعہ پیدا ہوئے۔ بابِ سوم مذہبی نام اختیار کرنے اور خدا سے مدد حاصل کرنے اور بابِ چہارم خصوصی طور پر بیٹیوں کے نام امہاتؓ المومنین کے اسمائے مقدسہ پر رکھنے سے متعلق ہے۔ بابِ پنجم اسد، چاند اور گلاب کے پھولوں کا عنوان لیے ہوئے ہے اور اس میں عرف اور القاب سے

متعلق گفتگو موجود ہے۔ بابِ ششم کا موضوع بھاری بھر کم نام رکھنے اور پھر انھیں تبدیل کرنے سے متعلق ہے، غرض یہ وہ بو قلمونی ہے جو کتاب کے مطالعہ کو سزاوار ہے۔

بابِ چہارم میں، شمل مسلم معاشروں میں جنم لینے والی ان بیٹیوں کی بابت گفتگو کرتی ہیں جن کی پے در پے پیدائش ان کے والدین کے لیے زحمت کا موجب ہے، اور اس دُختر بیزاری میں کوئی ایک علاقہ یا جغرافیہ شامل نہیں:

“But what is to be done when Fate gives a family one daughter after another? The fourth girl could simply be called Rabi’a ‘fourth’, and the following might also be numbered. But there are more eloquent expressions of disappointment: one may call a girl Kifaya ‘Sufficience’ (Yemen) or Kafi, ‘enough’, Khatima, ‘Finis!’ (Tashqurghan), Haddi, ‘Stop!’ (Tunis), Seddena, ‘may we be done (with the girls)’ (Bedouin); Done, turn over (to sons)’, Gidi, ‘Off with you!’ or Yeter, ‘Enough!’ in Turkey. In the Egyptian countryside the Eight daughter of a family was called ‘Ud wa’skut’, ‘Count and be quiet!’, and in a Persian tale the parents’ sigh Allah bas, ‘God (it is) enough’ became poor girls name. Dukhtrabus ‘ enough Daughters’ or Hamin bas ‘enough of Such ones’ still occurs in Iran, as does Nakh asteh, ‘unwanted’.40

یہ سب کچھ مسلم معاشروں تک ہی محدود نہیں بلکہ دیگر ثقافتوں اور مذاہب کے ماننے والوں کے ہاں بھی اس دختر بیزاری کے قوی آثار ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ ہمارے پڑوسی ملک بھارت میں، کچھ ہی عرصہ قبل، قریباً ۲۸۵ لڑکیوں کے نام تبدیل کرنے کی ایک تقریب کا اہتمام ہوا، جس میں ان کو دیے گئے ناپسندیدہ ناموں سے چھٹکارہ دلایا گیا؛ یعنی ان بدقسمت لڑکیوں کو ان کی پیدائش کے موقع پر ایسے نام دیے گئے جن سے بیزاری اور برأت کا اظہار ہوا۔ غرض ہندی میں 'Nakushi' ایسے الفاظ 'ساوتری' اور 'وشالی' میں تبدیل کیے گئے۔

شمل سولہویں صدی عیسوی میں جہاں مغل خواتین کے ناموں کی بابت بہت سی اہم معلومات کا تبادلہ کرتی ہیں وہیں وہ ترکی اور افغانستان میں مختلف پھولوں کی نسبت رکھے گئے نام بھی گنواتی ہیں جو دلچسپی سے خالی نہیں۔اس سے پھولوں کا اک جہانِ نو وجود ہوتا ہے۔نوع نوع کے پھول اپنے خواص کی بنیاد پر خواتین کے ناموں کے لیے منتخب ہوئے اور انھیں شخصی شناخت کا خوبصورت حوالہ بنانے کی شعوری کوشش موجود رہی:

"Among the Mughal ladies of sixteenth-century India, one finds Gulbadan 'rose-body', Gulrukh, Gulru, Gul'adhar, 'rose-face', Gulbarg, 'rose-petal', Gulrang, 'rose-coloured', Gulshan and Gulistan 'rosegarden', Gul-I ra'na, 'lovely rose'. Among modern Turks we encounter, besides the names just mentioned, Guldali, 'rose-twig', Gulfiliz, 'rose sprout', Gulseren, 'spreading roses', Gulcin, 'gathering roses', Gulbahar, 'rose-spring', Gulbun, 'rose root', Gulperi, 'rose fairy' and even Ozgul, 'the self [is] a rose'. Charming also are Baghda gul, 'rose in the garden' and Yurdagul, 'a rose for the country'....."41

فارسی شاعری کی تمثال کاری کی بابت ایک کتاب بعنوان A TWO COLOUR BROCADE-THE IMAGERY OF PERSIAN POETRY شمل کی کتب میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔یہ کتاب بھی شمل کی دیگر کتب کی مانند ان کے محاضرات کا حاصل ہے جو قریباً دو عشروں تک ہاورڈ یونیورسٹی میں پیش کیے جاتے رہے۔یہ پہلی بار یونیورسٹی آف نارتھ کیرولائنا پریس کی جانب سے ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی۔پاکستان میں سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور کی جانب سے ۲۰۰۴ء میں مطالعہ کے لیے پیش کی گئی۔

شمل کے یہ محاضرات، درحقیقت ہاورڈ یونیورسٹی کے ان طلباً کے لیے تھے جو فارسی ادب سے نابلد تھے چنانچہ ان طلباً کی شعری تربیت کے لیے ایک بھرپور ادبی پس منظر کی پیش کش مناسب خیال کی گئی۔شمل ہاورڈ میں منٹ رائس(MINUTE RICE)اسکالر شپ کے لیے منتخب ہوئی تھیں اور ان کی اہم ذمہ داریوں میں مطالعۂ غالبؔ اور ان کے شعری تراجم تھے۔غرض فارسی زبان وادب کا قریباً ایک ہزار برس کو محیط یہ علمی، تفہیمی بیانیہ

نووارادانِ دانش گاہ کے لیے ایک غیر معمولی تجربہ تھا جسے کمال صراحت سے شمل نے پیش کیا؛ اس لیے عام سہل انداز پر جملہ شعری و فکری نکات کی تسہیل اور توضیح کے لیے انھیں ایک مبتدیانہ اسلوب اختیار کرنا پڑا۔ یہ وہ غالب اسباب ہیں کہ کتاب کے جملہ مبادیاتی ابواب میں فارسی شاعری کے ناگزیر روایتی عناصر قافیہ ردیف، بیان کے جملہ قوانین، تاریخ، ادب اور اساطیر کے ساتھ قرآنی موضوعات، اسلام کے بنیادی ارکان، شرائط، عقائد و نظریات، ترک اور ہندو، شعری جغرافیہ، پرندوں کی زبان، فلک، صبا، سمندر، نوع نوع کی مخلوقات، چرند پرند، اَجساد، خطاطی، ابجد، فن موسیقی، ضیافتیں، تقریبات، درباری مشاغل، وقت گزاری، حقیقت اور خواب غرض ایسے تمام امور زیرِ بحث لائے گئے یا ان سے تعارض برتا جو کسی نہ کسی حوالہ سے تفہیمِ شعر میں معاون ہیں۔

شمل کے لیکچر اول اول ان کی جرمن کتاب جو ۱۹۸۴ء میں بعنوان STERN UND BLUME شائع ہوئی میں شامل تھے۔ یہ عنوان جرمن رومانوی شاعر CLEMENS MARIA BRENTANO (1778-1842) کے ایک مصرعہ سے لیا گیا ہے۔ کتاب کے تعارف میں شمل ایرانی مسجد کی رنگارنگ اینٹوں کی بابت انتہائی متاثر کن گفتگو کرتی ہیں:

"One may think of the colorful tiles in Persian mosques, which look different at every hour of the day and are often reflected in little ponds, where their mirrored images assume still other colors to delight the patient spectator."42

کتاب کے تعارف میں شمل حافظ شیرازی کے پہلے آسٹرین مترجم JOSEPH VON HAMMER-PURGSTALL (1774-1856) اور انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے والے معروف برطانوی مستشرق A.J.ARBERRY (1905-1969) کے حوالہ سے بات کرتے ہوئے یہ واضح کیا کہ حافظ کی شاعری بعینہ کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا آسان نہیں۔ اسی پیرائے میں شمل یہ بھی بتاتی ہیں کہ لاطینی زبان میں حافظ کی چند نظموں کا ترجمہ پہلی بار سر ولیم جونز (۱۷۴۶-۱۷۹۴) اور COUNT REVITZKY نے بالترتیب ۱۷۷۱ء اور

۱۸۱۲ـ۱۸۱۳ء مکمل ترجمہ ۱۸۱۲ـ۱۸۱۳ء جنھوں نے دیوان کا HAMMER-PURGSTALL تھے ۱۷۷۴ء میں کیا؛ تاہم یہ

میں کیا اور جرمن زبان بولنے والوں کو حافظ سے متعارف کرایا، اور یہی وہ مُترجَم کاوش تھی جو گوئٹے کے دیوانِ مغرب کی تالیف کا سبب بنی جس میں انھوں نے حافظ اور دیگر فارسی شعراء کی خلاّقانہ اہلیت کو بطریقِ احسن پیش کیا۔ علاوہ ازیں رکرٹ (RUCKERT 1788-1866) اورالسیندروبوسانی

(ALESSANDRO BAUSANI 1921-1988) کی اہمیت بتاتے ہوئے پراگ میں اردو کے فروغ کی بابت اہم معلومات بہم پہنچائیں؛وہ بی تھوون (Beethoven) سے مولانا رومؒ اور موزارٹ (Mozart) سے حافظ کاموازنہ کچھ یوں پیش کرتی ہیں:

"To me, the verse of Hafiz has the same transparent beauty and harmonious perfection that Mozart's music has, and in Rumi I feel the same pressing, searching power as in Beethoven."43

معروف اسماعیلی داعی، شاعر اور صوفی ناصرِ خسرو کے دیوان سے منتخب کلام اور اس کے تعارف میں شمل کا مطالعاتی کام بعنوان MAKE A SHIELD FROM WISDOM-SELECTED VERSES FROM NASIR-I KHUSRAW'S DIVAN اسماعیلی ادارہ (THE INSTITUTE OF ISMAILI STUDIES-LONDON) کی معاونت اور I.B.TAURIS کی جانب سے نظرِ ثانی اشاعت ۲۰۰۱ء میں ممکن ہوئی جبکہ پہلی بار یہ کتاب ۱۹۹۳ء میں .KEYGAN PAUL INTERNATIONAL LTD کی جانب سے شائع ہوئی۔ شمل نے اسماعیلی مکتبۂ فکر کے باہم اشتراک سے ایک سے زائد علمی منصوبوں پر کام کیا اور ان کی یہ علمی کارگزاری بھی ایک طرح سے مذکورہ مکتب کی علمی و ادبی کاوشوں کی تشہیر کی ایک صورت ہے جو لائقِ ستائش ہے۔ اس کتاب میں ناصرِ خسرو بحیثیت شاعر، شاعری کے جملہ مندرجات اور منتخب نظموں کا تعارف بہتر انداز پر پیش کیا گیا ہے۔ شمل معروف برطانوی مستشرق براؤن (E.G.BROWNE 1862-1926) کے حوالہ سے

اپنے ممدوح کو شاندار خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے یہ بتاتی ہیں کہ سادگی، حصولِ علم، اخلاص، عقیدے کی پاسبانی، بے خوفی، جرأت، خوشامدیوں اور وقت گزاری کرنے والوں کی مذمت کرنا یہ وہ جملہ اختصاصات ہیں جو کسی اور فارسی شاعر کے ہاں یکجا نظر نہیں آتے۔ ناصرِ خسرو پر مغرب میں جو مؤقر کام ہوا، اس کی بابت شمل کچھ یوں گویا ہیں:

"The work of the Persian author in both its philosophical and poetical aspects has been known in the West for more than a century. Around 1880, one observes an increasing interest in his writings: Hermann Ethe's edition and German verse translation of the Rawshana i nama in the Zeitschrift der Deutschen Morgenlandischen Gesellschaft 1879 and 1880 should be mentioned as the first major attempt to understand Nasir i Khusraw; this study was followed by E.Fangan's translation of the Saadatnama, again in 1880 in the same scholarly journal. Ethe himself published some translations of qasidas in the year 1882."44

شمل اپنے ممدوح کی جنم بھومی اور ان کی پیدائش کی بابت بات کرتے ہوئے ان کی جملہ تصانیف کا تعارف بھی احسن انداز پر پیش کرتی ہیں؛ علاوہ ازیں اسماعیلی مکتب، ابو الاعلیٰ معرّی، تذکرہ دولت شاہ اور ابوالحسن خرقانیؒ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے اس تاریخی حقیقت کی جانب توجہ مبذول کراتی ہیں کہ یہ فاطمینِ مصر تھے جنھوں نے ۹۷۰ء کے لگ بھگ جامعۃ الازہر کی بنیاد رکھی اور جو آج سنّی مکتبہ فکر کی فقہی اور علمی ضرورتوں کی اہم دانش گاہ ہے:

"The Fatimids finally wrested Egypt from the Ikhshidids, the semi-independent viceroys of the Abbasids, and founded the city of Cairo, whose very name al-Qahira al-Mu izziyya, 'the vanquishing (city) of Mu 'izz', points to its importance. Al-Mu 'izz, the first Fatimid caliph of Egypt, set up a strong rule, and soon the famous alAzhar, mosque and

theological school, was founded to grow into one of the most important universities in the Middle East. It was converted into a Sunni theological school two centuries later, after the Fatimid rule had been replaced, in 1171, by the Sunnite Ayyubids."45

مغل سلطنت کی بابت ایک اہم کتاب بعنوان THE EMPIRE OF THE GREAT MUGHALS-HISTORY, ART AND CULTURE سامنے آتی ہے جس کے مترجم CORINNE ATTWOOD ہیں اور اس کے مرتب BURZINE K.WAGHMAR ہیں۔ یہ کتاب پہلی بار معروف جرمن اشاعتی ادارے Verlage C.H.Beck کی جانب سے ۲۰۰۴ء میں شائع ہوئی۔ راقم کے زیرِ مطالعہ کتاب ۲۰۰۵ء میں سنگِ میل پبلی کیشنز کی جانب سے شائع ہوچکی ہے۔کتاب کے تعارف میں فرانسس روبنسن(FRANCIS ROBINSON) شمل کو شاندار خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ کسی اور اسکالر کی جانب سے مغل عہد کی ثقافتی فتوحات کا اس قدر جامع مطالعہ پیش نہ ہوا جو شمل کے حصہ میں آیا۔ کتاب کے جملہ نو ابواب تاریخی تعارف سے آغاز کرتے ہوئے دربار، شہنشاہت، مذہب، خواتین در دربار، ایک مرزا کی زندگی، زبان و ادب اور آرٹ ایسے موضوعات کا کامیابی سے احاطہ کرتے ہیں۔ کتاب کا باب ہفتم 'حیاتِ مرزا' سے متعلق ہے۔ اس میں مرزا قوم کی طرزِ بودوباش، نشست و برخاست اور آداب و اکرام کی بابت اہم معلومات مندرج ہیں؛ یہاں تک وہ لباس بھی مذکور ہیں جنھیں ان کے ہاں معمول کے مطابق پہنا جاتا تھا۔ مرد حضرات کو کن چیزوں کا خیال رکھنا ہے، کن عادات و اطوار کا مالک ہونا چاہیے اور زندگی کو کس رنگ ڈھنگ سے گزارنا ہے غرض ہر چھوٹی بڑی شے کی تفصیل موجود ہے:

"The mirza should be a lover of flower; however only on very exceptional occasions should he place in his turban a rose he had picked himself. When bathing, he should use one brush for his body and another for his feet, and his attendant should not have a beard (so that no hairs fall upon him). The mirza should wear rings of rubies, emeralds,

turquoise and carnelian, as each of these stones has its own characteristics; however rubies, according to the second Mirzanama, are to be preferred above all other stones."46

باب ہشتم زبان و ادب سے متعلق ہے، اور شمل یہ واضح کرتی ہیں کہ مغل دورِ حکومت میں، ادب کی تمام سطحیں، شاعری سے معروف صوفیانہ کلام اور اعلیٰ درجہ کی نثری تخلیقات سے تاریخیت تک کے جملہ موضوعات کا کمال دلنشیں انداز میں احاطہ کیا گیا۔ اس باب کا وصف یہ ہے کہ اُس عہد کی قریباً تمام بولی جانے والی اہم زبانوں کے بارے مبحث موجود ہے۔ یعنی عربی، ترکی، سنسکرت، ہندی، فارسی، پشتو، سندھی، پنجابی، اردو، براج، پوربی وغیرہ کا ذکر بصراحت توجہ مبذول کراتا ہے۔ شمل نے اردو کی آبیاری میں زینت النساء مسجد کا ذکر خاص طور سے کیا:

"Khan-I Arzu (died 1756) being chiefly responsible for establishing the 'rules' of the nascent literary tradition. The poets gathered.... in a small mosque, the Zinatal-masjid in Delhi, which had been constructed under the auspices of Aurangzeb's daughter Zinat un-nisa, who unlike her sister Zib un-nisa, Aurangzeb's other daughter, did not compose Persian lyrics. However, the mosque she established played a vital role in the establishment of Urdu literature."47

مولانا رومؒ جو شمل کی اسلام اور مسلم تصوف سے گہری وابستگی کی اساس ہیں کی بابت ایک جامع اور منفرد مطالعہ بعنوان I AM WIND, YOU ARD FIRE-THE LIFE AND WORK OF RUMI کو خاص طور سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۹۲ء میں اشاعتی ادارہ شمبھالہ، بوسٹن کی جانب سے شائع ہوئی اور یہ ان کی پیش کردہ جرمن کتاب ICH BIN WIND UND DU BIST FEUER کا ترجمہ نہیں۔ کتاب کے آغاز میں دی گئی خطاطی شمس انوری کی ہے اور کتاب کا موضوع مولانا کی زندگی اور ان کے بسیط فکری کمالات کو نمایاں کرنا ہے۔ ہم بخوبی جانتے ہیں کہ دینِ اسلام کی سربر آوردہ شخصیات جن سے شمل اِک گونہ انسیت رکھتی ہیں میں مولانا رومؒ سرِ فہرست ہیں۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ اس ایک واحد موضوع پر شمل کی متعدد کتب کو جانچا جا سکتا ہے۔

یہ مذکورہ کتاب بعینہ سنگِ میل پبلی کیشنز کی جانب سے بعنوان RUMI'S WORLD–THE LIFE AND WORK OF THE GREAT SUFI POET سن ۲۰۰۳ء میں شائع ہو چکی ہے اور اس بابت صراحت بھی موجود ہے۔ دونوں کتب کے ابواب ایک سے ہیں۔ یہاں تک کہ صفحات کی تعداد میں بھی ردّ و بدل نظر نہیں آتا۔ شاید کتاب کی تشہیر اور اس کی فروخت کے معاملات آڑے آنے کے سبب اس کا صدر عنوان تبدیل کیا گیا۔ تاہم کچھ بھی کہیں ، مولانا رومؒ کی بابت یہ ایک لائقِ ذکر تفحص ہے اور اس سے پیشتر ہمیں ایک اور اہم مطالعہ بعنوان THE TRIUMPHAL SUN–A STUDY OF THE WORKS OF JALALODDIN RUMI نظر آتا ہے جس کے حوالہ سے مناسب مقام پر گفتگو رقم ہو چکی ہے۔ غرض یہ ایک پے در پے علمی سلسلہ ہے جسے شمل نے قائم رکھا اور مولانا کی بابت پر شکوہ تحقیقی روایت کو فروغ حاصل ہوا۔

شمل اپنی سوانح میں انتہائی محبت اور شیفتگی سے مولانا رومؒ کے مزار پر حاضری اور دورانِ سفر معجز نما کیفیات کا ذکر، ایک سے زائد بار کرتی ہیں کچھ یہی رنگ یہاں بھی موجود ہے:

"I used to travel the road from Ankara to Konya often, and now whenever I speak of it I think of that Anatolia of the 1950s, before the boom in building and modernization began; it was a time when one still felt much closer to Maulana's own age, the thirteenth century, when every step on the road was so to speak a step on a spiritual pilgrimage. Every stone, every tree seemed to translate Rumi's message into its own silent language for those who had eyes to see and ears to hear."48

شمل کی آپ بیتی Orient and Occident– My life in East and West پہلی بار ۲۰۰۷ء میں سامنے آئی جبکہ موضوعِ بحث کتاب قریباً پندرہ برس قبل ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی۔ غرض یہ عشق و انسیت کا ایک ایسا والہانہ لگاؤ تھا جس کی شمل عمر بھر اسیر رہیں۔ مولانا کو جن نامور مستشرقین نے مغرب میں متعارف کرانے کی مقدور بھر کوشش کی ان میں شمل کا نام اس اعتبار سے ممتاز رہے گا کہ یہ ہستی شمل کے لیے محض ایک علمی اور تحقیقی مرکزہ کی

حیثیت نہ رکھتی تھی بلکہ عرفانِ ذات اور قلبِ ماہیّت کا وسیلہ بھی تھی اور یہ آموختہ وہ لوئی میسی یوں سے حاصل کر چکی تھیں۔ مولانا رومؒ کی درست سمت میں پہچان اور ان کے شخصی، علمی مقام کی بابت یہ کتاب کسی مکاشفے سے کم نہیں۔

کتاب کے باب سوم میں شمل نے مولانا رومؒ کے جملہ استفادات کو انتہائی دقت سے نمایاں کیا ہے اور مشرق و مغرب کے قاری کو ان گوشوں سے متعارف کرایا جو عموماً جذباتیت اور عقیدت کے غلبے تلے گمنام رہتے ہیں۔

متنبی کے شاندار قصائد، مقاماتِ حریری، ابوالفرج اصفہانی کی کتاب الاغانی جسے شمل THE BOOK OF SONGS کہتی ہیں، رودکی کی مثنوی کلیہ و دمنہ ، ابو حامد الغزالیؒ، خاقانی ، انوری، سنائیؒ اور فرید الدین عطارؒ ایسی شخصیات مولانا کے شعری افکار پر گہرے اثرات مرتسم کیے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض اکابر ایسے بھی ہیں کہ جن کے وسیلہ سے مثنوی میں مختلف کہانیاں بیان ہوئیں مثلاً الغزالیؒ کی احیاء علوم الدین جن کی بابت مولانا نے کبھی اعتراف نہ کیا۔ ۴۹

مولانا نے اپنی شاعری کے ضمن میں اس امر کا بھی اعتراف کیا کہ اوزان اور بحور کے سبب بیشتر گفتگو تشنہ رہ گئی اور اس بے بسی کو شمل نے کمال مہارت سے نمایاں کیا:

"But the enraptured mystic sometimes complains of the fetters of meter and form, and there are verses-probably from the earliest period-in which he simply fills a line with the traditional Arabic catchwords for meters, fa ilatun mufti ilun, or fa ilatun failatun, and he may sigh, 'This fa ilatun mufti ilun has killed me,' or he says in an Arabic ending:

My friends and physician fills the cup-leave

The fa` 'ilun mufti 'ilun and fa` 'ilatun and fa 'l

Elsewhere, he sighs:

Half a ghazal remained unspoken in my mouth

But alas, I have lost head and foot!"50

علاوہ ازیں شمل نے مثنوی کا فارسی متن اور اس کا انگریزی ترجمہ بھی پیش کیا اور اُن جملہ مضامین، استعارات، تلمیحات اور تکنیکی خصائص کی بابت توجہ مبذول کرائی ہے جو مولانا کی شعری کائنات کے اہم اجزا ہیں۔ ان کی غزل کے بارے میں شمل کا یہ کہنا ہے کہ ان میں زندگی کا بھرپور، پر لطف تجربہ موجود رہتا ہے اس لیے وہ صناعی یا مہارت نہیں ملتی جو حافظ اور جامی کی تراشدہ ہیرے کی مانند غزلوں میں مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔۵۱

شمل کے شعری تراجم میں بعض جگہوں پر تسامحات نظر آتے ہیں جن کی بابت ڈاکٹر تحسین فراقی بالتفصیل اپنے ایک اہم مضمون " این میری شمل بحثیت غالب شناس۔۔۔چند معروضات " میں کر چکے ہیں؛ یہاں بھی کچھ ایسی ہی صورتحال کا سامنا ہے تاہم راقم ان کی نشاندہی آخری بابِ یعنی بابِ پنجم میں کرنا مناسب سمجھتا ہے۔

حواشی

بابِ چہارم:

1: Schimmel, Annemarie. Mystical Dimensions of Islam. Lahore, Pakistan: Sang-E-Meel Publications, 2003. Print. P. xvii

2: Ibid. P. 25

3: Ibid. P.27

4: Ibid. P.41

5: Ibid. P.61

6: Ibid. P.70

7: Ibid. P.78

8: Ibid. P.93

9: Schimmel, Annemarie. And Muhammad Is His Messenger: The Veneration of the Prophet in Islamic Piety. Lahore District (Pakistan: Sang-e Meel Publications, 2008. Print.P.6

10: Ibid. P. 7

۱۱: محمد بن عیسیٰؒ ابو عیسیٰؒ ۔ جامع ترمذی، جلد دوم۔ لاہور: اسلامی اکادمی، س۔ن۔ ص ۲۳۷

۱۲: محمد مہدی، فاسی، امام، علامہ۔ مطالع المسرات شرح دلائل الخیرات۔ لاہور: نوریہ رضویہ پبلی کیشنز، جون ۲۰۰۰ء طبع اول، ص ۴۶۵

13: www.hawzah.net/fa/magazine/view/4693/4714/37587/

14: Schimmel, Annemarie. And Muhammad Is His Messenger: The Veneration of the Prophet in Islamic Piety. P. 130

15: Schimmel, Annemarie. Deciphering the Signs of God: A Phenomenological Approach to Islam. Lahore, Pakistan: Sang-E-Meel Publications, 2006. Print.Preface

16: Ibid. Introduction.

17: Ibid. p. 51,52

18: Schimmel, Annemarie, and Abdoldjavad Falaturi. We Believe in One God: The Experience of God in Christianity and Islam. London: Burns & Oates, 1979. Print.P.155

19: Ibid. P.159,160

20: Schimmel, Annemarie. The Triumphal Sun: A Study of the Works of Jalāloddin Rumi. London: East-West Publications, 1980.Print. Preface

21: Schimmel, Annemarie. Aspects of Mevlana 1971. Ankara: Guven Matbaasi, 1971. Print. P.5

22: Ǧalāl-ad-Dīn, Rūmī, Ingrid Schaar, and Annemarie Schimmel. Look! This Is Love: Poems of Rumi. Boston [u.a.: Shambala, 2003. Print. P.9

23: Ibid. P. 18, 19

24: Schimmel, Annemarie, and Javad Nūrbaẖš. Nightingales Under the Snow. London [u.a.: Khaniqahi Nimatullahi Publ, 1997. Print. P. 20

25: Schimmel, Annemarie, and Susan H. Ray. My Soul Is a Woman: The Feminine in Islam. New York: Continuum, 1997. Print. P.22, 23

26: Ibid. P.20

27: Schimmel, Annemarie. As Through a Veil: Mystical Poetry in Islam. Oxford: Oneworld, 2001. Print. P. ix

28: Ibid. P.6

29: Ibid. P.172

30: Schimmel, Annemarie. Islamic Literatures of India. Wiesbaden: O. Harrassowitz, 1973. Print. P.7

31: Ibid.

32: Schimmel, Annemarie. Sindhi Literatures. Wiesbaden: O. Harrassowitz, 1974. Print. P.2, 3

33: Schimmel, Annemarie. Pearls from the Indus: Studies in Sindhi Culture. Jamshoro, Pakistan: Sindhi Adabi Board, 1986. Print. Foreword

34: Ibid. P.02

35: Nasr, Hussain, Syed. Islamic Spirituality-Manifestations. New York: Crossroad, 1987. Print. 366

36: Schimmel, Annemarie. Islam in the Indian Subcontinent. Lahore: Sang-e-meel Publications, 2003. Print. P.65

37: Ibid. P.66

38: Schimmel, Annemarie. Calligraphy and Islamic Culture. London: Tauris, 1990. Print. P.3

39: Ibid. P. 7

40: Schimmel, Annemarie. Islamic Names. Lahore: Sang e meel publications, 2005. Print. P.42

41: Ibid. P.44, 45

42: Schimmel, Annemarie. A Two-Colored Brocade: The Imagery of Persian Poetry. Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2004. Print. P.03

43: Ibid. P.9

44: Nāṣir-i, Khusraw, and Annemarie Schimmel. Make a Shield from Wisdom: Selected Verses from Nāṣir-I Khusraw's Dīvān. London: I.B. Tauris, in association with the Institute of Ismaili Studies, 2001. P.1

45: Ibid. P.7

46: Schimmel, Annemarie, and Burzine K. Waghmar. The Empire of the Great Mughals: History, Art and Culture. Lahore: Sang-E-Meel Pub, 2005. Print. P. 227

47: Ibid. P.257

48: Schimmel, Annemarie. I Am Wind, You Are Fire: The Life and Work of Rumi. Boston: Shambhala, 1992. Print. P. 1, 2

49: Ibid.P. 36

50: Ibid.P.38

51: Ibid.P.45

محاکمہ:

ڈاکٹر آنیماری شمل کا تعلق مستشرقین کے اس قبیل سے ہے جو اسلام اور بانئ اسلام کی بابت ایک متوازن اور بڑی حد تک ہمدردانہ رویّہ رکھتا ہے، اور اس کا بڑا سبب، ان کی وہ ابتدائی تربیت اور گھر کا کشادہ ماحول تھا جس کے سبب ان کی انفرادی صلاحیتوں کو جلا حاصل ہوئی اور وہ لوئی میسی یوں، براؤن، پکھتل، آربری، بوسانی، حامد الگر اور چیٹک کی مانند مسلم دنیا میں معروف و مقبول رہیں۔ ان میں سے بعض مستشرقین مشرف بہ اسلام ہوئے اور یہ رجحان انیسویں اور بیسویں صدی میں تسلسل سے غالب رہا۔ شمل کے والدین پروٹیسٹنٹ فرقہ سے متعلق تھے تاہم دیگر مذاہب اور ثقافتوں کی بابت ان کا اندازِ نظر فراخی اور انسیت لیے ہوئے تھا۔

مشرق اور بالخصوص اسلام کی بابت ذاتی میلانات کے اسباب جہاں تہذیبی اور معاشرتی تھے وہیں ان کا ایک بڑا سبب، اُس وقت کی مجموعی عالمی فضا تھی جو شعوری اور لاشعوری طور پر جرمن معاشرہ پر اثر انداز ہو رہی تھی؛ اگرچہ شمل کم سِن تھیں اور وہ درست طور پر عالمی افق پر موجود سیاسی شفق کو دیکھ نہ سکتی تھیں تاہم ترکوں اور عربی زبان سے رغبت کے پسِ پردہ جنگِ عظیم اوّل کے جملہ نتائج اور وقوعات تھے جن سے اعراض برتنا آسان نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اس عالمی جنگ میں ترک اور جرمن قوم متحد تھے اور نتیجتاً ترکوں کو سلطنتِ عثمانیہ، خلافت اور ایک بڑے زمینی ٹکڑے سے نہ صرف محروم ہونا پڑا بلکہ اپنی بقاؑ کی بھاری قیمت بھی ادا کی۔ اس سے کسی قدر مختلف انداز میں جرمن قوم نے بھی شکست کا خمیازہ بھگتا۔ غرض دونوں قوموں کی مشترک عسکری جدوجہد اور ایک سے ناپسندیدہ نتائج کا سامنا، ان کے مابین پہلے سے موجود تہذیبی اور ثقافتی روابط میں فروغ کا سبب بنا۔

شمل نے جس فضا میں آنکھ کھولی وہ بڑی حد تک اسلام، عربی زبان اور ترک قوم کی بابت ایک مثبت رخ لیے ہوئے تھی۔ جرمن قوم، مغرب کی دیگر اقوام کے برعکس اسلام، مسلم تصوف اور مشرق کی روحانیت کو بہ نظرِ تحسین دیکھ رہی تھی۔ خشک فلسفیانہ افکار اور ہمسایہ اقوام کی حد سے بڑھی ہوئی مادہ پرستی کہ جس کی ایک صورت نوآبادیاتی منڈیاں تھیں سے بیزار ہوتے ہوئے جیکب رائسکے، ہیمر پوگسٹل، آگسٹ ووں پلیٹن، رکرٹ اور گوئٹے ایسے نابغۂ روزگار نے مشرق کی طرف دیکھا اور ان کا یہ دیکھنا حصولِ علم اور روحانی ترفع کے لیے تھا جس سے وہ جرمن قوم میں ایک نیا تحرک پیدا کرنا چاہتے تھے۔ مشرق میں جرمنی کی ایک کالونی بھی نہ تھی۔ حافظ شیرازی، مولانا رومؒ اور دیگر اکابر شعراء کا تواتر سے ترجمہ کیا جا رہا تھا، یہاں تک کہ جرمنی میں غزلیں کہی جا رہی تھیں اور جرمن شعراء فارسی اور اردو شاعروں کے تتبع میں تخلص استعمال کر رہے تھے اور بکثرت مسلم ہندوستانی ناموں کا استعمال کیا جا رہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ فارسی اور ترکی ادب، جرمن ادباء کے لیے دلبستگی، تحیر اور سریت کے آثار لیے ہوئے تھا۔ وہ حافظ اور مولانا رومؒ کے دلدادہ تھے اور خود شمل کے ہاں ان جملہ مشرقی اور اسلامی ادب سے وابستگی کے ایک سے زائد اسباب تھے۔ قریباً سات برس کی عمر (موسمِ سرما۔۱۹۲۹ء) میں شمل کی نظر سے ایک مختصر تحریر 'الناس نیام فاذاماتوا انتبھوا' گزرتی ہے جس سے وہ تمام عمر متاثر رہیں یہاں تک کہ بعد از مرگ یہی تحریر ان کی قبر کے تعویز پر کندہ ہوئی۔ شمل کو بہت بعد میں معلوم ہوا کہ جس مختصر عبارت سے وہ محظوظ ہوئیں وہ مسلمانوں کے پیغمبر نبی اکرم ﷺ کی حدیثِ مبارکہ ہے۔ یہ وہ بنیادی محرکات تھے جو انھیں اسلام اور داعیٔ اسلام کے نزدیک لانے اور ایک متوازن نقطۂ نظر قائم کرنے میں معاون ہوئے۔ شمل تمام عمر نبی محترمؐ کی مداح رہیں اور اِنؐ سے محبت وعقیدت کا تعلق قائم کیے رکھا۔ پندرہ برس (اکتوبر ۱۹۳۷ء) میں عربی زبان سیکھنے کا بیڑا اٹھایا۔ غرض یہ وہ مجموعی تہذیبی و ثقافتی فضا تھی جس نے شمل کے میلانات کو ایک ڈھب پر آگے بڑھایا اور بیسویں صدی کی ایک انتہائی اہم اور ممتاز ترین مستشرقہ کی حیثیت سے اقوامِ عالم میں متعارف کرایا۔ اس ضمن میں شمل کے سربر آوردہ اساتذہ کرام کے کردار کو جس قدر سراہا جائے وہ کم ہے۔ شمل ان کا ذکر کرتے ہوئے ہمیشہ اک گونہ طمانیت اور تفخر محسوس کرتی تھیں۔ یہ وہ اساتذہ تھے جنھوں نے شمل کے ہاں وسیع المشربی اور بسیط فکری منظر نامہ کو مرتب و مجسم کیا اور شمل کی

توجہ تاریخ مذاہبِ عالم، مسلم الٰہیات، تصوف، تہذیب و ثقافت، مولانا رومؒ، منصور حلاجؒ اور سیرتِ رسول ﷺ کی جانب مبذول کرائی۔ شمل کی بعض کتب کو، اس طرح سے، اُن کے اساتذہ کی دین قرار دیا جا سکتا ہے کہ وہ موضوع خاص پر پہلے ہی سے بہت سا اہم اور مقتدر کام کر چکے تھے۔ اس ضمن میں ان کی معروف کتاب Deciphering the Signs of God–A Phenomenological Approach to Islam کو خاص طور سے دیکھا جا سکتا ہے جو اسلام کی تصریح، مظہراتی طور پر کرتی ہے۔ یہ کتاب شمل کی دیگر اہم کتب کی مانند، اُن کے دیے گئے لیکچرز کا حاصل ہے۔ شمل کا اس کتاب کی بابت یہ کہنا ہے کہ یہ ان کے استاد فیدغش ہائیلے (Friedrich Heiler) کے تجویز کردہ ضابطہ کے مطابق مرتب کی گئی:

"Nevertheless, I believe that the phenomenological approach is well suited to a better understanding of Islam, especially the Model which Friedrich Heiler developed in his comprehensive study Erscheinunfsformen und Wesen der Religion (Stuttgart 1961), on whose structure I have modelled this book."1

شمل نے اسلام کے جمالیاتی پہلو خواہ ان کا تعلق صوفیانہ رقص سے ہے یا خطاطی سے، غرض اسلامی ناموں سے سماع اور دنیا بھر میں ہونے والی شاعری کے اعلیٰ نمونوں کا دلپذیر اور خوش کن چناؤ کیا۔ انیسویں صدی میں مستشرقین کے ہاں مشاہدہ کی جانے والی مثبت تبدیلی شمل کے جملہ افکار پر گہرے اثرات مرتّب کرتی ہے۔ جرمن استشراق کا متوازن انداز نظر، اس ضمن میں، ایک بنیاد گذار کی سی حیثیت رکھتا ہے۔

شمل نے اپنے پیش روؤں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے کچھ اس والہانہ انداز سے اسلام کی تعبیر و تشریح کی کہ جرمن جریدہ 'فکر و فن' کے ایڈیٹر اسٹیفن وائیڈنر کو یہ کہنا پڑا:

"It was Annemarie Schimmel's great strength and at the same time her great weakness that she never regarded the Orient soberly, but always viewed it instead with loving infatuation, an infatuation based on an idealized rather than a real Orient."2

اردو زبان و ادب سے جڑے شمل کے تفحصات ہمارے اس باب کا حاصل ہیں۔ ہم غیر ضروری طور پر الٰہیات ، تہذیب و ثقافت، تاریخ اور فنونِ لطیفہ ایسے موضوعات سے تعارض نہ کریں گے کہ یہ جملہ فکری جہات اب جدا مکتب کی حیثیت سے مشخص ہیں، ایسے میں ان پر گفتگو خام اور ادھوری ہی رہے گی۔ چنانچہ صرف اردو سے متعلق ان کی جملہ کاوشوں کو پرکھنے کا جتن کیا گیا ہے تاکہ بہتر طور پر شمل کی علمی حیثیت کا تعین ہو پائے۔

حضرت خواجہ میر دردؒ اور حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی سیرت و افکار کی بابت ایک متوازن مطالعہ بعنوان PAIN AND GRACE–A STUDY OF TWO MYSTICAL WRITERS OF EIGHTEENTH–CENTURY MUSLIM INDIA جانچا جا سکتا ہے جو اٹھارویں صدی عیسوی کی دو اہم صوفی شخصیات کے پھیلے ہوئے متصوفانہ بیانیے کا احاطہ کرتا ہے۔ شمل نے اس کتاب میں حضرت خواجہ میر دردؒ کی حیات اور ان کے علمی و فکری عرفان کا ابلاغ، اہل مغرب کے لیے کمال مہارت سے کیا اور بجا طور پر ان کی شخصیت کو صاحبِ حال اور صاحبِ قال قرار دیا۔ کتاب کے متعدد حصے ان کے تفحصات کی لائقِ ذکر نظیریں لیے ہوئے ہیں؛ تاہم کتاب کا اسلوب بعض ناقدین کے ہاں ہدف تنقید بنا اور یہ بات سامنے آئی کہ اتنے اہم موضوع پر ان کا طرز تحریر کسی بھی طور پر مکتفی نہیں؛ علاوہ ازیں بعض اشعار کی تشریح اور مقامات کے بیان میں تسامحات واقع ہوئے ہیں جن پر سخت گرفت کرنے پر راقم متامل ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب اپنا بھرپور تہذیبی پس منظر پیش کرتے ہوئے اہل مغرب کو مذکورہ صوفی شخصیات سے متعارف کرانے میں کامیاب رہتی ہے۔ اور خاص طور سے میر دردؒ کے ضمن میں یہ ایک چنیدہ کاوش کہی جا سکتی ہے کہ ان کی بابت مغرب میں بہت کم لکھا گیا ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں، جو شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ سے متعلق ہے، سوانحی مواد کی کمی بری طرح کھٹکتی ہے۔ قاری ان کے افکار و نظریات سے تو کسی حد تک شناسا ہو پاتا ہے لیکن ان کی زندگی کے جملہ معاملات اور واقعات سے بڑی حد تک نابلد رہتا ہے۔ سندھ دھرتی سے شمل کی انسیت سب پر اظہر من الشمس ہے اور یہ ان کی والہانہ عقیدت کا ایک ادنیٰ ثبوت ہے کہ وہ ٹھٹھہ کے ماکلی قبرستان میں دفن ہونا چاہتی تھیں تاہم والدہ کے انتقال کے بعد ان کی رائے تبدیل ہوئی اور وہ اپنی والدہ کے پہلو میں جرمنی کے شہر بون (BONN) میں پیوندِ خاک ہوئیں۔

اسداللہ خاں غالبؔ کے بارے میں ان کی کتاب A Dance of Sparks- Imagery of Fire in Ghalib's poetry اپنے موضوع اور مواد ہر دو اعتبار سے شمل کی اہم کاوش قرار دی جاسکتی ہے۔اس میں جہاں غالبؔ کی حیات اوران کے شعری خیالات پیش ہوئے وہیں خاص طور سے ان کی فارسی شاعری مبحث کا حصہ بنتی ہے اور گرانقدر معلومات کی دستیابی ،پڑھنے والے کو متاثر کرتی ہے۔اس کتاب میں من جملہ تہذیبی و ثقافتی عناصر نمایاں کرنے کی شعوری جستجو،مشاہدہ کی جا سکتی ہے جس میں رقص جو کتاب کا ایک طرح سے بنیادی موضوع بھی ہے، کی بابت شمل کا تبحر،زیرکی اور عُمق، مطالعہ کا سزاوار ہے۔ شمل نے مختلف ثقافتوں میں موجود رقص کی اہمیت اور تعبیریت کو احسن انداز پر نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے اور یوں رقص محض حرکات و سکنات کا ایک تفاعل ہی نہیں رہتا بلکہ عشق و سرمستی اور وارفتگی کا ایک استعارہ بن جاتا ہے۔

شمل نے غالبؔ کے متعدد فارسی و اردو اشعار کو پیش کرتے ہوئے ان کے ترجمہ وتشریح میں فنی نزاکتوں کا اظہار کیا۔غالب کی شاعری میں موجود تمثالِ آتش کو جامع اور بھرپور تسلسل سے پیش کرتے ہوئے بہت سی قابلِ قدر نظیریں پیش کیں اوریہاں بھی اپنی پسندیدہ شخصیت منصور حلاجؒ اور غالبؔ کی بابت اہم پس مناظر پیش کیے:

"Since Ghalib stands in a line with Bedil, Nasir Ali, and the Delhi tradition of poetry and, to a certain extent, mysticism, it is small wonder that he has taken up the Hallajian imagery to apply it in a most ingenious way. The idea that the lover must delight in his afflictions constitutes one of his main topics. By means of an expression employed frequently by the folk poets, he speaks of the 'goblet of Mansur'-a word which reminds the reader of 'intoxication' by the wine of love, and he knows that to speak the truth-or to utter the word haqq, 'Divine Truth'-will indispensably lead man to the gallows, for The end of those who see One is the gallows."3

اشعار کے تراجم میں شمل سے بعض مقامات پر تسامحات ہوئے۔ ان کی بابت ڈاکٹر تحسین فراقی اپنے ایک اہم مضمون بعنوان "این میری شمل بحیثیت غالبؔ شناس ---چند معروضات" (مباحث-لاہور) میں بصراحت گفتگو کر چکے ہیں۔ موضوعِ بحث کتاب اپنے بعض علمی اور فکری نِکات کے سبب تفہیم غالبؔ کے تسلسل میں ایک قابلِ

قدر کاوش ہے؛ اور جس مقصد کے لیے ان کا انتخاب ہاورڈ یونیورسٹی میں ہوا، یہ اس کا ایک خوبصورت جوابی تاثر ہے۔

شمل کی شناخت کا ایک اہم حوالہ فکر اقبال کی تفہیم ہے۔ شمل نے متعدد زاویہ ہائے نظر سے دانش اقبال کو جانچا اور ان کے درست مقام و مرتبہ کا تعین کیا۔ مشرق کے وہ صوفی شعرا جن کے شعری سرمائے سے شمل مسلسل مستفید ہوتی رہیں ان میں فریدالدین عطارؒ، سنائیؒ، جامیؒ، رومیؒ، ناصر خسرو اور خواجہ میر دردؒ ایسی شخصیات شامل ہیں؛ تاہم وہ قد آور شخصیت جو مولانا رومؒ کے بعد شمل کو انتہائی متاثر کرتی ہے وہ اقبال کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ اقبال نے اپنے عہد کی اہم نابغۂ روزگار شخصیات سے علمی مکالمہ کیا اور یہ شے شمل کو اقبال کے نزدیک لے آئی۔ سنائی، مولانارومؒ، حلاجؒ اور گوئٹے وہ اہم ہستیاں ہیں جن کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے شمل اقبال کو جالیتی ہیں اور ان میں بھی اگر تخصیص کی جائے تو رومیؒ اور گوئٹے کے بعد اقبال ہی ہدف نگاہ بنتے ہیں۔ مولانا رومؒ کی تعلیمات سے شمل کا استنباط تمام عمر کو محیط رہا۔ ان کے وسیلہ سے شمل، عشق کی آفاقیت اور کائنات کی سریّت پر متفکر رہیں۔ اسلام کا جمالیاتی مطالعہ اسی کونیاتی ہستی کے مرہو ن منت رہا۔ مولانا رومؒ، عشق کی وارفتہ کیفیات کے اظہار میں، عطارؒ کے برعکس نسوانی پیرائے برتتے ہیں یعنی ان کا محبوب مثل یوسفؑ ہے اور وہ زلیخا کے روپ میں ان کو شدت سے پانے کی کاہش میں ہیں۔ تڑپ کا یہی بڑا رنگ اقبال کے تصور عشق میں سرایت کر جاتا ہے اور عشق فکرِ اقبال کا اہم ستون بن کر ان کی مسقّف شعری کائنات کو سہارتا ہے۔ درحقیقت اقبال، شمل کے نزدیک، مولانا کے افکار کی ایک طرح سے توسیع ہیں اور صرف عشق ہی استنباط کا واحد حوالہ نہیں بلکہ خودی اور تصور شاہین کی تخریج بھی مولانا کے افکار سے ہوئی۔

جاوید نامہ میں مولانا، اقبال کا تعارف' زندہ رود' کے طور پر کراتے ہیں۔ گوئٹے نے یہ ترکیب اپنی ایک نظم جو ۷۳ ۔ ۱۷۷۲ میں لکھی، نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے استعمال کی ہے۔[۴]

شمل کی کتاب Gabriel's Wing: A Study into the religious Ideas of Sir Muhammad Iqbal مسلم عقائد کو سمجھنے کی ایک اہم کاوش ہے۔ اس کے جملہ موضوعات ،ایقان و یقین کی سطح پر ،فکر اقبال کو نمایاں کرتے ہیں، اور یہ واضح ہے کہ شمل کا مطمح نظر اقبال کے افکار کی توضیح سے زیادہ مسلم عقائد کی تعبیر وتشریح ہے۔ فکر اقبال کو تمام جہات سے مرتب کرنا اگر ان کا مقصود ہوتا تو مذکورہ کتاب کی ابواب بندی

قدرے مختلف ہوتی۔ یہ ایک پیچیدہ اور منفرد تجربہ تھا اور اگر شمل کا مطالعہ محدود ہوتا تو وہ اِس میں بُری طرح ناکام ہو جاتیں۔ان کا وسیع الٰہیاتی مطالعہ اور متصوفانہ مباحث سے قابلِ قدر شناسائی اور مسلم تاریخ ، تہذیب وتمدّن سے بصیرت افروز آگاہی انھیں اس تجربے کی ناکامی سے مامون رکھتی ہے۔اقبال کے تصورات سے متعلق قریباًتمام مباحث،بین السطور، مندرج ہیں اور ان کا تعبیر ی و توضیحی انسکاب بڑی حد تک مکتفی ہے۔اقبال کا تصو ر عشق، تصور زمان و مکاں، خودی، ملت اسلامیہ کی شعوری و سیاسی بیداری ان تمام امور کو شمل نے گفتگو کا حصہ بنایا اور ان کا موازنہ مغربی فلاسفہ، دانشوران اور ممتاز شعراء سے کیا۔ یہ شمل ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ جب اقبال اپنے خطبات پیش کررہے تھےتو سویڈن کے لتھورین بشپ تورآندرے بعینہ اُن خیالات کا اظہار کر رہے تھے جو اقبال کے ہاں تواتر سے موجود رہے۔شمل،تور آندرے کی سیرت پر موجود ایک اہم کتاب Mohammed-The Man and His Faithکی شدت سے معترف ہیں۔ فکر اقبال کے تعین میں شمل، ارسطو، افلاطون، سنائیؒ مولانارومؒ، منصور حلاجؒ ، ملاباقر، لوئی میسی یوں، نطشے، مارٹن بیو، ہنری برگسان، ہیگل، کانٹ، کارل مارکس اور ردولف پان وٹزایسی شخصیات پر گفتگو کرتی ہیں اور اس مذکورہ کتاب کا قابل قدر حصہ ،انھی شخصیات کے افکار کا اقبال سے موازنہ ہے۔ان لائقِ ذکر ہستیوں پر مبحث پیش کرنا آسان نہ تھا۔شمل نے یہ بیڑہ اٹھا کر اپنے عمیق و بسیط مطالعے کا ثبوت فراہم کیاجو قابل ستایش ہے۔غرض یہ علمی وتحقیقی جستجو شمل کو دیگر محققینِ اقبال سے ممیز کرتی ہے اور انھیں عارفینِ اقبال میں ایک بلند مقام عطا کرتی ہے۔

اقبال کے ضمن میں بعض مقامات اور نکات کی بابت شمل کو غیر ضروری طور پر ہد ف تنقید بنایا گیا۔ تسامحات ڈھونڈ ڈھونڈ کر پیش کیے گئےاور ان کا علمی مقام گھٹانے کی مبتذل کوشش ایک سے زائد بار کی گئی۔اس نوع کا ایک جتن موضوع بحث کتاب پر سید عبدالواحد کی جانب سے کیا گیا۔ انھوں نے اپنے مقالہ "بالِ جبرئیل از اپنے میری شمل"میں جس انداز پر شمل کی بھد اڑائی، اس سے صاف ظاہرہے کہ وہ منصب نقدسے منحرف ہوئے ہیں۔اپنے مقالہ میں جناب عبدالواحد کے جملہ مطالبات کسی بھی طور مناسب معلوم نہیں ہوتے:

"اقبال نے مرنے سے عین قبل اپنے بھائی سے کہا تھا: میں مسلمان ہوں اس لیے موت سے کیا ڈروں گا۔ ڈاکٹر شیمل کو چاہیے تھا کہ وہ ان الفاظ سے ہی اپنے موضوع کی ابتدا کرتیں اور بتاتیں کہ اقبال نے اسلا م کی روح کو کس طرح سمجھا تھا۔"۵

ڈچ مستشرق جین گونڈا کا مرتّب کردہ سلسلہ (A HISTORY OF INDIAN LITERATURE) کی جلد ہشتم کا حصہ سوم بعنوان CLASSICAL URDU LITERATURE FROM THE BEGINNING TO IQBAL شمل کا مرتب کردہ ہے۔ یہ کتابی صورت میں تاریخ ادبِ اردو کا اہم تنقیدی و تحقیقی مطالعہ ہے اور دکنیات اس کا وہ تخصیصی جز ہے جس پر مصنفہ کی دقت نظری قاری کو متاثر کرتی ہے۔ اردو زبان کے آغاز و آثار کی بابت اہم تحقیقی مباحث مختلف کتب میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ تاہم جو شے اس کتاب کو ممیز کرتی ہے وہ اس کے مصادر و منابع ہیں جو متعدد مستشرقین کے تفحصات کا حاصل ہیں۔ غرض شمل کی یہ تحقیقی کاوش کئی زاویوں سے منفرد معلومات کا احاطہ کرتی ہے اور اس سے جہاں ان کی علمی احتیاط کا احساس ہوتا ہے وہیں ان کی ادب فہمی، فکر و نظر کے مختلف در وا کرتی ہے۔ فارسی، عربی، سندھی، پشتو، انگریزی اور جرمن ادب کے علاوہ وہ اردو ادب پر بھی لائق رشک دستگاہ رکھتی تھیں۔ کلاسیکی اردو ادب کو جس بہتر انداز پر انھوں نے سمجھا اور غزل، نظم اور مرثیہ کو عہد بہ عہد جملہ تنوعات کے مع جس مہارت سے پیش کیا، اس پر بجا، داد کی مستحق ہیں۔ شمل کا اردو ادب کی بابت اعتماد سے گفتگو کرنے کا ایک بڑا سبب وہ مشرق شناسی اورادب فہمی تھی جو گارساں دی تاسی، ارنسٹ ٹرم اور بیلی ایسی شخصیات سے جڑ پکڑ کر چھتنار درخت کی صورت متاخرین کو سایہ فراہم کرتی رہی۔ شمل بھی ان شخصیات سے براہِ راست یا بالواسطہ مستفید و مستنیر ہوئیں۔ امانت لکھنوی کی اندر سبھا انیسویں صدی کے قریباًوسط میں بہ زبان جرمن منقلب ہوئی اور یوں اردو کا تعارف جرمن استشراق میں مسلسل فروغ پاتا رہا۔

جین گونڈا کے نزدیک شمل کا یہ تحقیقی کام طبع زاد نہیں یعنی وہ اس بسیط تحقیقی کدّ و کاوش کی مصنفہ نہیں بلکہ ایک طرح سے مرتّبہ ومؤلفہ ہیں۔ تاہم جین گونڈا ،ان مصنفین و مؤلفین کی بابت خاموش ہیں جنھوں نے دقّتِ نظری سے تاریخ ادب پر اپنی کارگزاری پیش کی اور نہ ہی کوئی ایسی جستجو شمل کی جانب سے مشاہدہ میں آئی۔ موضوع بحث کتاب، اب شمل کی جانب سے ایک حقیقی وجود رکھتی ہے، اس لیے اس

میں موجود مواد بھی شمل کا تسوید کردہ تسلیم ہوگا۔ اس کے اچھے برے ہونے کے جملہ اثرات شمل کی ادبی شناخت یا پہچان پر براہ راست اور برابر پڑتے رہیں گے۔
شمل نے کلاسیکی متون کو کھنگالتے ہوئے اہم شعرا کے شعری تراجم پیش کیے اور بیشتر مواقعوں پر موزوں نظائر مندرج کرنے میں کامیاب رہیں۔ شعرا کا تقابل اور تہذیبی و سیاسی پس منا ظر، احسن انداز پر دکھائے گئے ۔ اہم نکات کی بابت اسانید کا لائق ذکر استنباط قاری کو متاثر کرتا ہے اور یہ پیش پا آئندہ محققین کو بہتر زاویۂ نظر فراہم کرتا ہے۔ایک علمی اور تحقیقی کام کے لیے اسناد کو کس طرح سے پیش کرنا چاہیے، اس اعتبار سے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اشعار کے تراجم میں موجود تسامحات اور بعض اہم شخصیات کی بابت تشنہ گفتگو اردو ادب کے قاری کو کھٹکتی ہے اور اس پر اگر کچھ بہتر کام کیا جاتا تو یقیناً مزید سراہا جاتا۔ میرامن اور منشی پریم چند کے بارے میں جو گفتگو کتاب میں موجود ہے وہ انتہائی مختصر اور نامساعد معلوم ہوتی ہے یعنی ان کے جملہ کمالات و محاسن نمایاں نہیں ہوتے اور یہ لگتا ہے کہ فاضل مصنفہ ان اہم شخصیات کی کارگزاریوں سے نابلد تھیں ،اور اس کا بڑا سبب ان کا مختلف النوع موضوعات سے متعارض ہونا ہے جو ان کے ہاں علمی و تحقیقی نقص پیدا کرتا ہے اور ہمیں ان کے ہاں بعض مقامات پر غلط تاریخی نکات مندرج نظر آتے ہیں۔ درحقیقت شمل کے بسیط موضوعات ان کے علمی و تحقیقی معیارات کی کہیں کہیں نفی بھی کرتے ہیں کہ ایک فرد کے لیے بہ یک وقت الٰہیات، تصوف، تاریخ و تمدن،ادب اور فنون لطیفہ پر سیر حاصل گفتگو کرنا سہل نہیں۔ شمل چاہتی تھیں کہ اہل مغرب، مشرق کے جمالیاتی اور متصوفانہ اطوار سے مستفید ہو۔ جس شے کی کمی اسے اپنے معاشرہ میں محسوس ہوئی اسے مشرق جا ڈھونڈا اور پھر اسی کے تعارف اور شناخت میں عمرِ عزیز صرف ہوئی۔ شمل نے ہمیشہ چاہا کہ مشرق اور بالخصوص مسلم تہذیب و ثقافت کا ایک ایسا بھرپور منظر نامہ سامنے لایا جائے جو اہل مغرب کو نہ صرف پسند آئے بلکہ اس کی تائید میں مغرب آگے بڑھ کر محظوظ بھی ہو۔ الغرض وہ اسلام اور داعی اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اک گونہ انسیت اور تعلق خاص رکھتی تھیں اور باوجود اس کے کہ انھیں اپنا مادری عقیدہ عزیز تھا، وہ اسلام کی بابت اپنی محبت کا اظہار تسلسل سے کرتی رہیں۔ شمل کی جملہ تحقیقی کاوشیں مشرق کو مغرب سے جوڑنے کے لیے تھیں۔ یہ کام رکا نہیں تاہم جس علمی قد و قامت سے شمل نے اسے بڑھایا وہ اب کم دیکھنے میں آرہا ہے۔ ان کی یہ شدید خواہش تھی کہ

مشرق اور بالخصوص اسلام کی بابت، اہل مغرب کے اندازِ نظر میں توازن پیدا ہو۔ صدیوں کو محیط بغض وعناد اور مخاصمت میں کمی واقع ہو۔ اسلام کا جمالیاتی پہلو______ متصوفانہ شاعری اور فنون لطیفہ کے وسیلہ سے نمایاں ہو اور اس عملی کوشش میں وہ بڑی حد تک کامیاب نظر آتی ہیں۔ مشرق اور مغرب کے درمیاں یہ علمی ربط شمل نے ان تھک محنت سے پیدا کیا، اس پر وہ ستائش کی اہل ہیں۔

تمت بالخیر

بابِ پنجم:

1: Schimmel, Annemarie. Deciphering the Signs of God: A Phenomenological Approach to Islam. Lahore, Pakistan: Sang-E-Meel Publications, 2006. Print.vii

2: Weidner, Stefan. "ON THE THRESHOLD OF A NEW EPOCH" Art and Thought- Fikrun wa Fann. 42st (3rd) year 79.4(June 2004 – November 2004) P.63

3: **Schimmel, Annemarie. Pain and Grace**- A STUDY OF TWO MYSTICAL WRITERS OF EIGHTEENTH-CENTURY MUSLIM INDIA. Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2003.P.104

4: www.dawn.com/news/1375639

۵:یوسف بخاری، سیّد۔ مترجم۔ بالِ جبرئیل از اپنے میری شیمل۔ عبدالواحد، سید (تبصرہ نگار)۔ اقبال ریویو، شمارہ ۲، جلد ۱۲، جولائی ۱۹۷۱ء ص ۸۹

کتابیات

اردو کتب:

1. خلیل الرّحمٰن داؤدی (مرتب)۔ یادگارِ غالبؔ۔ الطاف حسین حالیؔ، خواجہ، شمس العلما۔ لاہور: مجلسِ ترقیٔ ادب، اگست ۲۰۱۲ء
2. افضال حسین، قاضی (مترجم)۔ رقصِ شرر، کلامِ غالبؔ میں رقص اور شرر کے پیکر۔ انّ میری شمل، پروفیسر۔ دہلی: غالبؔ آکیڈمی، ۲۰۰۱ء
3. اقبال۔ کلیاتِ اقبال، اردو۔ لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، س۔ن
4. اقبالؔ۔ کلیاتِ اقبال (اردو)۔ اسلام آباد: الحمراء پبلشنگ، جولائی ۲۰۰۴ء
5. اقبال۔ کلیاتِ اقبال، فارسی۔ لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، س۔ن
6. احمد جاوید (تسہیل و فرہنگ)۔ پیامِ مشرق (علامہ محمد اقبال)۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۲ء
7. اختر الواسع اور فرحت اللہ خان (مرتبین) دانائے راز، این میری شمل۔ نیو دہلی: مکتبۂ جامعہ نئی دہلی لمیٹڈ، ۲۰۰۳ء
8. اقبالؒ۔ کلیاتِ اقبال۔ لاہور: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، ۲۰۰۸ء
9. امتیاز علی خاں عرشی۔ دیوانِ غالبؔ۔ لاہور: مجلسِ ترقیٔ ادب، ۱۹۹۲
10. امیر خان نیازی، سیّد۔ مترجم۔ عین الفقر۔ حضرت سلطان باہو۔ لاہور: العارفین پبلیکیشنز، ۲۰۱۴ء
11. این میری شمل، پروفیسر، ڈاکٹر۔ شہپرِ جبریل۔ علامہ اقبالؒ کے دینی افکار۔ (مترجم) محمد ریاض، ڈاکٹر۔ لاہور: گلوب پبلشرز، ۱۹۸۵ء
12. تبسم کاشمیری، ڈاکٹر۔ اردو ادب کی تاریخ، ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء

13. تبسم کاشمیری، ڈاکٹر۔ اردو ادب کی تاریخ۔ ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء

14. جاوید اقبال۔ زندہ رود، حیاتِ اقبال۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۰ء

15. حمید یزدانی، خواجہ، ڈاکٹر۔ شرحِ جاوید نامہ۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء

16. خلیل الرحمٰن داؤدی۔ دیوانِ درد از خواجہ میر درد دہلوی۔ لاہور: مجلسِ ترقیٔ ادب، ۲۰۱۰

17. رام بابو سکسینہ۔ تاریخِ ادبِ اردو۔ کراچی: غضنفر اکیڈمی پاکستان، ۲۰۰۱ء

18. رضیہ نور محمد، ڈاکٹر۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ۔ لاہور: مکتبۂ خیابانِ ادب، ۱۹۸۵ء

19. رفیع الدین ہاشمی، محمد سہیل عمر اور وحید عشرت (مرتبین)۔ اقبالیات کے سو سال، علامہ اقبال کے فکر و فن پر منتخب مقالات (۱۹۰۱ء۔ ۲۰۰۰ء)۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، طبعِ سوم، ۲۰۱۲ء

20. عبادت بریلوی، ڈاکٹر (مرتّب)۔ نالۂ درد۔ میر درد، خواجہ (مؤلف)۔ لاہور: اِدارہ ادب و تنقید، ۱۹۸۰ء

21. عبد القادر جیلانی، ڈاکٹر۔ اسلام، پیغمبرِ اسلامؐ اور مستشرقینِ مغرب کا اندازِ فکر۔ لاہور: کتاب سرائے، ۲۰۱۰ء

22. قرۃ العین حیدر۔ آخرِ شب کے ہمسفر۔ لاہور: چودھری اکیڈمی، س۔ن،

23. محمد بن عیسیٰؒ ابو عیسیٰؒ۔ جامع ترمذی، جلد دوم۔ لاہور: اسلامی اکادمی، س۔ن۔

24. محمد ثناء اللہ ندوی، ڈاکٹر (مترجم و ملخص)۔ علومِ اسلامیہ اور مستشرقین۔ لاہور: نشریات، ۲۰۰۹ء

25. محمد حسن جعفری، مولانا۔ مترجم۔ مکتبِ امامت و خلافت (جلد اوّل) مرتضیٰ العسکری، سیّد، آیت اللہ۔ لاہور: ادارہ منہاج الصالحین، ۲۰۰۷ء

26. محمد حسین آزاد۔ آبِ حیات۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء

27. محمد شفیع، مفتی۔ معارف القرآن (جلد اوّل)۔ کراچی: مکتبۂ معارف القرآن، ۲۰۱۳ء

28. محمد کرم شاہ، الازہری، پیر۔ ضیاءُ النبی ﷺ (جلد ششم)۔ لاہور: ضیاءُ القرآن پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء

29. محمد مہدی، فاسی، امام، علامہ۔ مطالع المسرات شرح دلائل الخیرات۔ لاہور: نوریہ رضویہ پبلی کیشنز، جون ۲۰۰۰ء طبعِ اول

30. ناصر عباس نیر۔ مابعدِ نو آبادیات، اردو کے تناظر میں۔ کراچی: اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۳ء

31. نسیم احمد، ڈاکٹر۔ دیوانِ دردؔ۔ دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۲۰۰۳ء

اردو جرائد و رسائل

1. این میری شمل، ڈاکٹر۔ "منصور حلّاج۔ اقبالؔ کی نظر میں "ماہِ نو (اقبالؔ نمبر)، ستمبر ۱۹۷۷ء

2. تحسین فراقی، ڈاکٹر۔ "این میری شمل بحثیت غالبؔ شناس۔۔۔ چند معروضات "مباحث۔ لاہور: جلد ۱، شمارہ ۱، جنوری تا جون ۲۰۱۲ء

3. طیبہ تحسین (مبصر)۔ دریائے رائن تا دریائے مہران۔ محمد اکرام چغتائی (مرتّب)۔ مخزن ۲۶۔ لاہور: جلد ۱۳، شمارہ ۲، ۲۰۱۳ء

4. یوسف بخاری، سیّد۔ مترجم۔ بالِ جبرئیل از اینے میری شیمل۔ عبد الواحد، سید (تبصرہ نگار)۔ اقبالؔ ریویو، شمارہ ۲، جلد ۱۲، جولائی ۱۹۷۱ء

لغات اور دائرۃ المعارف (کتابی و ڈیجیٹل)

1. اردو انگریزی لغت۔-http://www.urduenglishdictionary.org/English-To-Urdu
2. اردو انگلش ڈکشنری۔-http://www.urduenglishdictionary.org/English-To-Urdu
3. اردو آئی این سی۔http://www.urduinc.com/english-dictionary/
4. اردو سے انگریزی۔https://ur.oxforddictionaries.com
5. اردو لغت۔http://urdulughat.info/
6. آزاد دائرۃ المعارف ویکیپیڈیا۔https://ur.wikipedia.org/wiki/
7. راجیسور راؤ اصغر، راجہ۔ ہندی اردو لغت۔ کراچی: انجمنِ ترقیٔ اردو پاکستان، ۱۹۹۷ء
8. علی رضا نقوی، سید، ڈاکٹر۔ فرھنگِ جامع، فارسی بہ انگلیسی واردو۔ اسلام آباد: مرکزِ تحقیقاتِ ایران و پاکستان، اشاعتِ سوم ۲۰۱۱ء
9. المعانی (عربی سے انگریزی)۔https://www.almaany.com/en/dict/ar-en
10. وارث سرہندی۔ علمی اردو لغت (جامع)۔ لاہور: علمی کتب خانہ، ۲۰۰۳ء

اردو و فارسی کی اہم ویب سائٹس اور کتب خانے

1. اردو محفل۔https://www.urduweb.org/mehfil/threads/
2. ریختہ کتابیں۔https://rekhta.org/ebooks
3. علامہ اقبال سائبر لائبریری۔http://www.iqbalcyberlibrary.net

4. گنجور۔https://ganjoor.net

English books

1. Adil Ozdemir, Kenneth Frank, Annemarie Schimmel(foreword), Adil Ozdemir. Visible Islam In Modern Turkey. London: Palgrave, 2000.
2. A.L.Dallapiccola and Zingle-Ave Lallemant. Eds. Islam and Indian Religions. Stuttgart, 1993.
3. Ali S. Asani and Annemarie Schimmel. Celebrating Muhammad: Images of the Prophet in Popular Muslim Poetry. South Carolina: University of South Carolina, 1995.
4. Arberry, Arthur John. Classical Persian Literature. London: George Allen & Unwin, 1958.
5. _________________.Fifty Poems of Hafiz. Cambridge: Cambridge University Press, 1947.2d ed., 1953.
6. _______________.Sufism. London: Allen & Unwin, 1950.
7. Arnold, Sir Thomas. Painting in Islam. New York, 1965.
8. Attar, Fariduddin. The Ilahinama, "Book of God" Trans. John A. Boyle. Manchester: Manchester University Press, 1976.
9. ______________.[Mantiq ut- tayr.] The Conference of the Birds: Philosophical Religious Poem in Prose. French translation of Garcin de Tassy by C.S.Nott. Reprinted. London, 1978.
10. Bailey, T.G. A Short History of Urdu Literature. Calcutta, 1932.

11. Browne, Edward Granville. A literary History of Persia. 4 vols. Cambridge: Cambridge University Press, 1957.
12. Carl W. Ernst and Annemarie Schimmel (foreword). Eternal Garden: Mysticism, History, and Politics at a South Asian Sufi Centre. Albany: State University of New York Press, 1992.
13. Chelkowski, Peter J. The Scholar and the Saint: Biruni/Rumi. New York: New York University Press, 1975.
14. Chittick, William C. The Sufi Path of Knowledge. Albany: Sunny Press, 1989.
15. _______________.The Sufi Path of Love. Albany: Sunny Press, 1985.
16. Conermann, Stephan. History and Society During the Mamluk Period (1250-1517). Göttingen: V & R unipress, 2014. Print
17. Corbin, Henry. Creative Imagination in the Sufism of Ibn Arabi. Translated by Ralph Manheim. Princeton: Princeton University Press, 1969.
18. Edward W.Said . Orientalism. New York: Random House, Inc., 1994.
19. Elwell-Sutton, L.P. The Persian Meters. Cambridge: Cambridge University Press, 1976.
20. Firdausi. [Shahnama.] The Epic of the Kings. Translated by Reuben Levy. Chicago: University of Chicago Press, 1967.
21. Freedman, Estelle. The History of Feminism and the future of women. New York: Ballantine Books, 2002.
22. Frithjof Schuon. Annemarie Schimmel(foreword by). Understanding Islam: A New Translation with Selected Letters. Bloomington: World Wisdom, Inc., 1998.

23. ____. World Wheel: Volumes I-III. Bloomington: World Wisdom, Inc. 2006.

24. ____. Songs without Names Vol. VII-XII. Bloomington: World Wisdom, Inc. 2006.

25. Giese, Alma, and Annemarie Schimmel. Gott Ist Schön Und Er Liebt Die Schönheit: Festschrift Für Annemarie Schimmel Zum 7. April 1992, Dargebracht Von Schülern, Freunden Und Kollegen = God Is Beautiful and He Loves Beauty. Bern [etc.: Lang, 1994. Print.

26. Glunz, Michael, and J. Christoph . , eds. Intoxication, Earthly and Heavenly Seven Studies on the Poet Hafiz of Shiraz. Bern: Peter Lang, 1991.

27. Graham, William A. Divine Word and Prophetic Word in Early Islam. The Hague: Mouton, 1977.

28. John Renard, Annemarie Schimmel (Foreword by). All the Kings Falcons: Rumi on Prophets and Revelation. Albany, State University of New York Press, 1994.

29. Kutub Kasam. Ed. The Shimmering Light. Trans. Faqir Muhammad Hamazai. London: Tauris, 1996.

30. Lorraine Chittock. Cats of Cairo: Egypt's Enduring Legacy. New York: Abbeville Press, 2001.

31. M. Ikram Chugtai. Ed. Iqbal and Goethe. Lahore: Iqbal Academy Pakistan, 2000.

32. M. R. Bawa Muhaiyaddeen, Annemarie Schimmel (Foreword by), Coleman Barks(Introduction). Islam & World Peace: Explanations of a Sufi. Philadelphia: The Fellowship Press, Rev.ed.,2004.

33. Ramkrishna Lajwanti. Punjabi Sufi Poets. London and Calcutta: Oxford University Press, 1938. Reprinted Delhi, 1975.

34. Ruckert, Friedrich. Discourses of Rumi. Selected and translated by Arthur J. Arberry. London: John Murray, 1961.

35. Russell, Ralph. Ghalib: Life and Letters. Vol.1. London: George Allen and Unwin, 1969.

36. Russell, Ralph and Khurshidul Islam. Three Mughal Poets. Cambridge: Harvard University Press, 1967.

37. Rypka, Jan. History of Iranian Literature. Dordrecht: Reidel, 1968.

38. Sachiko Murata. Annemarie Schimmel. (foreword) Tao of Islam: A Sourcebook on Gender Relationships in Islamic Thought. New York: State University of New York Press, 1992.

39. Samina Quraeshi and Annemarie Schimmel. LEGENDS OF THE INDUS. Asia Inc., 2005.

40. Schimmel, Annemarie. " Abu Al Husayn Al Nuri: Qibla of the Lights" Classical Persian Sufism from its Origin to Rumi. Ed. L. Lewisohn. London: Khaniqahi Nimatullahi Publications, 1993.

41. _________________. And Muhammad Is His Messenger. Chapel Hill: University of North Carolina Press, 1985.

42. _________________. Anvari's Divan: A pocket book for Akbar : a Divan of Auhaduddin Anvari, copied for the Mughal emperor Jalaluddin Akbar (r. 1556-1605). Harvard: Metropolitan Museum of Art, 1983.

43. _________________. "The Art of Calligraphy" The Arts of Persia. Ed. R.W.Ferrier. New Haven: Yale University Press, 1989.

44. _________________. "Aspects of Mystical Thoughts in Islam." The Islamic Impact. Eds. Y.Y. Hadad, B. Hanies and E. Findly. Syracuse: Syracuse University Press, 1984.

45. _________________.As through a Veil: Mystical Poetry in Islam. New York: Columbia University Press, 1982.

46. _________________. A Two Coloured Brocade: The Imagery of Persian Poetry.

47. _________________.Calligraphy and Islamic Culture. New York: New York University Press, 1984. 2d ed.1989.

48. _____________.' The Celestial Garden in Islam.' In The Islamic Garden, edited by Richard Ettinghausen. Washington: Dumbarton Oaks, 1976.

49. _____________.' Classical Urdu Literature from the beginning to Iqbal. 'In History of Indian Literature, edited by J. Gonda. Wiesbaden: Harrassowitz, 1975.

50. _____________.A Dance of Sparks: Studies in the Ghalib s Imagery. New Delhi: Ghalib Academy, 1978.

51. _____________. A Dervish in the Guise of a Prince: Akbar's Khan-i Khanan ' Abdur Rahim as a Patron'." The Power of Art: Patronage in Indian Culture. Ed. Barbara Stoler Miller. New Delhi: Oxford University Press, 1992.

52. _____________. The Deciphering the Signs of God: A Phenomenological Approach to Islam. Albany: State University of New York Press, 1994.

53. _____________."The Emergence of the German Ghazal." In Studies in the Urdu Gazal and Prose Fiction, edited by Muhammad Umar Memoon. Madison: University of Wisconsin, South Asia Studies, 1979.

54. _____________ and Wheeler M. Thackston The Emperors' Album: Images of Mughal India. New York: Metropolitan Museum of Art, 1987.

55. _____________. The Empire of the Great Mughals: History, Art and Culture. London: Reakton Books LTD, 2004.

56. _____________. From Sana i Mawlana and Iqbal. Kabul: University of Kabul, 1979.

57. _____________.Gabriel's Wing: A Study into the Religious Ideas of Sir Muhammad Iqbal. Leiden: Brill, 1963. Reprinted, Lahore: Iqbal Academy, 1989.

58. _____________. "The Golden Chain of 'Sincere Muhammadans'. The Rose and the Rock. Mystical and Rational Elements in the Intellectual History of South Asian Islam. Ed. Bruce B. Lawrence. Duke University. 1979. 104-134.

59. ____________. "Hafiz and His Contemporaries." Cambridge History of Iran. Vol. The Timurid and Safavid Period. Eds. Peter Jackson and Lawrence Lockhart. Cambridge: Cambridge University Press, 1986.

60. ____________. Handbook of Oriental Studies. Section 2 South Asia, Religions, Islam in the Indian Subcontinent. Brill Academic Publishers, 1980.

61. ___________. History and Architecture. Lahore, the City Within. Ed. Samina Quraeshi. Singapore: Concept Media, 1988.

62. _____________.I Am Wind, You Are Fire: Rumi's Life and Work. Boston: Shambhala, 1992.

63. ____________."The Influence of Sufism on Indo-Muslim Poetry." In Anagogic Qualities of Literature, edited by J.P. Sterlka. Pennsylvania: The Pennsylvania State University Press, 1971.

64. ____________. "Indo- Muslim Spirituality and Literature." Islamic Spirituality: Manifestations. Ed. Syed Hussein Nasr. New York: Crossroads, 1991.

65. ____________. "Inner and Outer Space in Islam." Concepts of Space, Ancient and Modern. Ed. Kapila Vatsyayan. New Delhi: Indra Gandhi National Centre for the Arts, 1991.

66. ____________. "Iqbal and the Babi- Baha I Faith." Baha i Faith and Islam. Ed. Heshmat Moayyad. Ottawa: The Association for Baha i Studies, 1990.

67. ___________. " A life of learning" New York: American Council of Learned Societies, 1993 (ACLS Occasional Paper, 21),

68. ___________. Islam an Introduction. Albany: State University of New York Press, 1992.

69. ___________. Islam and the Wonders of Creation: The Animal Kingdom. London: Al-Furqan Islamic Heritage Foundation, 2003.

70. ________. Islam in India and Pakistan (Iconography of Religions Section 22, Islam). Brill Academic Pub, 1997

71. ________. Islam in the Indian Subcontinent. Leiden-Koln: Brill, 1980.

72. ________. " Islam in the Modern World." Religious Pluralism and World Community: Interfath and Intercultural Communication. Ed. Edward J. Jurji. Leiden: Brill, 1969.

73. ________. “Islam in Turkey.” Religions of the Middle East. (Vol 2) Ed. A.J.Arberry. Cambridge: Cambridge University Press, 1969.

74. ___________. A History of Indian literature, Islamic literatures of India. Germany: Otto Harrassowitz, Wiesbaden 1973.

75. ___________.Islamic Names. Edinburgh: Edinburgh University Press, 1989.

76. ___________. “Jesus and Marry as Poetical Images in Rumi's Verse.” Christian-Muslim Encounters. Eds. Yvonne Y. Haddad and Wadi Z. Haddad. Gainesville: Florida University Press, 1955.

77. ___________. “Khankhanan ʿ Abdur Rahim and Sufis.” Intellectual Studies on Islam. Ed. Michel M. Mazzaoul and Vera B. Dickson. Salt Lake City: University of Uttah Press, 1990.

78. ___________. “Literary Criticism in the field of Islamic Poetry.” The Personality of the Critic. Ed. Joseph P. Sterlka. University Park: Pennsylvania State University Press, 1973.

79. ___________. Look! This is Love! Translations from Rumi's Diwan. Boston: Shambhala, 1991.

80. ___________. Make A Shield From Wisdom: Selected Verses from Nasir-i Khusraw's Divan. I. B. Tauris, 2001.

81. __________. “Man and his Perfection in Islam.” The World Treasury of Modern Religious Thought. Ed. Jaroslav Pelikan. Boston: Little Brown and Co., 1990.

82. ___________.“The Marsiya in Sindi Poetry.” In Ta ʿziyeh: Ritual and Drama in Iran, edited by Peter J. Chelkowski. New York: New York University Press, 1979.

83. ____________. “Maulana Jalaluddin Rumi’s Story on Prayer (Mathnawi iii 189)” Yadname-ye Jan Rypka: A Collection of Articles on Persian and Tajik literature. Ed. Jiri Becka. Prague: Akademia, 1967.

84. ____________. “Mawlana Rumi: Yesterday, Today and Tomorrow.” Poetry and Mysticism in Islam: The Heritage of Rumi. Eds. Amin Banani, R. Hovannisian and G. Sabagh. Cambridge: Cambridge University Press, 1994.

85. ____________.Mirror of an Eastern Moon. London and The Hague: East-West Publications, 1978.

86. ___________. “The Muslim tradition.” The World’s religious traditions: Current Perspectives in Religious Studies. Ed. F.Whaling. Edinburgh: Clark, 1984.

87. ___________. “Mystic Impact of Hallaj” Iqbal: Poet Philosopher of Pakistan. Ed. Hafeez Malik. New York: Cambridge University press, 1971. 310-324.

88. __________. My Soul is a Woman. The Feminine in Islam. New York: The Continuum International Group Inc., 2004.

89. __________.The Mystery of Numbers. Oxford and New York: Oxford University Press, 1992.

90. __________.Mystical Dimensions of Islam. Chaper Hill: University of North Carolina Press, 1975. 6th rev. ed., 1989. Published in German as Mystische Dimensionen des Islam. Cologne: Diederichs, 1986.

91. __________.A Nineteenth- Century Anthology of Poetesses. “In Islamic Society and Culture: Essays in Honour of Professor Aziz Ahmad, edited by M. Israel and N.K.Wage. Delhi, n.d.[ca. 1980].

92. __________. Nightingales under the Snow: Poems. London: Khaniqahi Nimatullahi Publications, 1994.

93. __________. "A Nineteenth Century Anthology of Poetesses." Islamic Society and Culture: Essays in Honour of Professor Aziz Ahmad. Ed. M. Israel and N.K. Wage. Delhi: Manohar, 1983. 51-58.

94. _________." A Note on Poetical Imagery in the sabki-i hindi." In Hakeem Abdul Hameed Felicitation Volume, edited by Malik Ram. Delhi, 1981.

95. _________.Pain and Grace: A study of Two Mystical Writers of Eighteenth Century Muslim India. Leiden: Brill, 1976.

96. _________. Pearls from the Indus: Essays on Sindhi Culture. Hyderabad, Sindh: Sindhi Adabi Board, 1988.

97. __________. "Persian Poetry in the Indo-Pakistan Subcontinent." In Persian Literature, edited by Ehsan Yar Shater. Albany: SUNY Press, 1988.

98. __________. " Poetry and Caligraphy-Thoughts about Their Interrelation in Persian Culture." In the Highlights of Persian Art, edited by R. Ettinghausen and Ehsan Yar Shater. Buolder, Colo: Westview Press, 1979.

99. __________. The Poets Geography (Al-Furqan lectures series).London: Al-Furqan Islamic Heritage Foundation, 2000.

100. ________. "Regional Literature." The Sufic Tradition in Pakistan. Ed. Irfan Hussanin. London: Stacey International, 1997.

101. ________. "Religion." The Magnificent Mughals. Ed. Karachi: Oxford University Press, 2002.

102. ________. "The Ruby of the Heart: Some Reflections about a Mystical Symbol." Dr. Zakir Hussain Presentation Volume. Ed. Malik Ram. Delhi: 1968.

103. ________. Rumi: Makers of Islamic Civilization. I.B. Tauris, 2011.

104. __________. "Sacred Geography in Islam." Sacred Places and Profane Spaces: Essays in the Geographies of Judaism, Christianity and Islam. Eds. Jamie Scott and Paul Simpson-Housley. New York: Greenwood Press, 1991.

105. _________. "Secrecy in Sufism." Secrecy in Religion. Ed. K.W. Bolle. Leiden: Brill, 1987.

106. __________. The Secrets of Creative love: The work of Muhammad Iqbal. London: Al Furqan Islamic Heritage Foundation, 1998.

107. __________. " Shah Abdul Latif 's Sur Sarang." Sindh through the Centuries. Ed. Hamidah Khuro. Karachi: Oxford University Press, 1981. 104-107.

108. __________. "Shah Inayat of Jhok: A Sindhi Mystic of the Early 18th Century.." Liber Amicorum in Honour of C.J. Bleeker. Leiden, 1969.

109. __________."A Sincere Muhammadan's Way to Salvation." Memorial Volume S.F.G. Brandon, edited by Eric J. Sharpe and John R. Hinnels. Manchester, 1973.

110. __________." Sindhi Literature." In History of Indian Literature, edited by J. Gonda. Wiesbaden: Harrassowiz, 1974.

111. __________." A Spring Day in Konya." In The Scholar and the Saint: Biruni/ Rumi, edited by Peter J. Chelkowski. New York: New York University Press, 1975.

112. __________. "The Sufis and the Shahada." Islam Understanding Itself. Eds. Richard Hovannasian and Speros Vryonis, Jr. Malibu: Udena Publications, 1983.

113. __________. “Sufism and Spiritual life in Turkey.” Islamic Spirituality: Manifestation. Ed. Seyyed Hossein Nasr. New York: Crossroad, 1991.

114. __________. The Triumphal Sun: A Study of the Life and Works of Mowlana Jalaloddin Rumi. London and The Hague: East Publications, 1978. Persian translations, Shukuh-i-Shams. Tehran, 1988.

115. __________. “Turk and Hindu: A Poetical Image and Its Application to Historical Fact.” In Islam and Cultural Change in the Middle Ages(4th Live della Vida Conference), edited by Speros Vryonis. Wiesbaden: Harrassowitz, 1975.

116. __________. “The Veneration of the Prophet Muhammad, as Reflected in Sindhi Poetry.” The Saviour God, edited by Samuel G.F.Brandon, Manchester, 1963.

117. __________. “The Voice of Love: Mystical Poetry in Islam: Maulana Jalaluddin Rumi (1207-1273).” Mystics of the Book: Themes, Topics and Typologies. Ed. R.A.Herrera. New York: Peter Lang, 1993.

118. __________.We Believe In One God: The Experience Of God In Christianity And Islam. New York: HarperCollins Publishers,1980.

119. _________. “The Western Eastern Divan: The influence of Persian Poetry in East and West.” The Persian Presence in the Islamic World. Eds. Richard G. Hovannisian and George Sabagh. Cambridge: Cambrige University Press, 1988.

120. ________. “Yunus Emre.” An anthology of Turkish Literature. Ed. Kemal Silay. Bloomington: Indiana University, 1996.

121. Schimmel, Annemarie, Ali Asani, and Kamal Abdel-Malek. The Popular Muhammad. Columbia: University of South Carolina Press, 1992.

122. Schneir, Miriam. Feminism. New York: Vintage Books, 1994.

123. Shems Friedlander, Annemarie Schimmel (Foreword by), Nezih Uzel. Rumi and the Whirling Dervishes. Morning light Press, 2003.

124. Sultan Bahu. Risalah-i ruhi, risalah-i ruhi khurd. Trans. Syed Ahmad Saeed Hamadani. Jhang: Hazrat Ghulam Dastagir Academy, 1997.

125. Victor Danner, Annemarie Schimmel and Wheeler M. Thackston. Ibn 'Ata' Illah the Book of Wisdom/Kwaja Abdullah Ansari Intimate Conversations (The Classics of Western Spirituality). New York: Paulist Press, 1978.

126. William C. Chittick. Annemarie Schimmel(foreword) Me and Rumi: The Autobiography of Shams-I Tabrizi. Fons Vitae, 2004.

127. Yar-Shater, Ehsan, ed. Persian Literature. New York: Bibliotheca Persica, 1985.

128. Yohannan ,J.D. Joseph and Potiphar's Wife in the World Literature. New York: New Directions,1968.

129. Mikula Maja. Key concepts in cultural studies. England: Palgrave macmillan,2008.

130. Said, Edward W. Orientalism. Harmondsworth: Penguin, 1995.

131. Macfie, A L. Orientalism: A Reader. Edinburgh: Edinburgh University Press, 2000.

132. Burke, Edmund, and David Prochaska. Genealogies of Orientalism: History, Theory, Politics. Lincoln: University of Nebraska Press, 2008.

133. Schimmel, Annemarie. German Contributions to the Study of Pakistani Linguistics. Hamburg, 1981

134. Schimmel, Annemarie (foreword). Urdu Letters of Mirza Asadu' llah Khan Ghalib by Daud Rahbar. Translated and annotated. Albany: State University of New York Press, 1987.

135. Shafique, Khurram Ali. Iqbal –AN ILLUSTRATED BIOGRAPHY.Lahore: Iqbal Academy Pakistan, 2010

136. Nasr, Hussain, Syed. Islamic Spirituality-Manifestations. New York: Crossroad, 1987.

On line Books, Journals, Reviews,

http://www.odsg.org/Said_Edward(1977)_Orientalism.pdf

http://news.harvard.edu/gazette/story/2004/12/annemarie-schimmel/

www.hawzah.net/fa/magazine

Periodicals/Articles/Reviews/Lectures/Talk/Memorabilia

1. Burzine K. Waghmar. "Professor Annemarie Schimmel (April 7, 1922 to January 26, 2003)." Royal Asiatic Society 13 (2003) [2004]: 377-79. Print.
2. Chodkiewics M. "Ocean Without Shore: Ibn Arabi, the Book and the Law." Journal of Islamic Studies 6.ii(1995): 269-272. Print.
3. Jan Slomp. Annemarie Schimmel, 1922–2003: The Builder of Bridges between Cultures (Obituary).Journal of Muslim minority affairs 24.1(2004): 189-190.
4. Matthews D.J. "Iqbal – a selection of Urdu Verse." ZDMG 145.ii (1995): 473. Print.
5. Qushayri. Principles of Sufism. Trans. B.R.Von Schlegell. Journal of Islamic Studies 5.i (1994): 117-118. Print.
6. Russell, Ralph. "Pursuit of Urdu Literature: A Select History" ZDMG 145.1 (1995): 206. Print.

7. Schimmel, Annemarie. "At the end of Journey." Sufi 12 (1991-92): 4. Print.
8. _________________. "Babur Padishah, the Poet, with an account of the Poetical Talent in His Family." Islamic Culture 34 (1960): 125-38. Print.
9. _________________. "Dreams of Jesus in the Islamic Tradition." Bulletin of the Royal Institute for Inter- Faith Studies 1/I (1999): 207-212. Print.
10. _________________."The Eternal Charm of Classical Persian Poetry." Islam and the Modern Age 1. 1 (1970): 65-69. Print.
11. _________________. "The Heavenly Dance." Pakistan Quarterly viii.2 (1958) Print.
12. _________________." Hafiz and His Critics." Studies in Islam 1 (1979): 1-33. Print.
13. _________________. " Ibn Khafif: An Early Representative of Sufism". Journal of the Pakistan Historical Society 6 (1958): 147-173. Print.
14. _________________. "The Idea of Prayer in the Thought of Iqbal" The Muslim Word XL VIII.3 (1958): 205- 222. Print.
15. ________________. "In flight." Sufi 11 (1991): 12. Print.
16. ________________. "Indian Sufi Shrines." Sufi 6 (1990): 4. Print.
17. _________________. " Iqbal in the Context of Indo-Muslim Mystical Reform Movements." Islam in Asia 1: South Asia (1984): 208-226. Print.
18. ________________. " Impressions from a Journey to Deccan" Die Welt des Islams 20 (1980): 104-107. Print.

19. ________________. "Islamic Calligraphy." The Metropolitan Museum of Art Bulletin 51 (1992). Print.

20. ________________. "Karbala and Imam Husain in Persian and Indo-Muslim Literature." Alserat 12 (1986): 29-39. Print.

21. ________________. "Man of Light or Superman? A Problem of Islamic Mystical Anthropology." Diogenes 146 (1989): 124-140. Print.

22. _________________." The Martyr- Mystic Hallaj in Sindhi Folk Poetry," Numen 9.3(1963): 161-200. Print.

23. _________________. "The Maulana and the West." Islamic Review 44.2 (1956): 1-3. Print.

24. _________________. " Maulana Rumi as Teacher." Islam and Modern Age 20.iv (1989): 298-319. Print.

25. _________________. "The Meaning of Prayer in Maulana Jalaloddin Balkhi's Work." Afghanistan 27.iii (1974): 33-45. Print.

26. _________________. " Muhammad Iqbal as seen by a European Historian of Religion." Studies in Islam Journal 5 (1968): 53-82. Print.

27. _________________. "Muhammad Iqbal 1873-1938. The Ascension of the Poet." Die Welt des Islam's 3 (1954): 145-157. Print.

28. _________________. "Mystical Poetry in Islam: The Case of Maulana Jalaluddin Rumi." Religion and Literature 20. 1 (Spring 1988): 67-80. Print.

29. ________________. "Only You." Sufi 8 (1991): 4. Print.

30. ________________. "The Origin and the Early development of Sufism." Journal of the Pakistan Historical Society 17 (1959): 55-67. Print.

31. ________________. "The Ornament of the Saints: The religious situation in Iran in Pre Safavid Times." Iranian Studies 7.iii.iv(1974): 88-111. Print.

32. ________________. "The Path." Sufi 9 (1991): 4. Print.

33. ________________. "The Place of the Prophet of Islam in Iqbal's Thought. Islamic Studies 1.4 (Dec. 1962): 111-130. Print.

34. ________________. Periodica Islamica 6.i (1996): 3-5. Print.

35. ________________. "Pious and Learned Women In Islam." Pakistan Quarterly II. 2 pp. 23-24. Print.

36. ________________. "Poetry and Caligraphy: Some aspects of the Work of Mirza Ghalib." Pakistan Quarterly 17.1 (1969): 94-101. Print.

37. ________________. "The Primordial Dot: Some Thoughts about Sufi Letter Mysticism." Jerusalem Studies in Arabic and Islam 9 (1987): 350-356. Print.

38. ________________. "Profile: Shams Anwari Alhuseyni." Art and the Islamic World 19 (1990): 25-28. Print.

39. ________________. "Religious Experience in Islam." The way, January (1978): 36-43.

40. ________________. "Revisiting Mulana Rumi and Konya." Sufi i (1988): 6-8. Print.

41. ________________. "Ritual of Rebirth" Parabola 4.ii (1979): 88-90. Print.

42. ________________. "Rose and Nightingale." Numen 5.2 (1958): 85-109. Print.

43. ________________. "Shah Abdul Latif". Kairos 3.4 (1961): 207-216. Print.

44. ________________. "Sind through the Centuries." Der Islam 53 (1976): 120-123. Print.

45. ________________. "Some Aspects of Prayer." Vol. IV.3. pp. 31-38.

46. ________________. "Some Glimpses of Religious life in Egypt during the Late Mamluk Period." Islamic Studies 4.49(1965): 353-392. Print.

47. ________________. "Some notes on the Cultural activity of the first Uzbek Rulers." Journal of the Pakistan Historical Society 8 (1960): 149-166. Print.

48. ________________. "Some Thoughts about future studies of Iqbal." South Asian and Middle Eastern Studies of Iqbal Journal. 1.2 (1977): 75-81. Print.

49. ________________. "The Sufi Ideas of Ahmad Sirhindi." Die Welt des Islams 14 (1973): 199-203. Print.

50. ________________. "Sufi Literature" Afghanistan 29.i (1976): 76-87. Print.

51. ________________. "The Symbolical Language of Maulana Jalal al-Din Rumi." Studies In Islam (New Delhi) 1 (1964): 26-40. Print.

52. ________________. "Understanding Islam." Iqra 14.1 (1994)

53. ________________. “The Western Influence on Sir Muhammad Iqbal’s thought.” (Proceedings of the IXth International Congress for the History of Religions. Tokyo and Kyoto ;(1958, 1960): 705-708. Print.

54. ________________. “Women in Mystical Islam.” Women’s Studies International Forum 5 (1982): 145-151. Print.

55. ________________. “Yunus Emre.”Numen 8 (1961): 12-33. Print.

56. ________________. “ Yusof in Mawlana Rumi’s Poetry.” Sufi 10 (Summer 1991): 5-12. Print.

57. ________________. “Where East meets west. “Pakistan Quarterly 1.6. 18-20.

58. Bausani, Alessandro. “The Development of Forms in Persian Lyrics.” East and West 9 (1958): 129-44. Print.

59. Boyce, Mary. “A Novel Interpretation of Hafiz” Bulletin of the School of Oriental and African Studies15. 2 (1953): 279-88. Print.

60. Hayes, Bruce. “The Rhythmic Structure of Persian Verse.” Edebiyat 4. 2 (1979). Print.

61. Hillmann, Michael C. “Sound and Sense in Ghazal of Hafiz” The Muslim World 61 (1971): 111-21. Print.

62. Rehder, Robert M. “Persian Poets and Modern Critics.” Edebiyat 2.1 (1977). Print.

63. Renard, John. “Images of Abraham in the writings of Jalaladdin Rumi” Journal of the American Oriental Society 106. 4 (1986): 633-40. Print.

64. Marchand, Suzanne. "German Orientalism and the Decline of the West." Proceedings of the American Philosophical Society. 145.4 (2001).

65. Schimmel, Annemarie.A life of learning (Charles Homer Haskins Lecture).American Council of Learned Societies.ACLS Occasional Paper No. 21.1993.

66. Schimmel, Annemarie. "A good word is like a good tree." Periodical Islamica 6.1(1996)

67. Chagtai, M. Ikram. Prof. Annemarie Schimmel (The Scholar and the Saint). (Paper presented on the occasion of the ceremony, held in Lahore on 12th February 1998, in which the International Iqbal Award, was bestowed on Prof. A. Schimmel.) Provided by M. Sohail Umer

68. Weidner, Stefan. "ON THE THRESHOLD OF A NEW EPOCH" Art and Thought- Fikrun wa Fann. 42st (3rd) year 79.4(June 2004 – November 2004).

69. Hofmann, Murad W. "Book Review: Morgenland Und Abendland: Mein West-Östliches Leben ("orient and Occident: My West-Eastern Life")." Islamic Studies. 41.4 (2002)

70. Saeed A.Durrani, Professor. Ed. Remembering the Scholar-Hermit, Proceedings of the Annemarie Schimmel Commemorative Seminar.Lahore: Iqbal Academy Pakistan, 2005

71. Interfaith Thanksgiving for the life of Anne-Marie Schimmel. London: ames's Church, Piccadilly, 8U1.66N74 Eng. INT-S 2003.

72. Umar, M. Suheyl. DR. ANNEMARIE SCHIMMEL DESIRED TO BE BURIED IN MAKLI GRAVEYARD, THATTA. ENG. 8U1.66N74. UMA-D 2010.38342.

73. Martin, Richard C. “Journal of the American Academy of Religion.” Journal of the American Academy of Religion, vol. 46, no. 3, 1978.

74. Matthews, D. J. “Bulletin of the School of Oriental and African Studies, University of London.” Bulletin of the School of Oriental and African Studies, University of London, vol. 41, no. 2, 1978

75. Schimmel, Annemarie. “Iqbal and Goethe.” Iqbal, vol.52, no.3 July-Sep.2005

76. __________________. “Pakistan's Philosopher-Poet Mohammad Iqbal: AN INTRODUCTION.” Iqbal Review 44: 4 (upcoming)

77. AL-HASAN, SHARIF. “Islamic Studies.” Islamic Studies, vol. 3, no. 2, 1964

78. Schimmel, Annemarie. “Some Thoughts about Future Studies of Iqbal”. Iqbal, vol. xxiv, no.4, Oct. 1977

79. Schimmel, Annemarie. “Rudolf Pannwitz (1881-1968)” Iqbal, vol. xxvi, no.1, Jan. 1979.

80. Weidner, Stefan. “ON THE THRESHOLD OF A NEW EPOCH” Art and Thought- Fikrun wa Fann. 42st (3rd) year 79.4(June 2004 – November 2004)

Dictionaries and Encyclopaedias(or its Articles)

1. Schimmel, Annemarie. "Al-HallaJ." The Encyclopaedia of Religion. Ed. Mircea Eliade. Vol. 16. 1987.
2. _________________. "Calligraphy and Epigraphy." The Oxford Encyclopaedia of the Modern Islamic World. Ed. John L. Esposito. Vol. 4.
3. _________________. "Cats." The Encyclopaedia of Religion. Ed. Mircea Eliade. Vol. 16. 1987.
4. _________________. "Devotional Poetry." Ibid Vol.1.
5. _________________. " Ikbal." The Encyclopaedia of Islam. Vol.III. 1971.
6. _________________. "Islamic Calligraphy" The Encyclopaedia of Religion. Ed. Mircea Eliade. Vol. 3. 1987.
7. _________________. "Islamic Iconography" ibid Vol. 7.
8. _________________. "Islamic Poetry." Ibid Vol. 11
9. _________________. "The Islamic Religious Year." ibid
10. _________________. "Muhammad, The Prophet in Popular Muslim Piety".Ibid. Vol. VII. 1993.
11. ________________. "Nur Muhammad". The Encyclopaedia of Religion. Ed. Mircea Eliade. Vol. 11. 1987.
12. ________________. "Qurratul Ayn Tahirah." Ibid Vol. 12.

13. ________________. “ Rabi ah Al- ‘ Adawiyyah.” Ibid. Vol. 16. 1987.

14. _________________. “Raks” The Encyclopaedia of Islam. Vol. viii. 1995.

15. _________________. “ Rumi.” The Encyclopaedia of Religion. Ed. Mircea Eliade. Vol. 12. 1987.

On line Dictionaries, Digital libraries, Encyclopedias etc.

1. 4: http://www.jstor.org
2. http://www.iranicaonline.org
3. http://www.worldcat.org/
4. https://dictionary.cambridge.org
5. https://en. Wikipedia.org/wiki.
6. https://en.langenscheidt.com/german-english
7. https://en.oxforddictionaries.com
8. www.dawn.com/news/1375639
9. www.howtopronounce.com/german
10. www.scribd.com

بچپن کی ایک یادگار

شمل کی منفرد تصویر

جائے مدفن بون، جرمنی

Abstract

The first chapter 'ORIENTALISM AN INTRODUCTION' throws light over the distinguished Orientalists and their 'organized' endeavors and achievements. For this, I did talk about British, French and German orientalists. Most of them belong to 18th and 19th century. The second chapter, titled, 'Annemarie Schimmel-Life and Personality' focusses important matters of her life as well as true characteristics of her personality and lifelong achievements.Chapter three is directly concerned with Urdu Literature. Whatever, Schimmel had done to better understanding of Urdu language and its Literature is discussed here and we examined those books, articles and essays which were being published, time to time for a good picture of Urdu language. In this chapter, we particularly valued the following books:

Pain and Grace- A study of two Mystical Writers of Eighteenth-Century Muslim India; A Dance of Sparks- Imagery of Fire in Ghalib's poetry; Gabriel's Wing: A Study into the religious Ideas of Sir Muhammad Iqbal and 'Classical Urdu Literature from the beginning to Iqbal', A History of Indian literature edited by Jan Gonda.The concerned articles, reviews and criticism is managed to examine her work. Fourth chapter is about those books and articles which Schimmel wrote about Islam, Mysticism, Muslim Culture, History, Fine Arts, literature and Prophet Muhammad p.b.u.h.

The fifth chapter is the crux of my thesis and I did try to focus only those books which are directly related to Urdu Literature. My final conclusion is this, that Schimmel did her level best to give a peaceful and mystical picture of Islam and strived hard to get closed, West and East, while evading misgivings and scornful attitudes, embedded among the concerned nations. Hats off to Schimmel!

SOHAIL MUMTAZ

PhD Scholar (URDU)

25 Apr. 2018

ANNEMARIE SCHIMMEL: AS AN ORIENTALIST

(IN THE LIGHT OF AVAILABLE ENGLISH WRITINGS)

THESIS FOR THE DEGREE OF DOCTOR OF PHILOSOPHY IN URDU

(2011-2016)

By

SOHAIL MUMTAZ

Research Scholar, Department of Urdu

Supervisor

Prof. DR. MUHAMMAD KAMRAN

Chairman, Department of Urdu

DEPARTMENT OF URDU, ORIENTAL COLLEGE,

UNIVERSITY OF THE PUNJAB, LAHORE